قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
National Council for Promotion of Urdu Language
جولائی 2024 قیمت 15₹
ماہنامہ
اردو دنیا
نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:26، شمارہ:07، جولائی2024

مدیر : ڈاکٹر شمس اقبال
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالباری
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین : عبدالرشید اعظمی، شاداب شمیم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15روپے سالانہ -/150روپے

Total Pages:100

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس:26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

خطوط

ادبی مباحث

داستانِ پارینہ

زبان و تعلیم

گوشۂ سلام بن رزاق

شخصیات

نفسیات

ترجمہ

سماجیات

اقتصادیات

سائنس و ٹکنالوجی

خراج عقیدت

نگر نگر اردو

طب

کتابوں کی دنیا

خبرنامہ

ہماری بات

ادب اور سماج کا بہت گہرا رشتہ ہے۔ ادب پر جہاں معاشرتی تبدیلیوں کا اثر پڑتا ہے وہیں طرزِ معاشرت پر ادب کے رویے اور رجحانات بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو ادب اور سماج ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔

ڈیجیٹل ایج میں سماج میں بہت سی سطحوں پر تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کا اثر ادب پر پڑنا فطری ہے۔ اس لیے آج ادب پر ٹیکنالوجی کے مثبت اور منفی اثرات کے حوالے سے گفتگو بھی جاری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ٹیکنالوجی نے انسانی رابطے کی صورتیں پیدا کی ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی کی وجہ سے انسانوں کے مابین دوریاں بھی بڑھی ہیں۔ بھیڑ میں بھی تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ انسانوں کے مابین جو قربتوں کی خوشبو تھی وہ ختم ہوئی ہے۔

معاشرے پر ٹیکنالوجی کے مثبت اور صحت مند اثرات کے حوالے سے غور کیا جائے تو ٹیکنالوجی کی ہی وجہ سے ہمارے لیے بہت سی راہیں آسان ہوگئی ہیں اور ہمارے سامنے امکانات کی ایک وسیع تر دنیا ہے۔ تخلیقی سطح پر بھی امکانات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوگیا ہے، خاص طور پر اگر کتابوں کی بات کی جائے تو کتابوں کی طباعت اور اشاعت سے لے کر تقسیم اور فروخت تک آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ای بک کی وجہ سے تمام کتابیں ہمارے لیے دستیاب ہیں۔ اب کتابوں کے لیے لائبریری یا بک اسٹور تک جانے کی زحمت اٹھانی نہیں پڑتی بلکہ آسانی سے دور دراز مقامات کی کتابیں بھی ہم تک پہنچ جاتی ہیں۔ اسی لیے انٹرنیٹ اور ای بک آج رابطے کا سب سے طاقتور اور موثر ترین ذریعہ بن چکے ہیں اور اس کی وجہ سے ہمارے لیے بہت سے چیلنجز کا مقابلہ کرنا بھی آسان ہوگیا ہے۔ اب سائنس اور تکنالوجی کی بدولت بہت سے ایسے ذرائع اور طریقہ کار ہمیں میسر ہیں جن کی وجہ سے ہم امکانات کی ایک نئی دنیا تلاش کرسکتے ہیں، خاص طور پر آرٹیفیشیل انٹلی جینس نے بھی ہمارے لیے بہت سے نئے متبادل ذرائع پیدا کردیے ہیں جن کے بارے میں پہلے ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے آج کے عہد میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ٹیکنالوجی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو زبان سے جڑے ہوئے افراد اور ادارے اس سمت میں کوشاں ہیں۔ قومی اردو کونسل بھی نئے سائنسی اور تکنیکی وسائل کے ذریعے زبان و ادب کی ترقی کے لیے سنجیدہ ہے اور کوشش کررہی ہے کہ اردو زبان و ادب کو عصری ٹیکنالوجی سے مکمل طور پر ہم آہنگ کیا جائے اور اردو زبان کو ان موضوعات سے بھی آشنا کیا جائے جن کی اس سائنسی اور تکنیکی عہد میں شدید ضرورت ہے۔

دوستو! اکیسویں صدی کو فکشن کی صدی کہا جاتا ہے کہ فکشن نے ہمارے لیے نظریات و تصورات کے نئے دریچے وا کیے ہیں۔ ہم فکشن کے ذریعے حیات و کائنات کے بہت سے حقائق سے روشناس ہوتے ہیں۔ اردو فکشن میں بہت سے ایسے نام ہیں جنھوں نے سماج کے بہت سے اہم پہلوؤں سے ہمیں واقف کرایا ہے، انہی میں ایک نام سلام بن رزاق کا بھی ہے جن کا گذشتہ دنوں انتقال ہوگیا۔ وہ اردو فکشن کا ایک نہایت معتبر اور مستند نام تھے۔ انھوں نے افسانے میں بہت سے کامیاب تجربے بھی کیے۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا سوگوار ہے۔ اس لیے اردو دنیا کے اس شمارے میں سلام بن رزاق کے حوالے سے ایک گوشہ شامل کیا گیا ہے تاکہ ان کے شخصی اور فنی ابعاد سے ہمارے اردو کے قارئین بھی آگاہ ہوسکیں۔ اس گوشے میں اردو کے اہم اور معتبر قلمکاروں کے مضامین شامل ہیں جن سے سلام شناسی میں یقیناً ہماری نئی نسل کو رہنمائی ملے گی۔

شمس اقبال

ربط و التفات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'ربط والتفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات و مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گزارش ھے کہ ماھنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ھے۔ آپ کے خطوط ھمارے لیے بہت اھمیت کے حامل ھوتے ھیں، ان سے ھمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ھے۔ (ادارہ)

اردو دنیا جون 2024 کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق پر روشنائی اور قلم کے ساتھ لکھتے ہوئے ہاتھ کی تصویر دیکھ کر یہ احساس ہوا کہ آج کے دور میں قلم ہی ہماری سب سے بڑی طاقت ہے۔ اداریے میں انٹرنیٹ کے موضوعات اور مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح انٹرنیٹ ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکا ہے انٹرنیٹ سے واقفیت کے بغیر زندگی کا تصور ناقص ہے مگر بچے اور بڑی عمر کے لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بیداری پیدا کرنا صحت مند معاشرے کی تشکیل کے لیے بے حد ضروری ہے۔ 'ربط والتفات' میں دو مکتوبات شامل ہیں۔ شمارے کے مشمولات بعنوان اداریہ، خطوط، عالمی یوم کتاب، ادبی مباحث، شخصیات، گوشہ راشد انور راشد، نفسیات، سماجیات، زبان اور ذہنی صورت حال، یاد رفتگاں، ٹیکنالوجی، تراجم، فنون لطیفہ، سلسلہ صحافت، ادبی و ثقافتی ادارے، نیا آسماں نئے ستارے، کتابوں کی دنیا اور خبرنامہ مشاہیر ادب کی بہترین کارکردگی کا آئینہ ہے۔

اس شمارے میں شامل تمام مضامین قابل مطالعہ ہیں خصوصی طور پر مولوی ذکاء اللہ کی ادبی خدمات (محمد آصف)، عابد سہیل کی تنقید نگاری (محمد فہام الدین)، جگدیش سہائے سکسینہ کی نظموں میں قومیت کا عکس (ناظر حسین خان)، ہندوستان میں سماجیت اور تاریخ کے جدید رجحان (عائشہ بیگم)، اردو صحافت میں اداریہ نگاری (جعفر علی خان)، وسط ہند کا ایک اہم شاعر ناطق گلاؤٹھوی (محمد اسرار)، اختر الایمان کی شاعری کے موضوعات (نہاں)، عطیہ فیضی ایک شعلہ مستعجل (محمد ارشاد) وغیرہ مطالعے کے لطف کو دوبالا کر رہے ہیں۔ آخر میں خبرنامہ کے تحت اردو دنیا کی خبریں دی گئی ہیں تا کہ ہم باخبر رہیں۔

گلفشاں انجم: اسسٹنٹ پروفیسر، ناگپور، مہاراشٹر

جون 2024 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ تمام مشمولات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا۔ شخصیت کے حوالے سے تینوں مضامین کافی معیاری ہیں جو کافی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ محمد عاصف نے منشی ذکا اللہ کی ادبی خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ کئی مستند حوالوں سے مضمون کو مزین کیا ہے۔ عابد سہیل کا شمار معتبر فکشن نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی تنقید نگاری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ فہام الدین صاحب نے نہایت معروضی انداز میں عابد سہیل کی تنقید نگاری کا جائزہ متن کے حوالے سے لیا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر عابد سہیل کے تنقیدی نظریات سے کماحقہ واقفیت ہو جاتی ہے۔ تیسرے مضمون میں ناظر حسین نے جگدیش سہائے سکسینہ کی نظموں میں قومیت کے عناصر کا جائزہ لیا ہے۔ اپنی باتوں کو تقویت بخشنے کے لیے اشعار کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔ اس شمارے کے مشمولات میں تین مضامین راشد انور راشد کی وفات پر بطور خراج عقیدت پیش کیے گئے ہیں۔ پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر کوثر مظہری کے مضامین کو ہم تاثراتی مضمون کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔ تیسرا مضمون جو خان محمد رضوان کا ہے اس میں راشد انور راشد کی شاعری کے فکری و فنی اختصاص کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے کوشش کی ہے کہ راشد انور راشد کی شاعری کے اہم نکات اجاگر ہو جائیں۔ عائشہ بیگم اور نجم بٹ کے مضامین بھی کافی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ نظیر احمد گنائی نے محمد علی اثر کی لسانی خدمات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یقیناً وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر فاطمہ حق، اورنگ آباد، بہار

☜ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ شمارہ کافی معیاری لگا اور تمام مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس شمارے کے تقریباً سبھی مضامین متاثر کن ہیں، جیسے 'نکات الشعرا میں مستعمل تنقیدی اصطلاحات' (محمد باقر حسین)، 'نکات الشعرا میں دکنی شعرا' (محمد نہال افروز)، 'زبان اور اس کے رموز' (احقر)، 'اردو زبان کی تدریس میں قواعد کی اہمیت' (محمد ارشد)۔ ڈاکٹر قاسم فریدی نے مضمون میں نعیم الحق کی غزل گوئی پر اچھی معلومات فراہم کی ہے۔ ڈاکٹر شکیل احمد کا 'مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری کی غزلیہ شاعری' اور جناب ایم اے کنول جعفری کا 'کوثر چاند پوری کی تخلیقی جہات' پڑھ کر اچھے لگے۔ 'جگن ناتھ آزاد کی نظموں میں شعری عمل کی جہتیں اور اردو فکشن میں زمیندارانہ معاشرے کی عکاسی' بھی اچھی کوشش ہے۔ اسی طرح 'پروفیسر اسلم خاں: دہلی کی ایک نامور علمی شخصیت' اور 'فاروق نازکی کی غزلیہ کائنات' بھی عمدہ مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ اس شمارے میں شامل تمام مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ رسالے کو تقریباً ہر لحاظ سے بہتر پایا۔ اس خوبصورت انتخاب کے لیے میں اردو دنیا کے اراکین کو دل کی گہرائیوں سے نیک خواہشات پیش کرتی ہوں۔

☜ **روحی جان**: جموں وکشمیر

☜ ماہنامہ 'اردو دنیا' مئی 2024 کا شمارہ دیکھا، ٹائٹل پیج پر کچھ تنوع نظر آیا، قومی کونسل کی مطبوعات کو بڑی خوب صورتی اور خوش سلیقگی سے پیش کیا گیا ہے، یہ شمارہ جاذب نظر ہے، فہرست کو بغور دیکھا، سو صفحات کے اس شمارے میں مختلف طرح کے مضامین کو شامل کیا گیا ہے، یہ اس رسالے کی خصوصیت ہے جس سے کہ اس کا ہر قاری اچھی طرح واقف ہے، مدیر ڈاکٹر شمس اقبال کا اداریہ بے حد پسند آیا، اس میں کتابوں کی اہمیت و افادیت کو بیان کیا گیا ہے، مدیر محترم نے لکھا ہے کہ کتاب انسان کو جہاں معتبر، مہذب اور باوقار بناتی ہے وہیں اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتی، یہ بات دل کو چھوگئی، آج کے دور میں لوگ کتابوں سے دور ہوتے جارہے ہیں اور الیکٹرانک آلات موبائل فون، لیپ ٹاپ اور کمپیوٹر وغیرہ سے چپکے ہوتے ہیں، اس لیے لوگوں کو پھر سے کتابوں کی طرف لانا ہوگا اور کتاب کلچر کو فروغ دینا ہوگا جبھی ایک سچا اور اچھا معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، پہلا مضمون احمد حسین کا 'اردو ذریعہ تعلیم میں اختصاص، گنجائش اور امکانات' ہے، یہ ایک تحقیقی مضمون ہے، اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے کیا فوائد ہیں اور اس کو برتنے سے مستقبل میں کیا فوائد ہوسکتے ہیں اسے تفصیلی طور پر بیان کیا گیا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ احساس کمتری سے باہر نکلیں اور اردو کو ذریعہ تعلیم بنائیں اس زبان میں بھی روزگار کے

بہت مواقع ہیں جیسے فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے علاوہ مختلف سرکاری دفاتر میں اردو مترجمین وغیرہ میں کام کررہے ہیں، محمد باقر حسین کا مضمون 'نکات الشعرا میں مستعمل تنقیدی اصطلاحات' ایک اچھا مضمون ہے، نکات الشعرا میر تقی میر کا مشہور و معروف تذکرہ ہے اور یہ ایسی اہم کتاب ہے جس سے ہر اردو اسکالر واقف ہے اور اس کے مطالعے کے بغیر اس وقت کی تاریخ اور شعرا کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی، اس نے تنقید کی بنیاد رکھی اور اس کے مطالعے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ میر کی تنقید لفاظی یا تاثراتی نہیں تھی بلکہ اس عہد میں رائج ادب کی شعریات مثلاً قواعد کی پابندی، شعری اظہار، عروض، فصاحت اور بلاغت سے آگاہی، محاوروں اور الفاظ کا برمحل استعمال وغیرہ پر مبنی تھی، نکات الشعرا پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے، نکات الشعرا پر دو مضامین ہیں اور دونوں ہی مضامین اچھے ہیں، شہرو انمباڑی اور اردو لوک ادب مضمون بھی پسند آیا، یہ مضمون فوزیہ حبیب نے تحریر کیا ہے، اس طرح کے علاقائی مضامین زیادہ سے زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ مرکز سے دور جو لوگ لکھ رہے ہیں ان کا بھی تذکرہ اور ان کے کام کی تعریف بھی ضروری ہے، لوک گیت پہلے زیادہ گائے جاتے تھے اب تو اس کا چلن بہت کم ہوگیا ہے، لوک گیت زیادہ تر اجتماعی اور کم تر انفرادی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں، اکثر یہ گیت محنت کش عوام کی اجتماعی تخلیقی محنت کے عمل میں خلق ہوئے اور گائے جاتے ہیں، دیگر مضامین بھی اچھے ہیں پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس رسالے کا شمار ہندوستان کے معیاری رسالوں میں ہوتا ہے، اس کے مشمولات بے حد اہم ہیں اور اسے مزید اچھا بنایا جاسکتا ہے اس لیے کہ بہتر سے بہتر کی گنجائش ہر حال میں موجود رہتی ہے۔

☜ **حذیفہ شمیم**: وارث نگر، مستی پور، بہار

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

جن کتابوں نے متاثر کیا

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

مجروح: فہم وادراک بنام رومان

سہیل کاکوروی

ترقی پسند تحریک کے دور عروج میں کچھ شاعر غزل کا پرچم بلند کیے ہوئے تھے۔ مجروح، فیض کسی حد تک مجاز لیکن ان میں غزل کے حوالے سے مجروح کا قد سب سے بلند ہے۔ ان کی چالیس سے کچھ اوپر غزلوں کا ایک دیوان غزل کے نام سے دستیاب ہے۔ اتنے کم کلام کے باوجود نہ تو شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کو نظر انداز کیا نہ گوپی چند نارنگ کے قلم نے ان کی شاعری کے محاسن بیان کرنے سے گریز کیا اور کسی ناقد نے قلم سے ان کی وابستگی کو ان کی تخلیقیت سے متصادم نہیں پایا۔ مجروح کے وجود میں نغمۂ سرمدی جاری وساری تھے ان کی ہر غزل میں پرانی علامتوں نے نیا روپ بھرا ہے اور غزل اپنے اصل معانی کے ساتھ ان کی تخیل کے رنگوں سے سج کر وجود میں آتی ہے فکر کی بلند پروازی سے جس شاعری کی تعمیر ہوئی ہے جو شاعری کی تعمیر نو کا اشارہ ہے۔ اس میں قد وگیسو کی نشاط انگیزی بھی ہے اور فتوت عشق کا وہ پہلو بھی ہے جو دار ورسن کے قصۂ معنی خیز کی صورت میں موجود ہے۔ مجروح قد وگیسو اور دار ورسن کو یکجا کر کے ایک ہی مصرع میں حسن کی نمود اور اسی میں سرداگیِ عشق کی بات کرتے ہیں۔

جنون دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد وگیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

دعا دیتی ہیں راہیں عشق کی مجھ آبلہ پا کو
میرے قدموں کی گلکاری بیاباں سے چمن تک ہے

دوسرے شعر میں بھی وہی بات بہ انداز دگر ہے۔ عشق کی راہیں بیاباں سے چمن تک جاتی ہیں، ہجر کی وحشت صحرا نوردی کی صورت میں بھی مقدر بنتی ہے اور کبھی اطمینان وصل گلگشت چمن سے ہم کنار کر دیتا ہے لیکن آبلہ پائی یوں بھی ہے اور یوں بھی۔ گلکاری دونوں حالتوں میں اسی سے ممکن ہے۔ عشق کی راہیں دونوں سمت جاتی ہیں گلکاری سے یہ راہیں رنگین ہیں اور دعا عشق کی استقامت کو دی جارہی کہ جس میں آبلہ پائی بھی یوں کام کی ہے کہ اس کی گلکاری کی رنگ آمیزی سے مجروح کا جمالیاتی شعور شعر کا حسن ہے ان کی فطرت میں زبردست بانکپن تھا جو ان کی شاعری کے اسلوب میں بھی پیوست ہے

اہل طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشم جانانہ کہیں

ہر لفظ سے ایک علامت قائم ہو رہی ہے۔ مخاطب اہل طوفان ہیں ان کو یہ بتانا مقصود ہے کہ طوفان عشق میں نظارگیِ امواج گیسوئے جاناں کے حسن سے چشم جانانہ کے بھنور میں ڈوب جانے کا امکان فنا اور بقا کی بات بلاغت متکلم کا آئینہ ہے جس غزل کا یہ مطلع ہے اس کے ایک شعر میں میری اور مجروح کی یادگار ملاقات کا ایک قصہ ہے۔ یہ واقعہ سنہ 1993 کا ہے۔ لکھنؤ کے معروف شاعر مرحوم بشیر فاروقی میرے والد کے شاگرد اور میرے عزیز دوست تھے۔ میں نے اپنی انجمن ادبی منچ کے زیر اہتمام ان کی شعری خدمات کے اعتراف کے لیے ان کے جشن کے انعقاد کا اعلان کیا۔ مجروح سے بشیر بھائی کی حقیقی خالہ زاد بہن منسوب تھیں اس رشتے کے سبب مجروح کے بشیر بھائی سے تعلق کی راہ تو کھلی لیکن تعلق خاطر بتدریج ارتقا پزیر ہوا اور مجروح کی طبیعت اور بشیر بھائی کی فطرت کی ہم آہنگی سے قربت کے پھول کھلے اور مجروح جشن میں آنے کو تیار ہوئے اور ان کا قیام اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس لکھنؤ میں ہوا۔ جشن کے دن بشیر بھائی نے کہا آپ میزبان ہیں چلیے مجروح صاحب سے مل تو لیجیے۔ مجھے ایک آدھ بار انہیں دور سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا خیر بشیر بھائی ساتھ تھے میں پہنچ گیا۔ وہاں مجروح سفید کرتا پاجامہ زیب تن کیے نیم دراز تھے پاکیزہ چہرہ دمک رہا تھا۔ سامنے ناقد اور شاعر پروفیسر وارث کرمانی تشریف فرما تھے اور مجروح ان سے محو گفتگو تھے۔ بشیر بھائی سے خوش دلی سے ملے، میرا اسلام شاید قبول کرلیا۔ جب میں دیر تک نظر انداز ہوا تو ایک ترکیب سوجھی، میں نے خود ان کو مخاطب کیا اور ایک دم مذکورہ غزل کے ایک شعر کے متعلق کہا کہ جناب مجھے اس وقت سے آپ سے ایک شکایت ہے جب سے یہ شعر پڑھا۔ پوچھا کون سا شعر، میں نے کہا،

سرخی مے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب ارباب میخانہ کہیں

میں نے کہا ساقی کے ہونٹ چھونے کے بعد آپ پر رقص واجب تھا ارباب میخانہ کی طرف دیکھنا سمجھ میں نہیں آیا۔ مجروح اٹھ کر بیٹھ گئے اور اعتراف میں اور میری بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ مجھے خود احساس ہو چکا مصرع بدلنے کی کوشش کر لی ہو نہیں سکا۔ میری ترکیب کارگر ہوئی۔ وہ مجھ سے ہی مخاطب ہو گئے اور پوچھا کہ آپ بھی شعر کہتے ہیں؟ میرا جواب اثبات میں تھا میں نے اس وقت

جو تازہ غزل کہی تھی وہ سنانا شروع کی۔ میں دو ہی شعر سنا سکا اور غزل مکمل نہ ہو سکی اور جو ہوا اس کا بیان خودستائی کے زمرے میں آجائے گا لیکن مجروح اور پروفیسر وارث کرمانی کی کیفیات کا نظارہ حاصل دید ہو گیا اور روح کا ماحصل ہو گیا۔ اس کی تفصیل میں نے مجروح کی حیات میں لکھی اور بشیر بھائی نے ان کو وہ مجلہ بھیج بھی دیا تھا جس میں میرے تاثرات چھپے تھے اور مجروح پر اپنے کسی مضمون میں بشیر بھائی نے بھی پورا واقعہ لکھ دیا جس کو لکھنے سے گریز مجھ پر لازم ہے اب چلتے ہیں اسی غزل کے ایک اور شعر کی طرف جس میں مجروح کا عزم یوں ہے۔

دار پر چڑھ کر لگائیں نعرۂ زلف صنم
سب ہمیں باہوش سمجھیں یا کہ دیوانہ کہیں

دار پر زلف صنم کا نعرہ اشاریہ ہے اس پھندے کا جو فہم عام کے مطابق فنا کے مقام کا تصور ہے لیکن یہ نزاکت دیکھنا ضروری ہے شاعر ہمت حقیقی کے باعث خود دار پر چڑھا ہے اس نے مکتب عشق سے جانبازی کا سبق پڑھا ہے اور وہ زلف کے سائے میں بقا کے حصول کا یقین رکھتا ہے یہ پھندا کستا جائے اسی میں لطف ہے یہاں مجھے اپنے ایک مشفق ماموں غلام مرتضی کیف کاکوروی کا شعر یاد آیا کہ۔

بانہیں ڈالے وہ گلے میں برسر پیکار رہے
زلف الجھی ہی رہے پھر بھی طرحدار رہے

لفظیات بھی الگ علامتیں بھی جدا لیکن اہل ذوق اس شعر کا مجروح کے شعر سے ربط پالیں گے زلف کی طرحداری سے ہی اجرائے پیغام بقا ہے اور یہی سبب ہے بلندی نعرہ زلف صنم کا ایک جسارت میں کر چکا ہوں اور اپنے خیالوں میں مجروح کو اپنا ہمنوا پاتا ہوں دراصل میں نے مجروح کے مشہور زمانہ شعر سے چھیڑ کی ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اپنی کتاب 'تشکیل نو' اور 'مجروح ایک بازدید' میں اس غزل پر میری غزل موجود ہے۔ یہ دونوں کتابیں بین المتونیت کے زمرے میں آتی ہیں کہ دستیاب متن پر توسیع کے طور پر متن کی تشکیل اس کے پہلے مصرع میں یوں ترمیم کی کہ:

جب تلک پرکھے نہ جائیں اس پہ اطمینان کیا
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

دانشوروں نے اس خیال کی تائید کی اور دعوے میں دلیل کی موجودگی کی تصدیق بھی کی لیکن مجروح کے شعر کی عظمت میں کوئی کلام نہیں ہے اور پھر اسی غزل کے اس شعر میں۔

میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

مجروح وہی چاہتے ہیں جو کہنے کی جرأت میں نے کی ہے جس طرح ہر ایک پیر مغاں بننے کا اہل نہیں ہوتا اسی طرح ہر کس و ناکس وجہ تقویت کارواں نہیں ہو سکتا۔ اس بات سے ہٹ کر اس غزل میں مجروح کی فکر کے پر وقار رنگ دکھائی دیتے ہیں۔

شرح غم تو مختصر ہوتی گئی اس کے حضور
لفظ جو منہ سے نہ نکلا داستاں بنتا گیا

اب چلتے ہیں فیض کے شعر کی طرف جو اکثر کوتاہ عقلوں کی ملامت کا نشانہ بنا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

غزل کا دلچسپ شعر ہے اور مابین حسن و عشق ایک ایسی فضا قائم کی گئی ہے جو ذہن سامع یا قاری کو مصروف فکر کر دیتی ہے لیکن یہ حصہ فسانہ عاشق و معشوق کے لیے ہے اور اس کا ردعمل بھی معشوق کی ناگواری ہے یہی بات مجروح نے کہی شرح غم اس کے حضور کی لیکن اس اجمال کی تفصیل داستان بن گئی اور کسی بات کا داستان بن جانا اس کا لامحدود ہو جانا ہے مجروح نے شرح غم کی اور وہ تفصیل کی راہ پر گامزن ہو گئی اور شرح غم کی گئی اس لیے جو لفظ منہ سے نہ نکلا اسی میں امکان تشکیل داستان ہے فیض اور مجروح دونوں عظیم بھی ہیں اور ہمعصر بھی شعر کس نے پہلے کہا یہ معلوم بھی نہیں اور اس کی تحقیق بھی عبث ہے

مجروح کا یہ دعویٰ تاریخ شعر و سخن میں درج ہو گیا اور مورخ نے اس سے اتفاق کر کے اس دور کی تاریخ میں درج کیا جس میں اصغر، جگر، حسرت، فانی اپنے اپنے رنگ میں غزل کا پرچم بلند کیے ہوئے تھے بظاہر بیزار غزل گوئی جوش کی غزلیں بھی ناقابل فراموش ہیں نظم گو ہونے کے ساتھ وہ غزل گو بھی تھے ان کے انکار کی حد ان تک ہی تھی ایسے میں مجروح کو صف اول میں مذکورہ سخن وروں کی

ہم نشینی حاصل ہوئی یہ وہ صحیح کہہ گئے ان کو اپنی ذات کا عرفان تھا وہی جو غالب کو تھا کہ ع

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ایسا کہنا نہ تعلی ہے نہ مبالغہ یہ تو خودشناسی حاصل ہو جانے کے بعد اظہار حقیقت ہے۔

دہر میں مجروح کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

غالب کے بعد خیال بندی اور خیال آرائی میں جو بھی ہے مجروح کے بعد ہے وہ مشاعروں میں اپنی غزل ترنم سے پڑھتے تھے وہی ترنم جو جگر کی مقبولیت کی بنیاد ہوا لیکن مجروح کے اشعار ہر گز محتاج ترنم نہیں ہیں وہ اگر تحت میں بھی پڑھے جائیں تو بھی پڑھنے والے کے وجود میں پنہاں موسیقی سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اس کے ساتھ ان کے کلام کا جیسا اثر وجدان پر ہوتا ہے اس سے کچھ سوا فکر پر ہوتا ہے۔ یہ دو اشعار اس کی مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ملے جو وقت نوائے ہزاراں سے
ادھر بھی دیکھ تماشہ ہے میری کم سخنی
بہت جو کم ہے تو خال رخ بہاراں ہے
میری نوا کو ملی ہے وہ داغ پیرہنی

یا۔

بے تیشہ نظر نہ چلو راہ رفتگاں
ہر نقش پا بلند ہے دیوار کی طرح

یہ غزل فلم میں بھی شامل ہوئی اور بہت کامیاب ہوئی شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے یہ مطلع نہ سنا ہو۔

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

بازار زندگی میں ذوق نظارگی پر خریداری حاوی ہے اور یہی المیہ شعر میں بیان ہوا ہے۔ کہا گیا ہے کہ مجروح کا شمار بائیں بازو کی فکر رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ارض ماسکو کی

تحسین اپنی جگہ لیکن ان کی شاعری رومان کی پروردہ ہے ان کے یہاں متحرک تخیل کے ساتھ ان کی فہم ودانائی کا امتزاج معنی خیز ہے اوراس میں ایک توازن ہے اور رومان کی سطح بہت بلند ہے

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب بھی جنوں خیز بہت ہے

بہ نام کوچہ دلدار گل آئے کہ سنگ آئے
ہنسا ہے چاک پیراہن نہ کیوں چہرے پہ رنگ آئے

مجروح کے مزاج میں ایک خاص وقار تھا وہ اپنی ذات کی رعنائیوں میں گم رہتے تھے اس کو کوئی تکبر سمجھتا تھا تو سمجھا کرے میں حصول عرفان ذات میں اسے ان کی محویت سمجھتا ہوں اور ان کو جو کیفیات حاصل ہوئیں تھیں انھیں کا عکس جمیل ان کی شعری کائنات ہے جس کا لفظ لفظ فروزاں ہے۔

مجروح کی شاعری کو دریا سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی یہ گہرائی میں بحرالکاہل اور وسعت معانی ومفہوم میں بحر اوقیانوس کا شکوہ کہتے ہیں۔ان کی شاعری میں تہہ داریاں ہیں اور ہمارے ناقد اکثر کسی کی شاعری میں سلاست وروانی کا ذکر ضرور کرتے ہیں لیکن مجروح کے لیے صرف یہی الفاظ نہیں استعمال کیے جاسکتے ہیں کہ لفظیات اور استعمال لفظ کا تقاضائے آگہی ہے۔اوراس کے علاوہ دل کے دروازے کھلے رکھنے پڑتے ہیں جذبوں کو بیدار کرنا پڑتا ہے غزل دیکھیے۔

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم ہیں پریشاں تم سے زیادہ
چاک کیے ہیں ہم نے عزیزو چار گریباں تم سے زیادہ
چاک جگر محتاج رفو ہے آج تو دامن صرف لہو ہے
اک موسم تھا ہم کو رہا ہے شوق بہاراں تم سے زیادہ
عہد وفا یاروں سے نبھایا ناز حریفاں ہم نے اٹھائے
جب ہمیں ارماں تم سے سوا تھا اب ہیں پشیماں تم سے زیادہ
جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہرو ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ
زنجیر و دیوار ہی دیکھی تم نے تو مجروح مگر ہم
کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں عالم زنداں تم سے زیادہ

احباب سے تخاطب کرتے ہیں۔ دل کا درد ان اشعار میں سمو دیا ہے۔ مطلع میں یقین کے ساتھ بتایا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں زندگی میں صعوبتوں سے وہ زیادہ دوچار رہے ہیں یاروں سے عہد وفا نبھانا تو پھر بھی آسان ہے لیکن ناز حریفاں اٹھانا بڑے جوکھم کا کام ہے۔ ایک نامعلوم وقت کا ذکر ہے شاعر کے ارمان جوان تھے اور ناز حریفاں اٹھانے کا عزم اب گذرے وقتوں پر پشیمانی مقدر ہوگئی ہے۔

اس کے بعد کے شعر میں پوشیدہ معنی لطف دے رہے ہیں۔شمعوں کی لویں کترنے کا اذن دینا نیا خیال بھی ہے اور کچھ یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس کا بام ان لووں سے روشن ہوجائے گا کہ جتنی روشنی کا اس کی دید کو ظرف ہے۔ اپنے لیے زخموں کے مہر و ماہ کا استعارہ لائے کہ وہی اپنی درخشندگی سے جشن چراغاں برپا کردے گا۔ اس شعر کے پہلے مصرعے کا اذن اور دوسرے مصرعے میں زخموں کے مہر و ماہ سے عشق کا عزم اور رجائیت کے پہلو روشن ہورہے ہیں۔ یہ غزل میرے خیال سے آزادی سے قبل کہی گئی ہے۔جیسا کہ یہ مصرع کہہ رہا ہے۔

کوچہ کوچہ دیکھ رہے ہیں عالم زنداں تم سے زیادہ

مجروح روح غزل کے محرم ہیں ان کے اشعار قاری کو شعر فہمی کی استعداد عطا کرتے ہیں ان کے یہاں کبھی جذب دل کا اظہار بہت سادگی سے ہوتا ہے اور اکثر اس کے برعکس بھی ہوتا ہے اور غزل کہتے وقت محبوب کا چہرہ رنگیں زیب و زینت نگاہ ہو جاتا ہے۔اور اسی فضا کے باعث مجروح کی شاعری پر تصوف کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

خیالات کی نزاکت ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے اور اس غزل کو پڑھتے ہوئے بھی اہل نظر کو اس کا ادراک ہوتا ہے کہ جگر کی صحبت کا اثر ان کی شاعری کی نغمگی کو ضرور نکھار گیا لیکن شاعرانہ اصطلاحات اور تراکیب تراشنے میں ان کو انداز بیان غالب سے نسبت ہے۔وہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے باقاعدہ تعلیم حاصل کرکے ایک طبیب حاذق کی صورت میں کامیاب تھے لیکن شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ اگر چاہتے بھی تو اس سے دامن نہیں چھڑا سکتے تھے۔ان کے وجود میں غزل بسی ہوئی تھی اور سُر لفظوں میں ڈھل جاتے تھے۔ یہ اشعار معنی آفرینی کے حوالے سے بے حد مشہور ہوئے اور موسیقیت سے بھرپور بھی ہیں۔

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے
وہ لجائے میرے سوال پر کہ اٹھا سکے نہ جھکا کے سر
اڑی زلف چہرے پہ اس طرح کہ شبوں کے راز مچل گئے

پہلے شعر میں دوران عشق گرم و سرد ہوائیں چلتی رہتی ہیں منزلوں کے سہل ہونے کا سبب بہت دلکش بتایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باد شرطہ رواں ہوئی ہے۔ چراغ جلنا سرخوشی کی علامت ہے دوسرے شعر میں جو فضا قائم کی ہے وہ ان کے رومان پرور دل کی قائم کی ہوئی ہے بہترین منظر کشی سوال شوق پر لجانا سر جھکا کر پھر نہ اٹھانا۔ سارا تجربہ بہت ترتیب سے بتایا گیا ہے اور شبوں کے راز کے مچلنے کا لفظ استعمال کرکے افشائے راز سے گریز کیا ہے۔ یہ طرز بیان شاعری کی بے پناہ ہنرمندی کی دلیل ہے ان کی بصیرت اس مادی پرشور محشر انگیز ہنگامہ آرا دنیا سے بہت الگ دیار یار کی نگارگی کے عرق گلاب میں اپنے الفاظ ڈبو کر معاملات حسن و عشق کا بیان کرتے ہیں اور ان سے جاری خوشبو روح کو معطر کردیتی ہے۔ مجروح روح غزل کے محرم ہیں ان کے اشعار قاری کو شعر فہمی کی استعداد عطا کرتے ہیں ان کے یہاں کبھی جذب دل کا اظہار بہت سادگی سے ہوتا ہے اور اکثر اس کے برعکس بھی ہوتا ہے اور غزل کہتے وقت محبوب کا چہرہ رنگیں زیب و زینت نگاہ ہو جاتا ہے۔اور اسی فضا کے باعث مجروح کی شاعری پر تصوف کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

مجروح کے فلمی گیت بھی شعریت سے بھرپور ہیں اور ان کے دور کے ہدایت کار اور موسیقی کے ماہرین یہ جانتے تھے کہ جس صورت حال کے مطابق نغمہ لکھا گیا ہے اشعار کو ایسے سروں میں ڈھال دیا جائے جو ہر شعر کہتے وقت شاعر کے احساس میں پیوست ہے۔ ایک فلم کا مجرا ان کی اس غزل پر فلمایا گیا جس کا مطلع تھا۔

پہلے سو بار اِدھر اور اُدھر دیکھا ہے
تب کہیں جاکے تجھے ایک نظر دیکھا ہے

موسیقی سے بچ کر یہ غزل سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ مجروح نے اپنی زندگی میں دولت، شہرت، ناموری حاصل کی۔ ایک اعلیٰ سطح تھی جس پر ہمیشہ رہے اور کسی بھی حالت میں اس سطح سے نیچے نہیں آئے۔ شاعری میں محبت کے پیغام بھی دیے اور محبت میں ہوئے حسین تجربات سے ذہنوں کو رنگینی بھی عطا کی۔ مجروح اردو غزل کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہیں گے اور آنے والی نسلیں اسی کی تفہیم کرنا اپنے لیے فخر سمجھیں گی۔

■

Mr. Suhail Kakorvi
C/o, National Tractors
City Hotel, B. N. Road, Lalbagh
Lucknow- 226001 (UP)
Email.: suhailkakorvi@gmail.com

شہاب عنایت ملک

قرۃ العین حیدر اور ساگا ناول

اس سے پہلے کہ قرۃ العین حیدر اور ساگا ناول پر بحث کروں یہ ضروری بنتا ہے کہ ساگا ناول کے بارے میں جانا جائے کہ یہ کس قسم کا ناول ہوتا ہے۔ اصل میں یہ ناول کی ہی ایک قسم ہے جس میں ناول نگار کسی شخص یا پھر کسی ایک خاندان یا کنبے کے نسل در نسل حالات و واقعات کو قلمبند کرتا ہے۔ ناول کی اس قسم میں ناول نگار اپنے خاندان کے کسی شخص یا کسی دوسری بڑی شخصیت کے بارے میں اس کی زندگی اور دوسرے کارناموں سے متعلق تفصیلاً اظہار خیال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے ناولوں کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا ہے کیونکہ اس کینوس میں ناول نگار بے شمار واقعات کو قلمبند کر کے قاری کو ہر واقعے سے روشناس کراتا ہے اور یوں قاری کے سامنے اس شخصیت کی زندگی کے مختلف دریچے وا ہو جاتے ہیں۔

ساگا ناول کی عالمی روایت کے ابتدائی نقوش گیارھویں صدی میں ملنا شروع ہو جاتے ہیں اور یہ نقوش آئس لینڈ کی طرف ہجرت کرنے والے شریفوں اور نچلی سطح سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے یہاں ملتے ہیں۔ ان ناولوں کی تقریری صورت ہوتی تھی لیکن بعد میں بارھویں صدی عیسوی میں اسے تحریری شکل دی گئی۔ ان تجربات کو ہم فیملی ساگا کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں کیونکہ ان میں ہجرت کرنے والوں کے آباواجداد کی نشانیاں اور ان کی روایتوں کو پیش کیا گیا ہے۔ کچھ ناولوں میں ناروے کے بادشاہوں کے کارناموں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ابتدائی دور کے ناولوں میں قصے اور ڈرامے کا عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ ان ناولوں کی تحریری صورت ہمیں اس وقت ملتی ہے جب آئس لینڈ کے لوگ دیگر ممالک میں تعلیم و تربیت کے مقصد سے جاتے ہیں اور دوسرے ممالک کے علمی، ادبی اور سائنسی اثرات سے متاثر ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں 1140 میں Saga of Saint کے عنوان سے پہلا تحریری ساگا ناول وجود میں آتا ہے اس کے بعد اس قسم کے اور بھی قصے لکھے گئے لیکن ان کے مصنفین کے بارے میں ابھی تک کوئی پتہ نہیں چل سکا ہے۔ ساگا ناول کی روایت جب یورپ سے انگلستان پہنچی تو وہاں کے ناول نگاروں نے معیاری ساگا لکھے اور فرد واحد پر زیادہ زور دیا۔ ان ناول نگاروں نے کنبے کے Concept کو بھی ختم کیا۔ اس سلسلے میں تھامس مان کا ناول Joseph & Brother کو زیادہ شہرت ملی اور اسے ساگا ناول کا بہترین تجربہ بھی قرار دیا گیا۔

ساگا ناول کو ہم دو قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ تاریخی اور فرضی ساگا۔ تاریخی ساگا کسی تاریخی خاندان سے متعلق لکھا جاتا ہے جب کہ فرضی ساگا میں ناول نگار کسی فرضی خاندان پر قلم اٹھاتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ناول خاندانی تعلقات اور رشتوں کو پیش کرتا ہے۔ چونکہ اس کا موضوع کسی ایک فرد سے متعلق ہوتا ہے۔ اس لیے اس ناول کو اگر ہم اس فرد کی سوانح حیات بھی کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ناول کو اور زیادہ موثر بنانے کے لیے اس قسم کے ناول میں ناول نگار ڈرامائی عناصر سے زیادہ کام لیتا ہے۔

ساگا ناول کی اسی روایت کو ہر ادب میں برتا گیا۔ اُردو میں اس کا ایک ہی تجربہ ہوا ہے اور اس تجربے کو اُردو کی مایہ ناز ناول نگار قرۃ العین حیدر نے اس وقت پیش کیا جب انھوں نے تین جلدوں پر مشتمل ناول 'کارِ جہاں دراز ہے' تحریر کیا۔ اس ناول کو فیملی ساگا اس لیے کہا جا سکتا ہے کیونکہ مصنفہ نے اپنے خاندان کے نسل در نسل حالات و واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد 1977، دوسری 1979 اور تیسری 2001 میں اب تینوں جلدیں ایک ساتھ بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ناول کے پہلے حصے میں قرۃ العین حیدر نے اپنے والد سجاد حیدر یلدرم اور ان کے خاندان کے علاوہ ان ادبی شخصیات کا ذکر کیا ہے جو سجاد حیدر یلدرم کے حلقے میں تھے یا جن کے ساتھ سجاد حیدر یلدرم کے گہرے مراسم تھے۔ دوسری جلد میں انھوں نے 1947 سے لے کر 1988 تک کے اپنے اور اپنے خاندان کے تمام واقعات کا احاطہ کیا ہے۔ اس حصے میں ان ادبی شخصیتوں اور رشتہ داروں کا بھی ذکر کیا ہے جو پاکستان میں قیام پذیر ہیں۔ جبکہ تیسری جلد میں مصنفہ نے داستانِ کشورِ ہند اور اعزا و احباب کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ مصنفہ نے اس ناول کا عنوان اقبال کے اس مشہور و معروف شعر سے اخذ کیا ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

یہ شعر بالِ جبریل کی تیسری غزل کا چھٹا شعر ہے اور یہی شعر 1072 صفحات پر پھیل کر ایک ضخیم تخلیقی کارنامہ بن جاتا ہے۔ مصنفہ نے پہلی جلد کو اپنے بھائی کے ہونہار اولاد کے نام منسوب کر کے ایک مختصر دیباچہ بھی تحریر کیا ہے۔ جس میں وہ یوں لکھتی ہیں:

''اکیسویں صدی زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ بچے اور

ادبی مباحث

بچیاں آزادی کے بعد پیدا ہونے والی نسل میں شامل ہیں جو کار جہاں سنبھال چکی ہیں یا سنبھالنے والی ہے اور ہم سے پہلے والوں نے دنیا کو اپنے وقت کے لحاظ سے اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ یہ نئے لوگ اکیسویں صدی میں پہنچ کر تاریخی عوامل کو شاید ہم سے بہتر طور پر سمجھ سکیں۔"

(کار جہاں دراز ہے، ص 12)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بیسویں صدی سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے تاریخی عوامل کو قبل والوں سے بہتر سمجھا ہے اور اس کا جواب ہاں میں ہے تو اس میں خود قرۃ العین حیدر کے ماضی کی تلاش صاف طور پر جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس تلاش کے لیے حسرت زدہ ہیں۔ آخر یہ سوال کیوں پیدا ہوا کہ قرۃ العین حیدر کو 'کار جہاں دراز ہے جیسا طویل ناول لکھنا پڑا۔ کار جہاں دراز ہے کی دوسری جلد کے آخر میں اقبال کی مشہور و معروف نظم مسجد قرطبہ کے پہلے بند کے چھٹے شعر کو مصنفہ نے تحریر کیا ہے ؏

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا

جب کہ اس کا دوسرا مصرع یوں ہے ؏

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

اقبال کے اس شعر میں ہمیں وقت کا تصور ملتا ہے اور وقت چونکہ قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں خاموش کردار کا روپ بھی ادا کرتا ہے۔ اس لیے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ناول نگار نے وقت کو اہمیت دے کر اپنے خاندان کے ماضی کی داستان کو رقم بند کرنے کی ایک بہترین کوشش کی ہے۔ ناول کے دوسرے حصے کے اختتام پر مصنفہ یوں رقمطراز ہیں:

"دوستو جلد اول میں 1745 سے 1947 کی داستان تاجیک نژاد افسانہ خواں میڈیول مورخ کا صوفی تذکرہ نگار، فیوڈل داستان گو، وکٹورین ناولسٹ، سیاسی کالم نویس اور اُردو افسانہ نگار کے روپ میں آکر آپ کو سنائی۔" (کار جہاں دراز ہے، ص 763)۔

ناول پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوانح عمری صدیوں پر پھیلی ہوئی ہے اور قرۃ العین حیدر نے یہ داستان لکھ کر اپنے آپ کو مندرجہ بالا سب ہی شکلوں میں دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شکلیں قرۃ العین حیدر کے وجود کا اشاریہ بھی بن جاتی ہیں۔ مصنفہ نے اس ناول میں اپنے فکر اور فلسفے کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ اس ضمن میں یوں لکھتی ہیں:

"اپنی سچائی کو شانتی اور صراحت کے ساتھ بیان کرو اور دوسروں کو سنو، کیونکہ ان کے پاس بھی ان کی کہانی موجود ہے اور یاد رکھو کہ زمین کی گھاس اور آسمان کے درخشاں ستاروں کی طرح تم بھی کائنات کے بچے ہو اور چاہے تمھاری سمجھ میں یہ بات نہ آئے مگر کائنات متواتر اور پیہم اپنے اسرار منکشف کر رہی ہے اور اپنی تمام بیہودگیوں اور کلفتوں کے باوجود دُنیا بڑی خوبصورت جگہ ہے۔

(کار جہاں دراز ہے۔ پیش لفظ)۔

قرۃ العین حیدر کے مندرجہ بالا قول سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ ایک دلچسپ سوانحی فیملی ساگا ناول ہے جس کا موضوع مصنفہ کے آبا و اجداد اور خود اپنی زندگی کی عمرانی سوانح ہے جسے مختلف قسم کے واقعات بیان کر کے اسے ایک بہترین ساگا ناول بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

> **اپنی سچائی کو شانتی اور صراحت کے ساتھ بیان کرو اور دوسروں کو سنو، کیونکہ ان کے پاس بھی ان کی کہانی موجود ہے اور یاد رکھو کہ زمین کی گھاس اور آسمان کے درخشاں ستاروں کی طرح تم بھی کائنات کے بچے ہو اور چاہے تمھاری سمجھ میں یہ بات نہ آئے مگر کائنات متواتر اور پیہم اپنے اسرار منکشف کر رہی ہے اور اپنی تمام بیہودگیوں اور کلفتوں کے باوجود دُنیا بڑی خوبصورت جگہ ہے۔**

مصنفہ نے چونکہ اس کو ایک سوانحی ساگا قرار دیا ہے اسی لیے وہ مختلف النوع ماخذوں کا بھی ذکر کرتی ہیں اور آخر میں وہ سوانحی ادب کی معنویت اور عصریت پر یوں فرماتی ہیں:

"اس نوع کی درجنوں تازہ ترین کتابیں ہر مہینے انگلستان اور امریکہ میں چھپ رہی ہیں، اجتماعی ناول رائٹرز نوٹ بک اور فیملی ساگا ان کے علاوہ (ہمارے ہاں ان اصناف ادب پر بہت کم توجہ دی گئی ہے) بالخصوص فیملی ساگا آج کل انگلستان میں از حد مقبول ہیں کیونکہ وہاں فیملی ختم ہو چکی ہے۔" (کار جہاں دراز ہے۔ پیش لفظ)۔

سوانحی ناول کی تکنیک اور اس صنف ادب کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس قسم کا ناول لکھنے کی تحریک انھیں رالف رسل نے دی تھی اور اس وقت ان کے تصور میں نہ تو کوئی تکنیک تھی اور نہ صنف ادب۔ وہ مزید لکھتی ہیں کہ جب وہ لکھنے بیٹھیں تو تکنیک اور صنف ادب آپ سے آپ بن گئی اور اس طرح سے ان کا یہ سوانحی ناول وجود میں آیا لیکن میں قرۃ العین حیدر کے اس بیان سے اختلاف کرتا ہوں کیونکہ کوئی بھی تکنیک یا صنف دفعتاً وجود میں نہیں آتی ہے۔ اس کا ایک تدریجی ارتقا ہوتا ہے اور ارتقائی دور میں تراش خراش کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ میرا ماننا یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر نہ تو کسی صنف کی موجد ہیں اور نہ ہی کسی تکنیک کی۔

اس قسم کی تکنیک انگریزی ادب میں پہلے سے ہی موجود تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس بات سے انکار کرتی ہیں کہ وہ کسی بھی انگریزی دانشور سے متاثر نہیں ہوئی ہیں مثلاً کار جہاں دراز ہے کی تیسری جلد میں ایک محفل میں تقریر کے دوران قرۃ العین حیدر نے ان جذبات کا اظہار کیا ہے:

"...اب نقادوں نے مثال کے طور پر سب سے پہلے تو میرے لیے یہ کہا کہ میں ورجینا وولف کی طرح لکھتی ہوں یا ان سے متاثر ہوں۔ اس وقت تک میں نے ورجینا وولف کو پڑھا ہی نہیں تھا.. اچھا یہ بہت دنوں تک چلتا رہا پھر تحقیق کیا گیا کہ میں ہنری جیمس سے متاثر ہوں۔"

(ایضاً، ص 84)

مجھے یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا ہے کہ قرۃ العین حیدر کسی ادیب سے متاثر ہوئیں یا نہیں۔ دراصل میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب قرۃ العین حیدر نے یہ ناول لکھنا شروع کیا اور ان کی محنت، ریاضت اور مشقت کے نتیجے میں یہ ناول 'لائف اینڈ ٹائمز' کی صورت اختیار کر گیا۔ ان تینوں جلدوں کا ساگا ہونے میں کم از کم مجھے کوئی شبہ نہیں ہے اور اس بات کا میں بھی اقرار کرتا ہوں کہ یہ اُردو کا پہلا اور آخری ساگا ناول ہے کیونکہ مصنفہ نے اس میں اپنے آبا و اجداد اور خود اپنی زندگی کے واقعات کو ادبی، سیاسی، تاریخی تینوں حوالوں سے بیان کیا ہے۔ اس ناول میں تاریخیت کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس میں فلسفہ بھی ملتا ہے اور ادب کی مختلف تحریکوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو مندرجہ ذیل اقتباسات دیکھیے:

"سجاد حیدر یلدرم نہٹور ضلع بجنور (یوپی) کے ایسے پڑھے لکھے زمیندار طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے خاندان کے افراد مغلیہ دربار میں سہ ہزاری پنج ہزاری منصب دار رہے۔ یلدرم کے لکڑ دادا سید حسن وسط ایشیا سے ہندوستان آئے۔ خاندان میں کچھ عورتیں پڑھی لکھی بھی تھیں۔ یلدرم کی نانی سیدہ ام مریم نے تو قرآن شریف کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔" (کار جہاں دراز ہے۔ جلد اول)

"راقم الحروف پیرزادی کے لیے روایت ہے حسین ماموں اور ایلین ماموں نے اذان واقامت کانوں میں پھونکی اور سن شریف چھ روز کا تھا جب بوجہ علالت شدید رنگ نیلا پڑا اسم نیلوفر رکھا گیا۔طبیب نے ایک پہلوان ہوڑن شہر آگرہ سے بطور انا منگوائی کہ خانہ بدوش اور غالباً جرائم پیشہ قبیلہ ہوڑن سے تعلق رکھتی تھی۔بعد کچھ مدت کے خالو میر افضل نے نیلوفر منسوخ کروا کر زریں تاج طاہرہ کے اسم گرامی پر نام قرۃ العین رکھا۔(ایضاً،ص 303)

میرے گھر پر بیرہ سفید اچکن پر سرخ نواڑی پیٹی کس کر اور صافے کی آڑی نواڑی پٹی پر ایس ایچ کا چاند کا مونوگرام لگائے سفید دستانے پہن کر لنچ اور ڈنر سرو کرتا تھا۔(ایضاً،جلد اول)

"گھر پر قرآن شریف پڑھانے کے لیے ایک مولوی صاحب مقرر کیے گئے۔اناوہ میں بھائی کو جو مولوی صاحب دینیات اور قرآن شریف پڑھانے آتے تھے وہ اسلامیہ ہائی اسکول کے پرانی وضع کے مدرس تھے۔ایک مرتبہ انھوں نے بھائی سے کہا تھا... ہم نیک سیرت آدمی ہیں، تمھاری والدہ سامنے کھڑی تھیں، ہم خود ہی مٹ گئے... لکھنؤ والے مولوی صاحب ندوہ کے ایک ہنس مکھ غریب طالب علم تھے۔یہ بہت ماڈرن نکلے۔انہماک سے ریڈیو سنتے اور برآمدے میں پڑی انگریزی کتابیں اٹھا کر پڑھنے لگتے۔بغدادی قاعدہ شروع کرنے سے قبل انھوں نے مجھ سے دریافت کیا۔بیٹا آپ لوگ والدوالین پڑھتے ہیں یا والضالین؟"۔ میں نے کہا معلوم نہیں۔ جو آپ کا جی چاہے پڑھا دیجیے۔" (ایضاً،ص 386)

ناول کار جہاں دراز ہے میں قرۃ العین حیدر نے جہاں ایک طرف اپنے والد سجاد حیدر یلدرم کی زندگی کے احوال کو رقم کیا ہے وہیں اپنی والدہ نذر سجاد حیدر کی زندگی کے حالات وواقعات پر بھی روشن خیالی کے علاوہ اُن کے نام بدل کر لکھنے کی وجہ بھی بیان کی ہے۔یہی نہیں انھوں نے ان کی بعض اصلاحی کہانیوں کا ذکر کرنے کے علاوہ 'عصمت' نام کے اُس رسالے کا ذکر بھی کیا ہے جس میں وہ اپنی یادداشتوں کو تحریر کیا کرتی تھیں۔ دوسری اور تیسری قسط میں پاکستان کے ذکر کے علاوہ مصنفہ کی پاکستان میں ملازمت دوستوں اور ادبی محفلوں کے احوال بھی ملتے ہیں۔اس کے علاوہ مختلف ممالک کے اسفار کے علاوہ ادبی محافل اور ادبی شخصیات کا ذکر بھی ملتا ہے۔جن میں قرۃ العین حیدر کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔

اپنے بچپن کی بھولی بسری یادوں کا ذکر بھی قرۃ العین حیدر ناول میں جگہ جگہ کرتی نظر آتی ہیں۔ادبی زندگی اور تخلیقات کا ذکر بھی قرۃ العین حیدر کی تینوں جلدوں میں جگہ جگہ کیا گیا ہے۔یہ تمام چیزیں اس ناول کو فیملی ساگا کے زمرے میں کھڑا کر دیتی ہیں۔قرۃ العین حیدر نے خود بھی اسے سوانحی ناول قرار دیا ہے:

"عرصہ ہوا جب رالف رسل نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ایک لائف اینڈ ٹائمز قسم کی چیز لکھنا چاہیے۔اس وقت اس کتاب کا کوئی تصور میرے ذہن میں نہ آیا تھا لیکن جب لکھنے بیٹھو تو تکنیک اور صنف ادب آپ ہی آپ بن جاتی ہے اور حقیقت افسانے سے عجیب تر ہے۔چنانچہ ایک سوانحی ناول وجود میں آیا۔"

(قرۃ العین حیدر: کار جہاں دراز ہے، ص 31)

"اُردو میں قرۃ العین حیدر نے 'کارِ جہاں دراز ہے' لکھ کر پہلا اور آخری ساگا ناول نگار ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔"

قرۃ العین حیدر کو اس بات کا احساس تھا کہ اُردو میں سوانحی ادب کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی ہے جبکہ مغرب میں اس قسم کا ادب لکھنے والوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔اُردو میں اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے کار جہاں دراز ہے جیسا فیملی ساگا تحریر کیا:

"مغرب میں کسی ادیب یا شاعر کا نام لے لیجیے۔ ہربرٹ ایڈ، ورجینا وولف، شان اوکیسی، ولیم پلومر، براونز برٹ سٹ ویل، ایلزبتھ اسینڈراتھ ووڈ، سارتر، سیمون، دوبووا (جوزف ہون ہیکتھ پیرسن، ہربرٹ گورمین وغیرہ پر مشتمل سوانح نگاروں سے قطع نظر) اوران کے لکھے ہوئے سوانحی ادب کا انبار آپ کو مل جائے گا۔" (ایضاً،ص 31)

اس ناول میں صرف قرۃ العین حیدر کی داستان حیات نہیں ہے بلکہ ان کے خاندان کی پوری تاریخ رقم کر دی گئی ہے اس لیے یہ ناول سوانحی ناول سے بلند تر چیز ہے۔ناول کی تخلیق میں غضب تحقیقی کاوش موجود ہے۔مصنفہ نے اسے تاریخی اور خاندانی دستاویزات کی بنیاد پر اپنے تخیل کی مدد سے تخلیق کیا ہے۔یہی دستاویزیت اور تخیل کی آمیزش اس کو سوانحی دستاویزی ناول کے درجہ تک لے آتی ہے۔قرۃ العین حیدر کی تاریخ اور اپنی جڑوں کی تلاش سے دلچسپی اور ان ورثاء کی عادات کی بدولت تاریخی حقائق کی دستاویزات کا ایک خزانہ ان کے ہاتھ آ جاتا ہے۔پھر قرۃ العین حیدر کا تاریخی شعور اور فنی پختگی اسے 'کار جہاں دراز ہے' جیسے شاہکار میں ڈھال دیتا ہے۔ تاریخ کی کھوج اور دستاویزات کے حصول کے لیے مصنفہ کو خاندان والوں کی مدد بھی لینا پڑی۔قرۃ العین نے اس ناول میں ایک اور دستاویزی انداز یہ اپنایا ہے کہ ہر باب کے آخر میں کسی تحقیقی مقالے کی طرح حوالہ جات بھی شامل کر دیے ہیں جہاں سے انھوں نے یہ تاریخی شواہد حاصل کیے ہیں۔یہ اس ناول کی دستاویزیت کی ایک اور منفرد مثال ہے۔ناول میں مختلف کردار ہیں جن کی زبانی ایک طرح داستانیں بیان ہوئی ہیں۔اس ناول میں خود قرۃ العین حیدر کا اپنا کردار ہے۔جو ابتدائی جلد میں پس منظر میں رہتا ہے مگر آگے چل کر اس کی زندگی کی کہانی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ ناول جیسے جیسے آگے بڑھتا رہتا ہے مزید دلچسپ اور داستانی ہوتا چلا جاتا ہے۔بہت تاریخی واقعات و حادثات جب قرۃ العین حیدر کے قلم کے نیچے آتے ہیں تو ان میں خشکی کے بجائے ایک تری پیدا ہو جاتی ہے اور قاری تاریخی واقعات کو داستان کی طرح پڑھتا چلا جاتا ہے۔

مختصراً کار جہاں دراز ہے اردو کا ایک بہترین فیملی ساگا ہے۔جس میں تجسس بھی ہے اور دلچسپی بھی۔قاری یہ ناول پڑھ کر کبھی حیرت زدہ ہوتا ہے اور کبھی وہ مسرت کی کیفیت سے گزر کر حسرت اور عبرت،واقعات وحادثات کے تسلسل میں تمثیل حیات کے کرداروں کے ہمراہ زندگی کا سفر طے کرتا ہوا ایک سیاح کی طرح مختلف حادثات اور مناظر کا مشاہدہ کرتا جاتا ہے اور قرۃ العین حیدر کی عظمت کا اعتراف کرتا جاتا ہے۔جس کی وجہ قرۃ العین حیدر کی بے مثال بصیرت اور فکر ہے۔جو صدیوں پر محیط داستان کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے میں پوری طرح سے کامیاب ہوئی ہیں اور اگر میں قرۃ العین حیدر کو اُردو میں ساگا ناول کا موجد کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا۔اُردو میں قرۃ العین حیدر نے 'کار جہاں دراز ہے' لکھ کر پہلا اور آخری ساگا ناول نگار ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔ان کی قائم کردہ اس روایت پر اُردو کے کسی بھی ناول نگار نے ابھی تک چلنے کی کوشش نہیں کی اور مستقبل میں بھی یوں لگتا ہے کہ ناول کی یہ اہم شاخ قرۃ العین حیدر تک ہی محدود ہو کر رہ جائے گی۔

■

Prof. Shohab Inayat Malik
Prof. and Head, Dept of Urdu
Jammu University
Jammu- 180006 (J&K)
Mob.:9419181351
Email.: profshohab.malik@gmail.com

عالیہ

کیا میر کی غزل سوانحی ہے؟

اگر غالب اور اقبال پر ہوئے تحقیقی کام سے موازنہ کیا جائے تو میر ان دونوں شعرا کے بعد نظر آتے ہیں۔ اس کو میر کی بدنصیبی سمجھا جائے یا اردو کی؟ حالانکہ میر کے سامنے شاعر یا شاعری کا کوئی ایسا نمونہ نہیں تھا جس کی وہ تقلید کرسکیں۔ میر نے اپنا شعری اسلوب خود وضع کیا۔ وہ اس زمانے میں شاعری کر رہے تھے جب فارسی زبان کی اہمیت زیادہ تھی اور فارسی زبان اعلیٰ طبقے کی زبان تھی لیکن میر کے چھ اردو دواوین یہ ثابت کرتے ہیں کہ ’’پر مجھے گفتگو عوام سے ہے‘‘۔ ایک طرح سے میر نے اردو زبان کی پختگی میں اہم کردار ادا کیا۔ تاہم ان کے معاصرین شعرا سودا اور درد بھی اردو شاعری میں اپنی اہمیت منوا چکے تھے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن میر نے غزل میں محاوروں اور ضرب الامثال کو اتنی خوبی سے برتا جس سے زبان اور شعری لغت میں استحکام پیدا ہوا۔ اس لحاظ سے بھی میر کی ستائش جائز ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے بجا کہا ہے:

’’میر دنیا کی ان بڑی شخصیتوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہیں جو آئندہ نسلوں پر اثر ڈال کر ان کی زندگی کا رخ متعین کرتی ہیں۔‘‘[1]

میر پر ہوئی تحقیق و تنقید سے متعلق یہ بات سامنے آئی کہ میر کی شخصیت کو بھی ان کی شاعری سے پرکھا گیا تو کبھی ان کی خودنوشت (ذکر میر) کے پس منظر میں ان کی شاعری کا جائزہ لیا گیا۔ کبھی انھیں درد و غم کا شاعر کہہ کر ایک نظریہ قائم کرلیا تو کبھی ان کی شاعری میں بلند و پست کا مسئلہ کھڑا کردیا۔ کبھی میر کی بدماغی کو موضوع بنایا گیا تو کبھی ان کی بدمزاجی کو۔

دراصل میر کے اشعار کے موضوعات کے مطابق ہی ناقدین نے یہ طے کرلیا کہ میر بالکل ویسا ہی ہے۔ یعنی ان اشعار کی بنیاد پر میر کی تصویر سازی شروع کردی اور اکثر ناقدین یہ بھول گئے کہ شاعری کی بنیاد تخیل پر مبنی ہوتی ہے۔

اگر میر نے امرد پرستی پر چند اشعار کہے ہیں تو میر کو امرد پرست قرار دینے میں دیر نہیں کی گئی۔ اس طرح میر یہ کہہ گئے ہوں کہ

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

تو پھر کیوں اس کی تردید کی جائے؟ وہ صحیح کہہ رہے ہوں گے کہ ان کے دیوان درد و غم کے ہی مجموعے ہیں۔ اس طرح ہم نے بہ آسانی میر کو درد و غم کا شاعر تسلیم کرلیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح میر کے چند اشعار کی بنیاد پر ان کی سوانح مرتب کی جاسکتی ہے؟ یا میر کی غزل کو خودنوشت کے طور پر پڑھنا مناسب ہے؟

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ میر بدماغ ہے۔ حزن وملال کا شاعر ہے۔ یا میر کی غزلیں دل اور دلی کا مرثیہ ہیں۔ بعض ناقدین نے میر کے کلام کو ’آہ‘ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ تاہم اگر میر کے چھ دواوین کا بغور مطالعہ کرنے کے بجائے صرف ورق گردانی سے کام لیا جائے تب بھی ہمیں میر کی غزلوں کا متنوع رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

حامدی کاشمیری نے کہا ہے کہ میر نے غالب کی طرح خود اپنے کلام کا انتخاب نہیں کیا اس لیے بھی میر کے شعری موضوعات محدود نظر آتے ہیں۔[2] چند محققین اور ناقدین نے اپنے ذوق کے مطابق ان کے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ جیسے مولوی عبدالحق نے ’انتخاب کلام میر‘ میں یہ طے کردیا تھا کہ میر کے اشعار سوز و گداز کی تصویریں ہیں۔ ان سے پہلے محمد حسین آزاد نے ’آب حیات‘ میں یہ اعلان کردیا تھا کہ شگفتگی یا عیش و نشاط میر کی تقدیر میں نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں:

’’میر صاحب کو شگفتگی یا بہار عیش و نشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا۔ وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اس کا دکھڑا سناتے چلے گئے جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتے ہیں... عاشقانہ خیال بھی ناکامی، حسرت، مایوسی اور ہجر کے لباس میں خرچ ہوئے۔ ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ غم و درد کا پتلا نہیں، حسرت و اندوہ کا جنازہ تھا۔‘‘[3]

کلیم الدین احمد بھی اس مفروضے کو مسترد نہیں کرسکے بلکہ انھوں نے آزاد اور مولوی عبدالحق کے خیال کی توسیع کی ہے۔ لکھتے ہیں:

’’میر وہی داخلی اور خارجی اثرات قبول کرتے تھے جو ایک خاص رنگ کے یعنی درد و غم کا نمونہ ہوتے تھے۔ مسرور و متبسم اثرات میر کو پسند نہ تھے۔ ان کی پژمردہ دلی شگفتہ جذبہ یا شاد کام خیال کی طرف مائل نہ تھی۔‘‘[4]

مجنوں گورکھپوری میر کے غم کو ان کے زمانے کے حالات سے منسوب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

’’میر غم کے شاعر ہیں۔ میر کا زمانہ غم کا زمانہ تھا۔ اگر وہ غم کے شاعر نہ ہوتے تو اپنے زمانے کے ساتھ دغا کرتے اور ہمارے لیے بھی اتنے بڑے شاعر نہ ہوتے۔‘‘[5]

جب مولوی عبدالحق، محمد حسین آزاد اور مجنوں گورکھپوری نے درد و غم کے جملہ حقوق میر صاحب کے نام محفوظ کردیے تو قارئین کو کیا ضرورت تھی کہ اس دیوار کے دوسری طرف بھی دیکھنے کی کوشش کرتے۔

لیکن پہلے ڈاکٹر سلامت اللہ اور بعد میں شمس الرحمٰن فاروقی نے میر کے طنز و مزاح اور خوش دلی کے اشعار کی

طرف توجہ دلائی۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک آدمی تاحیات ہنستا مسکراتا رہے اسی طرح زندگی بھر روتا بسورتا بھی ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ میر کو ان کی غزلوں کی بنیاد پر شکست خوردہ اور یاس پرست کہتے ہیں وہ دھوکے میں ہیں۔

میر کی شاعری کا اطلاق اگر ان کی زندگی پر کریں گے تو عجیب و غریب صورت حال پیدا ہوگی۔ مثال کے طور پر میر کے دیوان اوّل میں پیری کے موضوعات پرمبنی اشعار متحیر کرتے ہیں جب کہ دیوان اوّل کو مرتب کرتے وقت میر کی عمر تقریباً 27 برس کی تھی۔

عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

پیری میں کیا جوانی کے موسم کو رویئے
اب صبح ہونے آئی ہے اک دم تو سویئے

اسی طرح پہلے ہی دیوان کا شعر ہے۔

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ
یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

اس شعر میں میر تمام عمر گزر جانے اور مکہ میں قیام کرنے کی بات کرتے ہیں جب کہ ہم سب جانتے ہیں کہ میر کا مکہ میں قیام کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاہم یہ کہا جاتا ہے کہ میر کے آباواجداد مکہ سے آئے تھے۔ اس بات کی تصدیق 'ذکر میر' سے بھی ہوتی ہے لیکن بعض ناقدین کی آرا ہے کہ 'ذکر میر' میں میر تقی میر نے حقائق سے کام نہیں لیا ہے۔ کمال احمد صدیقی نے اپنے مضمون 'ذکر میر پر چند خیالات اور سوالیہ نشان' میں میر کے بیان کردہ کئی واقعات پر شبہ ظاہر کیا۔ میر 'ذکر میر' میں اپنا تعلق حجاز سے بتاتے ہیں لیکن ان کے یہاں ایرانی رسمیں ہوتی تھیں اور گھر میں بھی فارسی بولی جاتی تھی۔ کمال احمد صدیقی نے یہاں تک کہہ دیا کہ کہیں میر تقی میر حجاز کو ایران تو نہیں سمجھتے تھے۔ [6] بہر حال میر کے حجاز اور ایران کی بحث میں نہ الجھ کر واپس میر کی سوانحی غزل کے موضوع پر توجہ مرکوز کی جائے۔ اوپر پیش کیے اشعار میر کے پہلے دیوان سے لیے گئے ہیں۔ یہ اشعار اس وقت کے بتائے جاتے ہیں جب میر کی عمر 27 برس کی تھی۔ اب میر کے چند اشعار ان کے دیوان پنجم سے دیکھیے۔

مدت سے اب وہی ہے مرا ہم کنار دل
آزردہ دل ستم زدہ و بے قرار دل

کیا جانو تم قدر ہماری مہر و وفا کی لڑکے ہو
لوہو اپنا دیں ہیں تمھارے گرتے دیکھ پسینے کو

صحبت میں اس کی کیوں کے رہے مرد آدمی
وہ شوخ وشنگ و بے تہ و اوباش و بدمعاش

ایک شعر دیوان چہارم سے بھی دیکھیے۔

عشق کی رہ میں پاؤں رکھا سو رہنے لگے کچھ رفتہ سے
آگے چل کر دیکھیں ہم اب گم ہوویں یا پیدا ہوں

فاروقی صاحب کے مطابق دیوان پنجم کی اشاعت کے وقت میر کی عمر تقریباً 80 برس کی تھی۔ ان اشعار کے رنگ یا شوخی سے کیا ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ میر اس عمر میں بھی عشق و عاشقی میں سرشار تھے اور ان کا معشوق اوباش قسم کا تھا۔

میر تقی میر بہت جگہ اپنے سیّد ہونے کا حوالہ دیتے ہیں اس لیے ان کے سیّد ہونے پر یقین کرلیا گیا۔ مثلاً

غیرت سے تنگ آئے غیروں سے لڑمریں گے
آگے بھی میر سید کرتے گئے ہیں ساکا

اے غیر میر تجھ کو گر جوتیاں نہ مارے
سید نہ ہووے پھر تو کوئی چمار ہووے

یا پھر یہ مشہور شعر۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

منکر نہیں ہے کوئی سیادت کا میر کی
ذات مقدس ان کی یہی ذات ہوتو ہو

لیکن اگر میر کی سوانح کو نظرانداز کر کے صرف پیش کردہ اشعار پر اکتفا کرلیا جائے تو قاری یقین کرنے کو تیار ہو جاتا ہے کہ یقیناً میر سیّد تھے۔ اس کے باوجود میر کو اب تک اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

اردو کے معتبر محقق قاضی عبدالودود اور کلب علی خاں فائق نے اپنے مضامین 'میر کے حالات زندگی' اور 'حیات میر' میں میر تقی میر کے سیّد ہونے کی تردید کی ہے اور انھیں 'شیخ' ثابت کیا ہے۔ [7]

میر نے اپنے نجیب الطرفین ہونے سے زیادہ دوسروں کو ادنیٰ ذات اور کم تر ثابت کرنا چاہا ہے۔

اپنی مثنوی 'تنبیہ الجہال' میں وہ کم علموں کو نشانہ بناتے ہیں۔

نکتہ پردازی سے اجلافوں کو کیا
شعر سے بزازوں، نداقوں کو کیا

یعنی میر کے نزدیک ادنیٰ سمجھے جانے والی ذات کے لوگوں کو شعر یا شاعری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اگر موجودہ سماجی تناظر میں دیکھیں تو یہ شعر قابل قبول نہیں ہے۔ میر کے معاصرین نے میر کو بددماغ کہا ہے۔ قدیم تذکروں میں بھی میر کی بددماغی کے تذکرے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں بھی ان واقعات کا ذکر کیا ہے کہ میر نے لکھنؤ جاتے وقت تانگے میں بیٹھے کسی شخص سے گفتگو نہ کی یا جب آصف الدولہ نے انھیں رہنے کے لیے ایسا پر فضا مکان دیا جس کے ایک طرف سبزہ زار تھا تو میر نے کبھی کھڑکیاں وا کرنے کی بھی زحمت نہ اٹھائی۔ میر نے اپنی دیوانگی کا واقعہ مثنوی 'خواب وخیال' میں قلم بند کیا ہے۔

نظر آئی اک شکل مہتاب میں
کمی آئی جس سے خور وخواب میں

میر تقی میر نے اپنی ذہنی بیماری یا دیوانگی کا ذکر اپنی آپ بیتی (ذکر میر) میں بھی کیا ہے کہ ان کی کیفیت آسیب زدہ ہوگئی تھی، لوگ ان سے ڈرنے لگے تھے اور جب چاند نکلتا تو ان کے لیے قیامت ہوتی تھی۔ کم وبیش چار پانچ مہینے میر اس کیفیت سے دوچار رہے۔ میر نے اس بیماری کے علاج کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ میرے والد کے مرید فخرالدین خاں کی بیوی نے میرے علاج پر بہت روپیہ خرچ کیا۔ کلب علی خاں فائق نے اپنے مضمون 'حیات میر' میں لکھا ہے:

''جب میر 1153 ہجری (41-1740 عیسوی) میں دیوانے ہوئے تو فخرالدین خاں کی بیوی نے میر کا علاج کیا تھا۔'' [8]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب 'نقد میر' (ص 75-74) میں میر کی بے دماغی اور بددماغی کے فرق کو سمجھاتے ہوئے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر خالد سہیل نے اپنے مضمون 'میر کا فن اور پاگل پن' میں میڈیکل سائنس کو مدنظر رکھ کر میر کی اس ذہنی بیماری پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ [9]

میر نے اپنی بددماغی کا خود بھی اعتراف کیا ہے۔

صحبت کسو سے رکھنے کا اس کو نہ تھا دماغ
تھا میر بے دماغ کو بھی کیا ملا دماغ

اتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میر تم کو
الجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

اٹھا جو باغ سے میں بے دماغ تو نہ پھرا
ہزار مرغ گلستاں مجھے پکار رہے

لیکن جب ہم ان کے طنز وتمسخر اور خوش طبعی پرمبنی اشعار دیکھتے ہیں تو میر کی بددماغی پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

مکے گیا، مدینے گیا، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

میر جی اس طرح سے آتے ہیں
جیسے کنجر کہیں کو جاتے ہیں

میر کا کلام وہ خریطۂ جواہر ہے جس میں ہر طرح کا نگینہ موجود ہے اور جو میر کی صرف ایک تصویر بنانے سے باز رکھتا ہے۔ میر کبھی غم دیدہ وغم دیدہ نظر آتے ہیں تو کبھی طنز وتمسخر کا کیریکیچر بھی بن جاتے ہیں۔ اگر 'ذکر میر' کے

آخر میں شامل چند لطیفے ہی دیکھ لیے جائیں تو میر کی حس مزاح جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ اپنی خامیوں یا شخصیت کا مذاق اڑانا اعلیٰ ترین مزاح سمجھا جاتا ہے جس کا ثبوت میر نے اپنے کلام میں فراخ دلی سے کیا ہے۔

ظالم یہ کیا نکالی رفتار رفتہ رفتہ
اس چال پر چلے گی تلوار رفتہ رفتہ

بات اپنے ڈھب کی کوئی کرے، وہ تو کچھ کہوں
بیٹھا خموش سامنے ہوں ہوں کروں ہوں میں

اس نوعیت کے اشعار میر پر لگائے گئے درد و غم، مایوسی اور حزن و ملال کا لیبل چسپاں کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ اگر ہم میر کے غم و ہجر پر مبنی اشعار کی بنیاد پر انھیں قنوطیت کا شاعر مان لیتے ہیں تو پھر طنز و تمسخر پر مبنی اشعار کو کس خانے میں رکھیں گے؟

ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میر نے کئی مثنویاں لکھیں جن میں وحوشیات بھی ہیں۔ شکار نامہ، اژدر نامہ، مور نامہ، موہنی بلی، در بیان مرغ بازاں اور در بیان بز وغیرہ۔

میر نے 'اژدر نامہ' میں خود کو 'اژدہا' اور دوسرے معاصر شعرا کو 'کیچوا، چھپکلی، گیدڑ، مینڈک اور چوہا' قرار دیا ہے۔ محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں اور قدرت اللہ قاسم نے اپنے تذکرہ 'مجموعہ نغز' میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ آزاد نے حسب عادت 'بچھو' اور 'کنکھجورے' کا اضافہ کر دیا ہے جس کا ذکر اس مثنوی میں نہیں ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر میر نے 'اژدر نامہ' میں خود کو 'اژدہا' کہا ہے تو کیا ہم بھی انھیں 'اژدہا' تسلیم کر لیں؟

کسی بھی شاعر کے کلام کا اس کی زندگی پر اطلاق کرنا قابل قبول نہیں ہے۔ ریاض خیر آبادی کا ایک مکمل دیوان خمریات پر ہے لیکن انھوں نے شراب نوشی تو درکنار کسی شرابی کو نہ دیکھا ہوگا۔ عمر خیام نے ساری زندگی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا لیکن ان کی تمام تر شاعری شراب و مے خانے سے معمور ہے۔

حالانکہ شراب، ساقی، مے خانہ کلاسیکی غزل کے اہم موضوعات ہیں۔ میر نے بھی ان تمام موضوعات کو برتنے سے گریز نہیں کیا۔

مے خانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ
دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے

کچھ سوجھتا نہیں ہے مستی میں میر جی کو
کرتے ہیں پوچ گوئی پی کر شراب کیا کیا

لیکن ہم ان اشعار کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ میر شراب کا شوق رکھتے تھے۔

ٹی ایس ایلیٹ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'شخصیت' یا 'ذات' کو ادبی اظہار کے ضمن میں شمار نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاعر کسی جذبے کا نہیں بلکہ محض ایک وسیلے (میڈیم) یعنی صنف سخن کا اظہار کرتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

’’جو لوگ غزل کو خود نوشت کے طور پر پڑھتے ہیں وہ کلاسیکی غزل کی شعریات سے ناواقف ہیں۔‘‘[10]

مزید لکھتے ہیں:

’’میر کا کمال یہ نہیں ہے کہ انھوں نے غزل کے پردے میں اپنی داستان عشق نظم کر دی۔ کلیات کا معمولی سا مطالعہ بھی بتا دے گا کہ مختلف واقعات و کیفیات و حالات و جذبات کا یہ بیان، ایسے رویّوں کا بیان جو آپس میں کسی طرح بھی Consistent نہیں ہیں۔‘‘[11]

تاہم میر کے شہر آشوب یا بعض غزل کے اشعار دلّی کی تاریخ اور سیاسی واقعات پر بخوبی روشنی ڈالتے ہیں جس کی بڑی مثال یہ شعر ہے۔

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

اس کے علاوہ بھی دلّی کی تباہی کے بارے میں ایسے اشعار موجود ہیں جو دلّی کے سیاسی، سماجی و معاشی حالات کے عکاس کہے جا سکتے ہیں۔

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تاج و تخت کا

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

خرابہ دلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

دل کی آبادی کو اس حد بدخرابی کہ نہ پوچھ
دل و دلّی دونوں ہیں گرچہ خراب

جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا
پہ کچھ لطف اس اجڑے نگر میں ہے

دلّی تھی طلسمات کہ ہر جا کہ میر
ان آنکھوں سے آہ ہم نے کیا کیا دیکھا

ان اشعار سے میر کے زمانے کی سیاسی و سماجی وارداتوں کا انکشاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ذات کا مکمل اظہار ممکن نہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کے الفاظ کے ذریعے میں اپنی بات کو مزید واضح کرنا چاہتی ہوں:

’’اصل یہ ہے کہ میر کی سیرت اور کلام میں بہت سے تناقضات ملتے ہیں اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو میر ہیں۔ ایک کی غیرت، حمیت، شرافت، کشادہ قلبی اور پاک مشربی کی انتہا نہیں۔ دوسرا بے دماغ اور مغرور ہے۔ وہ اپنے آگے کسی کو نہیں سمجھتا۔ کبھی کبھی وہ رئیسوں اور امیروں سے بھی ملتا ہے، دلی کے کج کلاہ لڑکوں سے بھی دل بہلاتا ہے۔ مدح بھی لکھتا ہے، ہجو بھی۔ وہ ذاتی عناد کی بنا پر حقائق پر پردہ ڈال سکتا ہے اور احسانات سے قطع نظر کر سکتا ہے۔‘‘[12]

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ میر تقی میر کا غزلیہ کلام ان کی تخلیقی قوتوں کا مظہر تو ہے لیکن اسے سوانحی کلام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ غزل کا پیمانہ ہی بنیادی طور پر محدود ہوتا ہے۔ اس میں کسی بڑے خیال یا کسی سیاسی و سماجی واقعے کی تفصیلات نظم کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ کلاسیکی غزل میں داخلیت اور رمزیت کا عنصر زیادہ پایا جاتا تھا اور عہد میر میں اردو غزل فارسی غزل کے بالمقابل اپنی نئی شناخت قائم کر رہی تھی۔ اس لیے میر کی غزل میں باقاعدہ سوانحی یا سیاسی عناصر کی جستجو یا امید کرنا مشکل ہی نہیں غیر حقیقی بھی ہے۔

حواشی

1. مجنوں گورکھپوری، مضمون: 'میر اور ہم'، مشمولہ: دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو (میر: حیات اور غزل، جلد اول)، مرتبہ ریشماں پروین، ص270
2. بحوالہ: انتخاب کلام میر، مرتب حامدی کاشمیری، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی
3. محمد حسین آزاد، آب حیات، ص203-202، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1982
4. کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، پرانی شاعری، حصہ اول، ص130، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 1985
5. مجنوں گورکھپوری، مضمون: 'میر اور ہم'، مشمولہ: دیدنی ہوں جو سوچ کر دیکھو (میر: حیات اور غزل، جلد اول، مرتبہ ریشماں پروین، ص275
6. مجلہ غالب نامہ، میر تقی میر نمبر، جولائی 2000، جلد 21، شمارہ 2
7. دلّی کالج میگزین، میر نمبر میں یہ دونوں مضامین شامل ہیں۔
8. بحوالہ مضمون: حیات میر، کلب علی خاں فائق، دلی کالج میگزین، میر نمبر 1962، ص56
9. خالد سہیل، میر کا فن اور پاگل پن، مشمولہ میر تقی میر عالمی سیمنار (مجموعہ مقالات)، غالب اکیڈمی، کینیڈا
10. شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد۔ اول، ص144
11. شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز، جلد۔ اول، ص144
12. خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میر۔ حیات اور شاعری، انجمن ترقی اردو ہند، ص264

■

Dr Aaliya
Assistant Professor
Zakir Husain Delhi College (E)
University of Delhi,
Delhi- 110002
aaliya321.in@yahoo.com

تنہائی
ذات کی دریافت کا وسیلہ
(جدیدیت کے شعری حوالے سے)

فہمیدہ علی

تنہائی ایک اہم انسانی جبلت ہے اس کائنات میں جب سے انسانی شعور کا آغاز ہوا تب سے یہ فرد کی داخلی دنیا میں خصوصی مقام رکھتی آئی ہے یہ ازل سے ابد تک زمین اور آسمان کی حدود سے بے نیاز تمام افراد کے تجربات و مشاہدات کا ناقابل فراموش حصہ رہی ہے۔ جیسے جیسے انسان نے شعور کے ساتھ معاشرے اور تہذیب کے مراحل طے کیے ہر زمانے کے تبدیل ہوتے حالات کے ساتھ ساتھ تنہائی کی نوعیت بھی بدلتی گئی۔ پیغمبروں سے لے کر عام انسانوں تک ہر حساس دل نے احساس تنہائی کا کرب جھیلا اور برداشت کیا ہے۔ تنہائی (Loneliness) ایک پیچیدہ اور عموماً ناخوشگوار جذباتی ردعمل ہے جو سماجی اکیلے پن کی وجہ سے ابھرتا ہے۔ تنہائی میں عموماً ایک اندرونی کیفیت تیزی سے ابھرتی ہے جس میں کوئی قریبی تعلق یا ربط درکار ہوتا ہے۔ یہ خواہش یہ کیفیت حال اور مستقبل دونوں پر محیط ہو سکتی ہے۔ تنہائی کی وجوہات مختلف ہو سکتی ہیں: سماجی، دماغی، جذباتی اور جسمانی عوامل کی وجہ سے بھی یہ فرد پر حاوی ہوتی ہے اس تنہائی کے نتیجے میں زاویہ نشینی شرمیلا پن اور سماجی تجسس جیسے عمل فرد کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ دنیا کے تمام ادب میں پائی جانے والی ہر صنف سخن میں تنہائی کا موضوع خاص طور پر موجود رہا ہے اس کی سب سے عمدہ مثال فارسی اور اردو کی کلاسیکی شاعری ہے۔

اردو شاعری کی روایت میں 'تنہائی' کا موضوع اُس کی ابتدا سے قائم و دائم رہا ہے اور ہر دور میں مختلف رجحانات و نظریات کے ساتھ تخلیق کار کی داخلی دنیا کا ہمنوا بن کر سامنے آیا ہے۔ قدیم دور پر نگاہ ڈالیں تو ہم تنہائی کا تصور ان معنوں میں نہیں پاتے جو ہمیں دور جدیدیت میں ملتے ہیں۔ ہر دور اپنا معاشرہ اور اس سے جڑے اعتقادات و نظریات لے کر زندگی کے منظرنامے پر ابھرتا ہے، اس سے جڑے سیاسی و سماجی حالات ہی اس کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ میر کے دور کے احساس غم و الم سے لے کر ہندوستان میں بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی رویوں نے احساس تنہائی کو ان کے یہاں دل کی ویرانی کا نام دیا تو وہیں غالب کے یہاں تنہائی کے دوران وقت کاٹنا ایک مشکل عمل ٹھہرا۔

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

اقبال نے جہاں تنہائی کو تخلیق کار کے لیے نعمت قرار دیا ہے تو وہیں دور رومانیت میں فراق نے اسے اپنی شب کا بہترین ساتھی بنا کر شاعری میں پیش کیا اور رات کی تاریکیوں میں تنہائی کی شمعیں روشن کر کے اردو شاعری میں 'شب کی شعری روایت' کا اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ ترقی پسندی کے دور میں فیض نے تنہائی کی جس کیفیت کو اپنی نظم 'تنہائی' میں برتا وہ اردو شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی تنہائی کے موضوع پر متعدد اشعار اور نظمیں لکھی گئیں لیکن فیض کی اس نظم کے پائے تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ المختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موضوع تنہائی کا تعلق اردو کی شعری روایت میں قدیم اور کثیر المعانی رہا ہے، اس کی ساخت اور معنویت میں ہر دور میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔

60 کی دہائی میں اردو کی شعری روایت کا احاطہ کریں تو ہم پاتے ہیں کہ یہ دہائی اردو ادب میں وجودی رجحانات کی مرہون منت تھی جس میں مختلف رجحانات جدیدیت کے طور پر وجودیت کی تصویر بن کر ابھرے، ایک طرف جہاں صنعتی نظام زندگی نے فرد کی فردیت پر قدغن لگایا اور معاشرے میں اس کی اہمیت کو ختم کرنے کی حد تک متاثر کیا، وہیں دوسری طرف ان کے نتیجے میں فرد مختلف داخلی تجربات و احساسات کا شکار ہو گیا۔ نتیجتاً ان میں منفی اثرات زیادہ نمایاں ہوئے جن میں خوف، عدم اعتماد، بے بسی، بے چینی، عدم اطمینان، یاس و ناامیدی، موت، خودکشی کے علاوہ جو سب سے زیادہ نمایاں داخلی پہلو سامنے آیا وہ 'تنہائی' تھا۔ یہ دہائی ذہنی انتشار کی دہائی تھی جس میں دیرینہ روحانی و اخلاقی اقدار کی پامالی کے ساتھ ساتھ طویل مشترکہ قومی، تہذیبی، تاریخی، جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی کی تمام روایات تقریباً ختم ہوتی نظر آنے لگی تھی۔ بین الاقوامی سطح پر دیکھا جائے تو یہ دور خالص ذہنی انتشار کا دور تھا، اس دور کے تخلیق کار کے ذہنی پس منظر میں دو عظیم جنگوں کی ہولناک تباہی تھی اور تیسری کے سایے اُن کے سروں پر کسی آسیب کی مانند منڈلا رہے تھے۔ ترقی یافتہ ممالک اسلحوں کی دوڑ میں ایک دوسرے پر اپنی برتری ثابت کرنے میں پیش پیش تھے۔ ایسے دور میں بے یقینی اور موت کی فضا کا قائم ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اسلحوں کی اس جنگ نے جس کا سب سے زیادہ نقصان کیا وہ انسان کی ذات تھی۔ اس دور کے انسان کی زندگی کی ارزانی نے تخلیق کاروں کے ذہن مفلوج کر دیے تھے ایسے میں رومانیت اور کھوکھلی انقلابیت کی نعرے بازیوں سے کہیں زیادہ بہتر انہیں داخلی جذبات کی ترجمانی کا راستہ نظر آیا۔ بیسویں صدی کے اہم مفکرین جن میں نطشے، فرائیڈ، اور کارل مارکس کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں، ان میں ایک طرف نطشے نے خدا کی موت کا اعلان کر کے اس بات پر زور دیا کہ فرد اجتماع میں گم ہو کر اپنی اہمیت کھوتا چلا چلا جا رہا ہے، مارکس نے سماج میں لاشخصی سطح پر بہ جبر جینے والوں کے احساس تنہائی میں اجنبیت اور بے گانگی کے رجحان پر کام کیا وہیں فرائڈ نے عصری معاشرے میں

اجتماعی نیوروسس (Neurosis) کی تشخیص کرتے ہوئے تنہائی کو اس کی ایک اہم علامت قرار دیا۔ اس کے علاوہ پہلی جنگ عظیم کے بعد Franz Kafka نے کائنات اور زندگی کے متعلق اپنی تصنیف "The Castle" میں زندگی کو کائنات کی استعاراتی شکل میں پیش کیا اور یہ نمایاں کیا کہ انسان اس کائنات میں خالی ہاتھ یعنی 'تنہا' ہے۔ اس طرح ان مفکرین اور ادبا نے 'احساس تنہائی' کو داخلی رجحان کا ایک اہم جز قرار دیا۔ اس دور میں ہونے والی بڑی جنگوں اور صنعتی تمدن کی وسعت نے اس تنہائی کے احساس کو عالم گیر حیثیت عطا کر دی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ فرد اب بین الاقوامی برادری کا ایک رکن ہے وہ مخصوص جغرافیائی تہذیبی دائروں تک محدود نہ ہو کر اب

”
جدیدیت کے فرد کی تنہائی قدیم یا روایتی نہیں تھی، بلکہ اس دور میں تنہائی کی نوعیت مختلف ہے جہاں تنہائی کا احساس زندگی کی فضا پر محیط ایک ہمہ گیر تجربے کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔
“

بین الاقوامی برادری کا ایک خاص حصہ ہے۔ صنعتی تہذیب کی جانب تیزی سے بڑھتی ہوئی دنیا نے انسان کے وجود کو لاچار و بے بس بنا دیا، انسان کے حالات پر اس کی کوئی گرفت نہ رہی بلکہ وہ خود اسباب وعلل کی گرفت میں آ گیا، خارجی اور داخلی سطحوں پر انسان کی شخصیت مسخ ہونے لگی۔ مشینی زندگی کے مصنوعی ذرائع نے فرد سے اس کی تخلیقی صلاحیت وانفرادیت کے ساتھ ساتھ داخلیت بھی چھین لی جس کے سبب تنہائی کا احساس شدت اختیار کر گیا۔ ان مغربی مفکرین نے فلسفہ وجودیت کے زیر اثر جن جذبات کی تشکیل کی ان میں 'احساس تنہائی' ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے، اس کے نتیجے میں خوف بے معنویت دہشت مہملیت مایوسی، نا امیدی، دکھ، اجنبیت، بے گانگی کا احساس، اکتاہٹ، خودکشی اور موت کے رجحانات عام ہوئے اس کے علاوہ ان جذبات سے منسلک ومتعلق دوسرے متعدد رجحانات ومیلانات کا پس منظر بھی احساس تنہائی ہی تھا جو درحقیقت صنعتی ومیکانکی معاشرے اور مشینی تہذیب کی دین ہے۔ یہ تمام اثرات عالمی سطح پر مرتب ہوئے۔ ہندوستانی معاشرہ بھی ان سے اچھوتا نہیں رہا، جس کے پس منظر میں ایک جانب تقسیم کا المناک واقعہ اور اس سے متعلق رنج والم تھا وہیں دوسری جانب مشینی زندگی نے یہاں بھی اپنے پاؤں جمانے شروع کر دیے تھے۔ اردو ادب میں احساس تنہائی کے اجتماعی شعور کے متعلق لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

”اردو کے اجتماعی شعور اور جدید حسیت کو تیسری دنیا میں گوناگوں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ادبی ولسانی مسائل ومعاملات نے بھی ہمہ گیر سطح پر متاثر کیا ہے۔ مغرب کی تہذیبی جارحیت، فوجی مادیت، اقتداری آمریت، استحصالی صارفیت اور ہند و پاک میں تہذیبی و لسانی عصبیت، فرقہ وارانہ منافرت، قبیلہ جاتی عداوت، تقلیدی مذہبیت، ظلم و بربریت، افلاس وغربت، بیماری و جہالت، بنیاد پرستانہ سیاست، بوالہوسی وخود غرضی وغیرہ جیسے متعدد مہلک اور خطرناک مسائل نے اردو سائیکی کو مزید بحران وانتشار میں مبتلا رکھا ہے، جس کے نتیجے میں تنہائی کا احساس شدید تر ہو گیا ہے۔“

(ڈاکٹر لطف الرحمان: احساس تنہائی اور غزل، مشمولہ معاصر اردو غزل :قمر رئیس، ص 86، اردو اکادمی نئی دہلی 2004)

ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے اردو ادب میں اس بحران کی جس طرح عکاسی کی ہے وہ قابل توجہ ہے کیونکہ ہندوستان میں جدیدیت کا زمانہ آزادی کے بعد کا زمانہ تھا جہاں ہندوستان کی آزادی کی مسرت کے ساتھ ساتھ ملک کی تقسیم کا داغ بھی منسلک ہو گیا تھا، جس نے ذہنی سطح پر ہر خاص وعام کو متاثر کیا۔

جدیدیت کے فرد کی تنہائی قدیم یا روایتی نہیں تھی، بلکہ اس دور میں تنہائی کی نوعیت مختلف ہے جہاں تنہائی کا احساس زندگی کی فضا پر محیط ایک ہمہ گیر تجربے کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔ یہ دور انتشار کا دور تھا، جس میں دیرینہ روحانی واخلاقی اقدار کی پامالی کے ساتھ ساتھ طویل مشترکہ قومی، تہذیبی، تاریخی، جذباتی اور ذہنی ہم آہنگی کی تمام روایات اختتام پذیر تھیں۔ جس میں فرد کسی مشین کی صورت زندگی گزارنے پر مجبور نظر آتا ہے۔ میکانکی دور میں جہاں 100 افراد کا کام ایک مشین سے مکمل ہو سکتا ہے وہاں فرد کی حیثیت مشین کے ایک پرزے کی مانند رہ گئی جو ایک محدود دائرے میں رہ کر اجتماعی حرکت پر مجبور ہے، ان تمام نئی تبدیلیوں نے فرد کی انفرادیت کو یکسر ختم کر کے رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں فرد ذاتی طور پر تنہائی کا شکار ہوا، اس تنہائی نے اسے مختلف منفی میلانات سے دوچار کیا ساتھ ہی اس کے معاشرے کی مشترکہ طور پر ہونے والی تبدیلیوں نے بھی اسے تنہا کر دیا۔ یہ تنہائی ترقی پسندی کی زندانی یا رومانیت کی رومانی تنہائی نہیں تھی بلکہ یہ ایسی تنہائی تھی جہاں فرد اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر رہنے پر مجبور ہوا اور پھر اس کا عادی ہو گیا۔ اس احساس تنہائی نے اسے مجبور ہونے کے ساتھ ہی باغی بھی بنا دیا، اس دور کا انسان ایک ایسا فرد بن کر سامنے آیا جو محبوب سے بے نیاز، دنیا سے خوف زدہ، تشکیک کے مرض میں مبتلا خدا سے دور نظر آتا ہے، اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں اور نہ ہی کوئی منزل، اسے اس دنیا میں ذمے داریوں کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا گیا ہے، جن کی تکمیل کے لیے اسے اپنی ذات کے علاوہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں ہے، اسے یہ کائنات بے معنی لگتی ہے، جہاں اس کے ڈھیروں مسائل کا کہیں کوئی حل نہیں ہے۔ اس دور کے فرد کی تنہائی نفسیاتی نہ ہو کر وجودی ہے، جس میں فرد باہمی شخصی رشتوں کی تشکیل از سر نو کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ وجود کی جانب اپنا سفر مکمل کر سکے۔ اس دور کی تنہائی سے متعلق شمس الرحمٰن فاروقی اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

”تنہائی بہر حال ہمارے دور کی ایک حقیقت ہے اور یہ سرخ سیاہ میمنہ کسی ایک حد تک محدود نہیں ہے۔ انیسویں صدی سے انسانی شخصیت کے اوپر استبداد ذہنی و جسمانی کا جو دور شروع ہوا ہے اس کا یقینی نتیجہ یہ ہے کہ ہم روز بروز زندگی کے مصروف تر اور ہنگامہ خیز تر ہوتے جانے کے باوجود زندگی کے عام لمحوں میں کبھی کبھی اور داخلی احساس کے لمحات میں تقریباً ہمیشہ خود کو اپنے اجداد سے زیادہ تنہا پانے لگے ہیں۔ تخلیقی ادب اس پارہ پارہ کرنے والی حقیقت سے بھاگ نہیں سکتا اور آج کے دور میں تو یہ اور بھی مشکل ہے، کیونکہ شاعر کا فن جو مشکل تر کو طلب کرتا ہے، اپنے سب سے زیادہ منفرد فنکاروں کو عام فنکاروں سے زیادہ پیٹتا اور کوٹتا ہے۔“

(جدید ادب کا تنہا آدمی نئے معاشرے کے ویرانے میں: شمس الرحمٰن فاروقی، ص 301، مشمولہ شب خون)

فاروقی کے درج بالا قول کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر ہم دیکھیں تو پاتے ہیں کہ ہندوستان میں آزادی کے بعد کے فطری تقاضوں سے جو غالب رجحان سامنے آیا وہ مایوس کن کیفیات، ذہنی انتشار، خوف، دہشت، تنہائی، داخلی کرب کے علاوہ آس پاس کی دنیا اور ماحول کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے ذاتی ردعمل کا اظہار کرنے سے عبارت تھا۔ جدید دور کی تنہائی اپنے ساتھ کرب آگہی، دکھ و نارسائی، زندگی کی بے معنویت کا احساس بھی لائی، جدیدیت کے رجحان کے زیر اثر خلیل الرحمان اعظمی، شہریار، زبیر رضوی، احمد مشتاق، ناصر کاظمی، شکیب جلالی،

راجیندر منچندا بانی، ساقی فاروقی، سلیم احمد، بلراج کومل وغیرہ کے یہاں تنہائی کی کیفیت و کش مکش کا واضح اظہار ملتا ہے۔ان شعرا کے یہاں ابتدائی دور میں خود پسندی، اپنے خوابوں سے وابستگی اور پھر انھیں خوابوں کی شکست کا اعتراف بھی ملتا ہے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی کے خیالات کی جانب رجوع کرتے ہیں:

”نئے شاعروں کی تنہائی جدید زندگی کا جبر ہے، یہ تنہائی اپنی ذات اور شعور کے بعد کی منزل ہے، انسان نے ماورائی خدا سے اپنا دامن چھڑا لیا ہے اور خدا کے مقابلے میں مشین پیدا کی لیکن وہ خود اپنی تخلیق کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔مشین پر اس کا اختیار نہیں، گویا زندگی کی رفتار پر اس کا کوئی کنٹرول نہیں، یہ احساس بے چارگی اور پھر یہ احساس بھی کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں 'بے چہرہ' ہے، تنہائی کے فطری اسباب ہیں، لیکن یہ تنہائی صرف فن کار تک محدود نہیں بلکہ یہ ہر فرد کا مقدر ہے اگر وہ حساس واقع ہوا ہے۔“ (جدید اردو نظم: ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی)

ڈاکٹر عقیل احمد کے مطابق موجودہ دور کی تنہائی صرف فن کار نہیں بلکہ ہر حساس طبیعت فرد کا مقدر ہے جس نے اس معاشرے کی بے چہرگی کو محسوس کیا ہے۔

جدید اردو شاعری میں نظم اور غزل دونوں ہی حوالے سے ایک تغیراتی فضا قائم رہی ہے، 60 کی دہائی میں ہم پاتے ہیں کہ زندگی کی فریب کاریوں نے تخلیق کار کو فرض شناسی پر مجبور کر دیا۔اس دور کا فرد ہر لمحہ نئی سچائیوں کا سامنا کرنے اور حقائق میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے میں یقین رکھتا نظر آتا ہے۔اس سلسلے میں یہ نظم دیکھیے:

میں اپنے جسم سے باہر نکل کے دیکھوں گا
یہ کائنات مجھے کس طرح کی لگتی ہے
فریب ذات کا احساس گو کہ اچھا ہے
بہت کٹھن ہے سفر آگہی کی منزل کا/
بھٹک رہا ہوں میں صدیوں سے ایسی دنیا میں/
جہاں پہ جسم سے ہو کر نکلنا پڑتا ہے/ہر ایک خواب کو رستہ بدلنا پڑتا ہے۔

(LUST فضیل ہاشمی)

دور جدید میں شہری زندگی کے انتشار میں اضافہ نظر آتا ہے اور ہمارے شہر مغربی تمدن اور مغربی ذہنیت کے مماثل نظر آتے ہیں، یہ مشینی دور کے ہی اثرات ہیں کہ انسان کے احساسات و جذبات مردہ ہو چکے ہیں، انسان کی زندگی کی ارزانیوں پر انسان کو ہی افسوس نہیں ہے، زندگی میں انتشار و خلفشار کا اظہار محض شاعری نہیں، بلکہ حقیقی زندگی کی ترجمانی ہے۔اس دور کا فرد کسی پنجرے میں قید پرندے کی مانند محدودیت اور بے معنویت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور نظر آتا ہے، لیکن کہیں کہیں اس اسیری کے خلاف اس کا مزاج بغاوت کے لیے حرکت میں آتا دکھائی دیتا ہے، بعض شعرا کی تخلیقات کو پڑھ کر یہ تاثر ذہن میں ابھرتا ہے کہ اس دور کا فرد نا امیدی، خوف، بے عملی اور مجبوری سے لڑنے کی بجائے ان سے گریز پا ہے یا بھاگ رہا ہے، اس تنہائی کی قید سے نجات کے لیے وہ کبھی نوکری، کبھی نیا شہر، کبھی نیا معاشقہ تلاش کرتا ہے، لیکن اسے ہر طرف سے صرف مایوس ہی ہونا پڑتا ہے۔

اس طرح بھیڑ کے میلے ٹھیلے میں/آدم زادوں کے ریلے میں/کیا حسن وادا/کیا عشق و ہوس/کیا خواہش شوق اور کیا حسرت/کیا شرم و حیا جرأت غیرت/ہر منظر بھیڑ میں ڈوب گیا/تنہا تنہا تنہا۔ (عمیق حنفی)

نئے شاعروں کی تنہائی جدید زندگی کا جبر ہے، یہ تنہائی اپنی ذات اور شعور کے بعد کی منزل ہے، انسان نے ماورائی خدا سے اپنا دامن چھڑا لیا ہے اور خدا کے مقابلے میں مشین پیدا کی لیکن وہ خود اپنی تخلیق کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔

درد تنہائی کے نقش پا پہ چل کر گم ہوا ریارہ گزار میں چھپ گیا/جس طرح مضطر بگولے اپنی بے تابی سے عاجز/تھک کے صحرا میں بنا لیتے ہیں خود اپنا قرار/اک جلا ازلی خموشی/اور تنہائی میں پنہاں درد کی پرچھائیاں/کی یہی ہے کائنات این و آں (باقر مہدی)

کثرت آبادی کے نتیجے میں شہروں کی جانب بڑھتی ہوئی بھیڑ نے ایک نئے معاشرے کو فروغ دیا جس نے لوگوں کو غیر شخصی اور غیر انفرادی و غیر انسانی سطح پر جیے جانے کو مجبور کر دیا، جس کے نتیجے میں فرد کی معاشرے میں منفرد ہونے کی خواہش ختم ہو کر رہ گئی۔اس دور کے فرد کا مقدر تنہائی ہے اور انسان اسی ماحول میں زندگی کو گوارا بنانے کے لیے راستے بنانے کی کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے، کیونکہ اس کے پاس اس کے علاوہ دوسری کوئی راہ نہیں ہے۔اس کربناک فضا کو شہریار اپنی ایک نظم میں طنز کی کیفیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

دھوپ میں تنہائی کی جسموں کو جھلساتے رہو
دوریوں کی سخت چٹانوں سے ٹکراتے رہو
اور دلوں میں خواہشوں کی آگ بھڑکاتے رہو
وقت کے صحرا میں یوں ہی ٹھوکریں کھاتے رہو

دور جدید کا فرد ایک ایسی زندگی کا مالک ہے جہاں ہر روز جینے کے لیے مرنا پڑتا ہے، اس نئی حسیت نے فرد کو شکست خواب کے دکھ سے دوچار کیا ہے، جہاں ماضی کے سایے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور صنعتی معاشرے کی بے رنگ زندگی میں اس ماضی کا احساس دگنا ہو جاتا ہے۔

بہت دنوں سے خیال کا خواب سے کوئی سلسلہ نہیں ہے
خموش راتوں کی ہولناکی میں نغمگی کا پتہ نہیں ہے
کتابیں کہتی ہیں زندگانی حسین خوابوں کا مدعا ہے
پیمبروں نے دیا ہے مژدہ زمیں کا بھی کوئی خدا ہے
ہم اپنی بے خواب جلتی آنکھوں میں زندگی کی چتا جلائے
جہاں بھی زندہ وجود ڈھونڈیں ملے وہاں موت ہی کے سایے
کروڑوں لمحوں کی لاش اٹھائے ہر ایک دن تھک کے ڈوبتا ہے
اسی جلوس فضا کو لوگوں نے زندگی کا لقب دیا ہے

(پتھروں کا مغنی)

اس صنعتی معاشرے میں آدمیوں کی بھیڑ تو ہے لیکن اس میں انسان کم ہیں بلکہ نہ کے برابر ہیں، کیونکہ یہ ہجوم جذبات و احساسات سے عاری ہے، یہ سب ایک طرح کی مشین ہیں، انھوں نے چہروں پر نقاب اوڑھ رکھے ہیں اور لوگوں سے تعلقات کسی Formality کے تحت نبھاتے نظر آتے ہیں، اس صورت حال نے فرد کی تنہائی کے کرب میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔وحید اختر کی نظم میں اس کا اظہار دیکھیے:

شہر انسانوں کے چہروں کا امنڈتا سیلاب
ہاتھ بڑھتے ہیں نظر ملتی ہے لب ملتے ہیں
دل اس انداز سے چپ چاپ ٹکا کرتے ہیں
جس طرح خواب میں کچھ لوگ ملیں آپس میں
واہمہ طرز نظر بات کا انداز فریب
ملنا پرچھائیں کا پرچھائیں سے کچھ بات نہیں
روح پہنے ہوئے پھرتی ہے سراپا کا لباس
خود تو محبوبۂ نادیدہ ہے چہرے ہیں نقاب
جن میں احساس نہ جذبات نہ افکار نہ جاں
کاغذی پیرہنوں ہی سے ہے آباد جہاں

(بند نقاب: وحید اختر)

جدیدیت کے دور کی تنہائی دراصل دو زمانوں ماضی اور حال کی شمولیت پر تشکیل ہوئی ہے، تخلیق کار کی نظر میں

یہ دونوں زمانے سکون و مسرت سے عاری اور انتشار و بے چینی سے پر ہیں، جہاں درد تنہائی میں اور تنہائی درد کا پیراہن بن کر ابھرتی ہے، جس کے زیر سایہ تخلیق کار خود کو چھپانے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ بعض اوقات وہ اس تنہائی سے بے زار ہو کر جب کھلی فضا میں سانس لینا چاہتا ہے تو وہ خود کو سب کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اسے اپنے گرد و پیش کے ماحول سے بے اعتنائی کی مہک آتی ہے، یہ نظم دیکھیے:

با وجود اپنی شناسائی کے/سرد وزن اجنبی سڑکیں ویران/بے نام/اور منزل کا پتہ نا معلوم/کس طرف رخ کروں کس سے پوچھوں ایک جیسے تھے مکیں/ایک جیسے تھے مکاں/میں بھٹکتا تھا گلی کوچوں میں/راہ گم کردہ سراسیمہ پریشاں صورت (گمشدہ: عتیق الرحمان)

اس دور میں جس نے تنہائی کے احساس کو وسیع کیا وہ شہری زندگی کا صنعتی نظام تھا جس نے اس دور کی نسل کو حد درجہ متاثر کیا، سائنسی ایجادات اور انسان کے مشینی طرز زندگی نے فرد کو مجمع میں بھی تنہائی کا احساس دلایا۔ یہ تنہائی گزشتہ دور کی تنہائی کے احساس سے الگ تھی یہاں فرد ذاتی پریشانیوں سے نہیں بلکہ اجتماعی دور میں اپنی ذات کی بے حرمتی کی وجہ سے اکیلا پن محسوس کرتا ہے، مثال کے طور پر وحید اختر اپنی نظم 'راکھ کا گھر' میں تنہائی کا بیان کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔

کون آگ بجھا سکتا ہے/تنہائی کے صحرا میں ہر شخص گریزاں تھا اپنے ہی دامن کو شعلوں سے بچائے تھے/سب اپنے ہی خوابوں کو آنکھوں میں چھپائے تھے/ہم خود ہی چلے تنہا/اوروں کا تو کیا شکوہ/اس کو بھی نہ ہو پائی تنہائی کے جلنے کی لٹنے کی خبر اب تک/ہم کعبہ تنہائی کا جس کو خدا سمجھے/اب راکھ میں بیٹھے ہیں مجروح شکستہ دل/دل سوختہ غم خوردہ/کیا جانے کرید یں گے اس راکھ کو ہم کب تک

جسم اپنا تھا میں/ذہن اپنا تھا میں/خود سے مقدور کے دائرے میں شناسا بھی تھا/حادثہ مجھ پہ گزرا عجب یہ کہ میں/آج اپنی ہی پہچان کے کیسے آزار میں گھر گیا/اب یہاں کون ہوں/نام میرا ہے کیا/کس کا ہم دم ہوں میں/کس کا ہم زاد ہوں/کون میرا ہے ہم زاد چاروں طرف سے اڈتی ہوئی بھیڑ میں/باد مسموم میں/جسم و جاں کو جھلستی ہوئی ریگ پیکار میں گھر گیا/میں مکافات کے سیل اسرار میں گھر گیا (میں ایک اور میں: بلراج کومل)

ہر شاعر اپنے خیالات، اعتقادات اور محسوسات کے اظہار کے لیے مختلف زاویہ نظر رکھتا ہے اور انھیں برتنے کے لیے اپنے طور پر جدید تشبیہات و استعارات کا استعمال کرتا ہے۔ اس عمل میں اسے اپنی دنیا میں مگن ہونا پڑتا اور

اس دور میں جس نے تنہائی کے احساس کو وسیع کیا وہ شہری زندگی کا صنعتی نظام تھا جس نے اس دور کی نسل کو حد درجہ متاثر کیا، سائنسی ایجادات اور انسان کے مشینی طرز زندگی نے فرد کو مجمع میں بھی تنہائی کا احساس دلایا۔یہ تنہائی گزشتہ دور کی تنہائی کے احساس سے الگ تھی یہاں فرد ذاتی پریشانیوں سے نہیں بلکہ اجتماعی دور میں اپنی ذات کی بے حرمتی کی وجہ سے اکیلا پن محسوس کرتا ہے۔

دوسرے کی دنیا سے بے نیازی اختیار کرنا پڑتی ہے، یہ اس کے اندرونی جذبات بھی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی معاشرتی نظام کی مجبوری بھی۔ اپنی اس کیفیت کو درست کرنے یا اس سے بچنے کے لیے وہ معاشرے کے قریب ہونا چاہتا ہے، لیکن وہاں پر اسے وقت کی ناسازگاری، زندگی کی الم نصیبی اور مادی عناصر کی بے ثباتی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں اس کے اندر کی فضا بدلتی ہے اور وہ ان حالات میں خود کو ڈھال لیتا ہے، لیکن یہ ڈھلنا مطمئن ہونا نہیں ہے بلکہ اس ناکامی سے فرد ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں اسے زندگی کے خوش گوار پہلوؤں سے بھی کسی قسم کی مسرت کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کیفیت سے بے زار ہو کر فرد خود پسندی اور ذات پرستی کی راہ کا انتخاب کرتا ہے اور اپنی ذات کو مستحسن قرار دیتا ہے، اسی مقام پر وہ اجنبیت، شکستگی اور تنہائی کا معتکف ٹھہرتا ہے۔ لیکن جدیدیت کے دور کی یہ تنہائی فرد کو صرف غم و الم سے دوچار نہیں کرتی، بلکہ یہ اسے پسند آنے لگتی ہے، وہ اس کا اسیر ہونے لگتا ہے اور اسی اسیری میں خود کلامی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں/جہاں میں ہی میں ہوں/جہاں میرا سایہ ہے/سایے کا سایہ ہے/اور دور تک بس خلا ہی خلا ہے (میں میں گم نہیں ہوں: خلیل الرحمن اعظمی)

میں اپنے خول کے اندر سمٹ کے بیٹھ رہنا چاہتا ہوں/مجھے مینار کی کھڑکی سے جھک کر جھانکنے کی بھی ضرورت/کچھ نہیں ہے (شمس الرحمن فاروقی)

کتنا تنہا ہوں میں کتنا تنہا
رات تاریک ستارے مغموم
سرد ہیں زہرہ و پرویں کے نگاہوں کے شرار
ہے فضاؤں کے شبستاں پہ تعطل کا حصار
اور یہ دشت جسے دیکھ کے ہیبت کو بھی خوف آ جائے
اپنی خاموشی پیہم سے سرگرم کلام

(پھیلے ہوئے ہاتھ: مظہر امام)

سیاسی بدکاریوں اور شہروں کے پھیلاؤ نے بھی اس دور کے تخلیق کار کو بدگمانی کے صحرا میں لے کر کھڑا کر دیا، نتیجتاً علیحدگی، بے گانگی، اکیلا پن اور خلوت جیسے احساسات اس کی زندگی کا ایک اہم جز بن گئے اسی لیے جدیدیت کے رجحان میں وجود کی سطح پر ابھرنے والا سب سے پر اثر رجحان تنہائی تھا۔ داخلی ارتقا کے اولین مرحلوں میں تنہائی درد و الم، اضطراب، انتشار، عارضیت، بے ثباتی، ناامیدی و محرومی کے جذبات سامنے آتے ہیں۔ جدیدیت کے دور کی شاعری میں ان تمام احساسات کا اظہار موثر طریقے سے ہوا ہے۔ یہ دور 'شکست خواب' کا دور تھا، جس میں شعرا کے یہاں کسی بھی عزیز شے کے کھو جانے کا غم نمایاں ہے، یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

اندھیری رات کی اس رہ گزر پر
ہمارے ساتھ کوئی اور بھی تھا
افق کی سمت وہ بھی تک رہا تھا
اسے بھی کچھ دکھائی دے رہا تھا
اسے بھی کچھ سنائی دے رہا تھا
مگر یہ رات ڈھلنے پر ہوا کیا
ہمارے ساتھ اب کوئی نہیں ہے

(تنہائی: شہریار)

دیواریں ہیں دیواریں جو تنہائی کا چہرہ ہیں
اس چہرے میں وہ چہرہ ہے
جس کو روز ازل سے ڈھونڈ رہا ہوں
میری کوئی راہ نہیں ہے، ساری راہیں میری ہیں
میں سرگشتہ، میں خوابوں کے محل میں ہفت سماوات اور زمین لے کر چلتا ہوں
لیکن دیکھ نہیں سکتا ہوں (تنہائی کا چہرہ: افتخار جالب)

جدیدیت پسند شعرا کے یہاں عرفان ذات کی کوششوں نے تنہائی کے احساس کو تو بڑھایا ہی ہے، ساتھ ہی ہر نظریے، عقیدے اور اصول سے اس کی بے زاری بھی پیدا ہوئی، ان تمام اثرات کی جڑیں فلسفہ وجودیت

تنہائی انسان کے داخلی رویے اور اس کے ماحول کے منفی اثرات سے پیدا ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں یکسانیت، بے زاری واکتاہٹ جیسے جذبات کلام میں در آتے ہیں اور فرد معاشرتی جماعت میں رہنے کے بجائے علیحدہ رہنے کو فوقیت دیتا ہے۔ دھیرے دھیرے و ہ اس تنہائی سے ایسا مانو س ہو جاتا ہے کہ اسے یہ تنہائی اچھی لگنے لگتی ہے۔

سے منسلک تھیں، جس میں ایک تلخ تجربہ تھا کہ ''کسی بھی شے کی کوئی حقیقت نہیں ہے'' جس نے فرد اور تخلیق کار دونوں کو ہی زندگی کی لایعنیت کا اسیر بنا دیا، ساتھ ہی اس میں تشکیک کا رویہ بھی ابھرا جو کہ تنہائی کی ہی ایک کڑی تھا افتخار جالب نے اپنی نظم 'تنہائی کا چہرہ' میں اس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔

وہیں غزل میں یہ تنہائی، مایوسی، نا امیدی اور خود ترسی، احساس کمتری، خوف، انتظار اور درد کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہے
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھا دے کوئی

(ساقی فاروقی)

اِک سفینہ ہے تری یاد اگر
اِک سمندر ہے مری تنہائی

(احمد ندیم قاسمی)

تنہائی میں کرنی تو ہے اِک بات کسی سے
لیکن وہ کسی وقت اکیلا نہیں ہوتا

(احمد مشتاق)

دن کو دفتر میں اکیلا شب بھر گھر میں اکیلا
میں کہ عکس منتشر اک اک منظر میں اکیلا

(بانی)

خموشی کے ہیں آنگن اور سناٹے کی دیواریں
یہ کیسے لوگ ہیں جن کو گھروں سے ڈر نہیں لگتا

(سلیم احمد)

غم و نشاط کی ہر رہ گزر میں تنہا ہوں
مجھے خبر ہے میں اپنے سفر میں تنہا ہوں

(محمود سعیدی)

دیکھ کبھی آ کر یہ لا محدود فضا
تو بھی کبھی میری تنہائی میں شامل ہو جا

(زیب غوری)

دروازے پہ پہرہ دینے
تنہائی کا بھوت کھڑا ہے

(محمد علوی)

یہ تنہائی انسان کے داخلی رویے اور اس کے ماحول کے منفی اثرات سے پیدا ہوئی ہے، جس کے نتیجے میں یکسانیت، بے زاری واکتاہٹ جیسے جذبات کلام میں در آتے ہیں اور فرد معاشرتی جماعت میں رہنے کے بجائے علیحدہ رہنے کو فوقیت دیتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ اس تنہائی سے ایسا مانوس ہو جاتا ہے کہ اسے یہ تنہائی اچھی لگنے لگتی ہے۔

اتنا مانوس ہوں سناٹے سے
کوئی بولے تو برا لگتا ہے

(احمد ندیم قاسمی)

اس اکیلے پن کے ہاتھوں ہم تو فکری مر گئے
وہ صدا جو ڈھونڈتی تھی جنگلوں میں کھو گئی

(پرکاش فکری)

اور آہستہ آہستہ وہ تنہائی کے خوف سے ہراساں ہونے کی بجائے اس میں فرحت محسوس کرنے لگتا ہے۔

دشت تنہائی میں جینے کا سلیقہ سیکھیے
یہ شکستہ بام و در بھی ہم سفر ہو جائیں گے

(فضیل جعفری)

ایسا لگتا ہے کہ جدیدیت پسند شعرا جس ماحول میں سانس لے رہے تھے، وہ بیابانی، دھوئیں، گھٹن، تاریکی سے عبارت تھا، جہاں روشنی کی کوئی کرن سوچوں اور خیالوں تک میں راستہ نہیں بنا پاتی، یہ اضطراب اور گھٹن ایسا ہے جس سے نکلنے کی کوئی ممکن صورت ان کے یہاں نہیں ملتی۔

جب کمرے سے دل بھر جاتا ہے/ تو قہوہ خانے میں آ جاتا ہوں جب قہوہ خانے سے دل بھر جاتا ہے/ تو کمرے میں آ جاتا ہوں/ جب اپنے آپ سے دل بھر جاتا ہے/ تو سوچ کا رستہ رک جاتا ہے یادیں بنجر ہو جاتی ہیں/ اور جیون ایک اندھیرا بن جاتا ہے/ جس کے اندر آنے کی/ اور باہر جانے کی/ کوئی راہ نہیں ہے

(اندر باہر)

محمد علوی کے یہاں تنہائی کسی اداس چڑیا کی علامت کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے یہ نظم دیکھیے۔

کچھ دنوں سے اک چڑیا/ چپ اداس گم صم سی/ شام ہوتے آتی ہے/ گھر میں ایک فوٹو پر/ آ کے بیٹھ جاتی ہے/ اس سے گھڑی میری/ ٹھیک چھ بجاتی ہے/ کچھ ہی دیر میں چڑیا/ شام کے دھندلکے میں/ ڈوب ڈوب جاتی ہے/ اور گھر کا دروازہ/ رات کھٹکھٹاتی ہے

(محمد علوی: تنہائی)

اس دور کا شاعر ایک ایسے ماحول میں زندہ رہنے پر مجبور ہے، جس میں میکانگی جبر نے انسانی اقدار کو مسخ کر دیا ہے، فرد کا فرد سے رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔ زمین و آسمان کی لامحدود وسعتیں اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔

یہ زمیں یہ آسماں یہ کائنات/ ایک لامحدود وسعت ایک بے معنی وجود/ آدمی اس ابتری کی روح ہے/ آدمی اس مادے کا ذہن ہے/ ابتری اور انتہا/ مادہ لا انتہا/ آدمی محدود ہے/ آدمی کا ذہن بھی محدود ہے/ آدمی کی روح بھی محدود ہے/ یہ زمیں یہ آسماں یہ کائنات/ جبر کا اک سلسلہ

(تنہائی: زاہد ڈار)

المختصر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دور جدیدیت میں تمام شعری موضوعات، سماجی بے چینی کا مکمل اظہار تھے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ 60 کی دہائی ذہنی بحران اور انتشار کی شکار تھی، اس دور کے ادب میں مثبت سے زیادہ منفی رویوں کی تشکیل ہونا عام بات تھی جن کی ادب میں پر زور مخالفت بھی ہوئی، کبھی انھیں دماغی فتور کہا گیا تو کبھی ان رویوں کو ادب کے لیے خطرہ کہا گیا لیکن ان منفی رویوں کی آمد ادب میں ایک تیز ہوا کے جھونکے سے زیادہ نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ ادب سے ان منفی رویوں کا غبار چھٹ گیا اور ایک مثبت فضا جلد ہی قائم ہو گئی۔ اپنی زوال پذیری کے دور میں جدیدیت میں تنہائی کا تصور خلوت سے موسوم نظر آتا ہے جہاں فرد خودکشی اور موت کی جانب جانے کی بجائے عرفان ذات اور ایقان کی منزل کی طرف جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''جدیدیت صرف انسان کی تنہائی، مایوسی اور اس کی اعصاب زدگی کی داستان نہیں ہے۔ اس میں انسانیت کی عظمت کے ترانے بھی ہیں، اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے اور اس میں انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے۔''

(ادب میں جدیدیت کا مفہوم: مشمولہ، جدیدیت اور ادب: اگست 1969، ص 96)

■

Fahmina Ali
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202001 (UP)
Mob.: 7379636764

محمد نسیم

پریم چند کے ناولوں میں بین التہذیبی کشمکش

(میدانِ عمل اور گئودان کے حوالے سے)

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو فکشن کو سمت و رفتار دینے میں پریم چند کا نام سب سے اہم ہے۔ ویسے تو انھوں نے تراجم، صحافت، تنقید اور ڈراما جیسی اصناف میں بھی اپنے ادبی نقوش چھوڑے ہیں لیکن ان کی شہرت دوام کا باعث ناول اور افسانے ہی قرار پائے جو ہماری ادبی تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ پریم چند کا دور سیاسی اعتبار سے انتشار کا دور تھا، ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کی لہر پیدا ہو چکی تھی، مہاتما گاندھی کے زیر قیادت پورے ملک میں عوام کی ذہن سازی کی جا رہی تھی اور ہندوستان کی آزادی کے لیے فضا تیار کی جا رہی تھی۔ نمک قانون، سول نافرمانی اور ترک موالات جیسی تحریکیں چلائی جا چکی تھیں۔ ایسے میں پریم چند بھی مہاتما گاندھی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے قلم کے ذریعے آزادی کی لڑائی کو تقویت دی۔ ان کا خیال تھا کہ ایک جابر سامراج کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر گاؤں سے اس کے خلاف آواز بلند ہو، ہر طبقے اور سماج کے لوگ اس میں شامل ہوں۔ مدارس کے سب انسپکٹر رہتے ہوئے انھیں گاؤں کے خوب دورے کرنے پڑے۔ اسی لیے پریم چند کی تحریروں میں گاؤں اور مزدور طبقے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ اپنی تحریروں سے کسانوں میں وہ بیداری لانا چاہتے ہیں جو خود ہی ایک منظم طاقت بن کر ظالم حکمرانوں اور زمینداروں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دے۔ 'میدان عمل' ایک ایسا ہی ناول ہے۔ جس کے تمام کردار عمل کے میدان میں اتر آتے ہیں اور سامراجی حکومت کے خلاف جدو جہد کرتے ہیں۔ یہ ناول 1935 میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا اور ہندی زبان میں 'کرم بھومی' کے نام سے سرسوتی پریس بنارس سے 1934 میں شائع ہوا۔

سنہ اشاعت سے ہی ظاہر ہے کہ یہ ناول اس وقت لکھا گیا جب آزادی کے لیے لوگوں میں ایک شعور بیدار کیا جا رہا تھا۔ اسی لیے پریم چند نے شعوری طور پر ایسے کردار تخلیق کیے ہیں جو ذاتی آسائش اور مفاد کو ترک کر کے وطن کے لیے خود کو وقف کر دے۔ چونکہ آزادیِ وطن کے لیے ضروری تھا کہ اعلیٰ، اوسط اور نچلے طبقے بھی ایک ساتھ آ کر انگریزوں کے سامنے سینہ سپر ہوں۔ لہٰذا پریم چند نے ہر طبقے کے نمائندوں کو اس میں جگہ دی۔ جن میں سمر کانت، امر کانت، ڈاکٹر شانتی کمار، سلیم، منی، حافظ حلیم اور پٹھانی اہم کردار ہیں جو اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ پریم چند کو یہ احساس بھی شدت سے تھا کہ ملک کی آزادی کے لیے لازمی ہے کہ ہندو اور مسلم ایک ساتھ مل کر محبت اور یگانگت کے ساتھ رہیں۔ لہٰذا وہ مذہبی تفریق کو اخوت میں بدلنے کے لیے امر کانت کو سلیم کے گھر ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھلاتے ہیں۔ سمر کانت جس کی زندگی کا مقصد صرف دولت اکٹھا کرنا ہے۔ اس عمل میں وہ سود خوری اور دیگر غیر اخلاقی ذرائع کو بھی روا رکھتا ہے لیکن اس کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ پٹھانی جیسی لاچار، بیوہ اور ضعیف عورت کی کفالت بھی کرتا ہے۔

اگرچہ اس ناول کا موضوع لوگوں کا ظلم کے خلاف میدان عمل میں آ جانا ہے۔ تاہم تعلیم کی ضرورت، طبقاتی کشمکش اور تہذیبی تصادم کو بھی دکھایا گیا ہے۔ لالہ سمر کانت کی اکلوتی بیٹی 'نینا' ایک سلیقہ شعار اور ہندوستانی تہذیب کی پروردہ لڑکی ہے۔ اس کی شادی منی رام سے ہوتی ہے۔ منی رام کے والد دھنی رام ایک متمول اور کاروباری آدمی ہیں۔ منی رام بھی اپنے والد کی طرح غریبوں کی حق تلفی کرتا ہے، انگریزوں کا خیر خواہ ہے۔ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر اور اپنے باپ کے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے دولت و ثروت اکٹھا کرتا ہے۔ نینا جیسی گھریلو قسم کی لڑکی سے شادی کر کے خوش نہیں ہوتا ہے۔ تجارتی فائدے کے پیش نظر وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی بھی انگریز لیڈیوں کی طرح ہو جو اس کے تجارتی معاملات کو طے کرنے میں اس کی معاون ہو۔ وہ ایسی بیوی چاہتا ہے جو انگریزوں کو اپنے حسن کا گرویدہ بنا لے تاکہ بڑی بڑی فیکٹریوں کے قیام اور تجارتی کانٹریکٹ بآسانی مل سکیں۔ سکھدا اپنی نند، نینا سے ملنے اس کے سسرال جاتی ہے۔ اتفاق سے منی رام گھر پر ہی ہوتا ہے۔ سکھدا سے اس کی جو گفتگو ہوتی ہے وہ تہذیبی تصادم کا مظہر ہے۔ اسی گفتگو کے کچھ حصے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں:

''منی رام نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا'' آپ کاروبار کے ان مسئلوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ یہاں بڑے بڑے ملوں کے ایجنٹ آتے ہیں۔ اگر میری بیوی ان کی خاطر و مدارات کر سکتی تو ان کا معاملات پر کتنا خوشگوار اثر پڑتا۔ یہ کام تو کچھ عورت ہی کر سکتی ہے۔

سکھدا نے اسی منافرت سے ٹوکا۔ میں تو کبھی نہ کروں، چاہے سارا کاروبار خاک میں مل جائے۔

شادی کا منشا جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ عورت

ہر کام میں مرد کی معاون ہو۔ انگریزوں کے یہاں عورتوں کے ذریعے بڑے بڑے تجارتی مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔"[1]

یہاں منی رام ایک مطلب پرست اور مغربیت سے مغلوب طبقے کی آواز بن کر سامنے آتا ہے جبکہ خود منی رام کا گھریلو ماحول مشرقی ہے۔ اسی لیے شوہر کے علاوہ گھر کے سبھی افراد نینا کو نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ اس کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ شوہر خود ہی کہتا ہے کہ۔

"ہمیں کیا معلوم تھا کہ ایسے تعلیم یافتہ خاندان میں لڑکیاں ایسی پھوہڑ ہوں گی۔ اماں، میری بہنیں اور محلے کی عورتیں تو نئی بہو کو دیوی سمجھ رہی ہیں۔ وہ برت رکھتی ہے۔ پوجا کرتی ہے۔ سندور کا ٹیکہ لگاتی ہے۔ ساس کا پاؤں چھوتی ہے۔ نندوں کے سر میں تیل ڈالتی ہے۔ لیکن مجھے تو ایسی عورت چاہیے جو میرے کاروبار کو بڑھانے میں میری مدد کر سکے۔"[2]

اقتباس میں نئی بہو کے جو اوصاف بتائے گئے ہیں وہ خالص ہندوستانی تہذیب کے اوصاف ہیں جنھیں شوہر غیر مفید تصور کرتا ہے۔ وہ ایسی مغربی طرز کی بیوی چاہ رہا ہے جو جسم کی نمائش کر کے اس کے کاروبار کو بڑھاوا دے سکے۔ اس طرح کے خیالات پیدا ہونے کی ایک اہم وجہ مادیت پرستی سے مغلوبیت ہے۔ دوسری وجہ اپنی تہذیب پر انگریزی تہذیب کی برتری تسلیم کر لینا ہے۔ موجودہ نئی نسل کا المیہ یہی ہے کہ ہم اپنے تہذیبی ورثے کی روحانیت سے واقف نہیں ہونا چاہتے ہیں۔ اسے ایک قصۂ پارینہ سمجھ کر نہ صرف بھول جانا چاہتے ہیں بلکہ اسے اپنی ترقی میں سدراہ بھی تصور کرتے ہیں۔

'میدان عمل' میں مرکزیت اس فکر کو دی گئی ہے کہ ہمیں اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے قربانیاں دینی ہوں گی۔ جدو جہد اور عملی طور پر حصہ لیے بغیر ظلم سے چھٹکارا نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ اس مرکزی خیال کی تعمیر و تشکیل میں شہرت، نام و نمود، انسانی ہمدردی، تذلیل و تحقیر اور جنسی کشش جیسی انسانی فطرت کو بھی دکھایا گیا ہے۔ پریم چند کا تخلیقی کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مطمحِ نظر تک پہنچنے میں جن واقعات کو ذریعہ بنایا ہے اس میں انھوں نے تہذیبی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ وہ سماج میں پنپ رہے غیر سماجی رویے کو ماضی کے صالح اقدار سے موازنہ کرتے ہیں اور قاری کی توجہ اس کے منفی اثرات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ رالف فاکس نے اپنی کتاب 'ناول اور عوام' میں کسی بھی تخلیق کار کے لیے اچھی تجویز پیش کی ہے:

"ایک تخلیق کار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ماضی سے وابستہ رہے۔ ماضی سے الگ ہٹ کر اپنے کرداروں کو دوامیت نہیں دے سکتا ہے۔ شاعری ہو یا فکشن وہ حال کی تبدیلی کو پیش کرتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ اپنے ماضی کی وراثت سے بالکلیہ دستبردار نہیں ہو سکتا۔ حال میں تبدیلی کی خواہش ہی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ ماضی کی ثقافتی روایات سے واقف ہے۔"[3]

منی رام کا بیوی کے تئیں جو رویہ ہے اسے ہم منفی تبھی کہہ سکتے ہیں جب ماضی کی تہذیبی روایات ہمارے سامنے ہوں۔ اگر تہذیبی روایات سے ہم واقف نہ ہوں تو منی رام کوئی لائق تذکرہ کردار ہوگا ہی نہیں اور نہ نینا سے قاری کو کوئی دلچسپی پیدا ہو سکے گی۔ قاری خود کو نینا کے قریب اس لیے محسوس کرتا ہے کہ اس کی شخصیت ہندوستانی تہذیب میں رچی ہوئی ہے۔ شوہر کے مظالم کے باوجود وہ اس کا برا نہیں چاہتی ہے۔ سکھدا محنت کش طبقات کو ترغیب دیتی ہے کہ وہ لالہ دھنی رام (نینا کے سسر) کے خلاف اجتماعی احتجاج کریں۔ نینا کو یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ اس احتجاج میں کچھ برادریوں کے مکھیا نے حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ نینا کی بھابھی سکھدا دھنی رام کے خلاف بغاوت اس لیے نہیں کرتی ہے کہ ان کے بیٹے منی رام نے اس کے ساتھ بدکلامی کی ہے بلکہ وہ عوامی احتجاج اس لیے چاہتی ہے تا کہ عوام کو انصاف مل سکے۔ میونسپلٹی کی جس زمین پر ڈاکٹر شانتی کمار اور سکھدا بے گھر عوام کے لیے گھر بنانا چاہتے ہیں اس زمین کو دھنی رام نے اپنے سیاسی اثر و رسوخ کا غلط استعمال کر کے ہتھیا لیا ہے۔ نینا بھی ایک انقلابی ذہن کی مالک ہے، مزدور اور محنت کش طبقے کی ہمدرد ہے۔ وہ یہ جانتی ہے کہ اس کے سسرال والے مزدوروں کی حق تلفی کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود بھی وہ سسرال کے وقار کو بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ اس کے گھر والے سماج میں ذلیل کیے جائیں لیکن منی رام اپنی بیوی کی قدر نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ تو سکھدا سے یہاں تک کہتا ہے کہ:

"مجھے پوجا پاٹ والی عورت کی ضرورت نہ تھی۔ اونچے درجے کے آدمیوں سے ہمارا ربط ضبط ہے۔ ایسے پرانے خیال کی عورتوں کو تو ہم ان کے روبرو لا ہی نہیں سکتے۔ جب میں اپنے دوستوں کی عورتوں سے ملتا ہوں تو وہ بھی چاہتے ہیں کہ میری عورت سے ملیں۔ مجھے مجبور ہو کر دوسری شادی کرنی پڑے گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اس شادی کو شادی ہی نہیں سمجھتا۔"[4]

جب میں اپنے دوستوں کی عورتوں سے ملتا ہوں تو وہ بھی چاہتے ہیں کہ میری عورت سے ملیں ظاہر ہے یہ خود غرضانہ فکر ہندوستانی تہذیب کے منافی ہے۔ نینا اس تقاضے کو پورا نہیں کر پاتی ہے کیونکہ اس کی تہذیب ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ اسی تہذیبی تصادم کا نتیجہ تھا کہ نینا کی ازدواجی زندگی کبھی خوشگوار نہیں ہو سکی۔

پریم چند کا سب سے کامیاب ناول 'گئودان' بنیادی طور پر زمیندار، ساہوکار اور سرمایہ داری کے استحصالی نظام کو پیش کرتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ ضمنی کردار مس مالتی کے ذریعے بین التہذیبی کشمکش پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ مس مالتی لندن سے جدید تعلیم حاصل کر چکی ہے اور پیشے سے ڈاکٹر ہے۔ اس پر مغربی تہذیب کی چھاپ صاف طور پر دکھائی دیتی ہے۔ وہ دھنیا، پنیا اور کامنی سے بالکل مختلف ہے۔ اپنی عصمت و آبرو کے تحفظ سے متعلق کسی خطرے سے بے نیاز ہو کر لوگوں کے ساتھ شراب پیتی اور شکار پر بھی جاتی ہے۔ پروفیسر مہتا، مسٹر کھنا، شیام بہاری، اگر پال سنگھ اور پنڈت اونکار جیسے اعلیٰ طبقے کے لوگ اس کے مصاحبین میں شامل ہیں۔

مرزا خورشید، پروفیسر مہتا اور رائے صاحب ایک بار مس مالتی سے شرط لگاتے ہیں کہ اگر پنڈت اونکار ناتھ کو شراب پلانے میں کامیاب ہو جاتی ہو تو تمھیں سو روپے بطور انعام دیے جائیں گے۔ مالتی اس شرط کو قبول کر لیتی ہے اور ایک منصوبہ بند طریقے سے پنڈت صاحب

'میدان عمل' میں مرکزیت اس فکر کو دی گئی ہے کہ ہمیں اپنے حالات کو بہتر بنانے کے لیے قربانیاں دینی ہوں گی۔ جدو جہد اور عملی طور پر حصہ لیے بغیر ظلم سے چھٹکارا نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ اس مرکزی خیال کی تعمیر وتشکیل میں شہرت، نام ونمود، انسانی ہمدردی، تذلیل وتحقیر اور جنسی کشش جیسی انسانی فطرت کو بھی دکھایا گیا ہے۔

پریم چندکا سب سے کامیاب ناول 'گئودان' بنیادی طور پر زمیندار، ساہوکاراور سرمایہ داری کے استحصالی نظام کو پیش کرتا ہے لیکن ساتھ ہی وہ ضمنی کردار مس مالتی کے ذریعے بین التہذیبی کشمکش پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

کے پاس پہنچتی ہے۔ پنڈت اونکارناتھ 'بجلی' اخبار کے مدیر ہیں اور خود کو بڑا مصلح قوم ظاہر کرتے ہیں، سماج کے سامنے خود کو ایک معزز شہری کے طور پر پیش کرتے ہیں، مذہبی امور کے پاسدار ہیں، جو شراب پینا تو در کنار شراب پینے والے کو بھی اچھا آدمی نہیں سمجھتے ہیں۔ مس مالتی انھیں ورغلاتے ہوئے 'گرام سدھار سبھا' تنظیم کا صدر بنانے کی بات کرتی ہے، جھوٹی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اس تنظیم کے لیے آپ سے بہتر صدر کوئی ہو ہی نہیں سکتا، آپ کے اخبار 'بجلی' کی خریداری ہر گاؤں کے لیے لازمی کردی جائے گی جس کی وجہ سے خریداروں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ ذاتی مفاد کے لالچ میں پنڈت جی مس مالتی کو اپنا سچا خیر خواہ مان لیتے ہیں۔ اسے جب یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ پنڈت جی کو ورغلانے میں کامیاب ہوگئی ہے تب وہ اپنے اصل منشا کی طرف آتی ہے اور کہتی ہے کہ 'گرام سدھار سبھا' کے جو ممبران ہوں گے وہ مذہب، ذات پات اور کھان پان کی وجہ سے کسی کو حقیر نہیں سمجھیں گے۔ حقیر نہ سمجھنے کا ثبوت سب سے پہلے اس تنظیم کے صدارتی عہدے کے متمنی پنڈت اونکارناتھ کو ہی دینا تھا کیونکہ یہی شراب پینے والوں کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ لہٰذا مالتی نے جیسے ہی شراب کا پیالہ پنڈت جی کے طرف بڑھایا انھوں نے قبول کر لیا۔ پینے میں کسی قدر تردد تو ہوا لیکن پھر سوچا کہ "ایسی حسینہ کے ہاتھوں سے اگر زہر بھی ملے تو اسے قبول کرنا چاہیے"۔ پنڈت جی کے شراب پیتے ہی تمام ساتھی ہنسنے لگتے ہیں اس طرح کی تمام تفریحات میں پروفیسر مہتا مس مالتی کے ساتھ شامل رہتے ہیں۔ مالتی ان سے محبت بھی کرتی ہے اور شادی بھی کرنا چاہتی ہے لیکن مہتا صاحب تیار نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے تو پروفیسر مہتا آزاد خیال ہیں مگر شادی ایسی عورت سے کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستانی تہذیب میں رچی بسی ہو، جو شوہر سے مار کھاتی رہے پھر بھی اسی کے قدموں میں پڑی رہے، جو اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد سے تعلقات نہ بنائے۔ ڈاکٹر قمر رئیس بالکل صحیح لکھتے ہیں:

"مس مالتی ان سے والہانہ محبت کرتی ہے۔ وہ ان سے شادی کے لیے بھی آمادہ ہے لیکن مسٹر مہتا کے لیے وہ اس لیے قابل قبول نہیں ہوتی کہ یورپ کی تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثر سے وہ تیاگ اور تپسیا کی سرزمین ہندوستان میں گرہست عورت کا دھرم چھوڑ کر تتلیوں کا رنگ پکڑ رہی ہے۔ آزادی، خود پرستی اور خودنمائی کی دلدادہ ہے۔"[5]

مس مالتی سے پروفیسر مہتا ایک ساتھی یا دوست جیسا برتاؤ رکھتے ہیں۔ اس سے نفرت نہیں کرتے بلکہ اس کی تعلیمی لیاقت اور خوبصورتی کی وجہ سے پسند بھی کرتے ہیں، دونوں کے درمیان اچھے تعلقات ہیں۔ پروفیسر مہتا، مالتی کی محبت کی اس لیے قدر نہیں کر پاتے ہیں کہ اس کی شخصیت مغربی تہذیب میں رچی ہوئی ہے۔ اسی تہذیبی مغائرت اور تصادم کا نتیجہ تھا کہ مس مالتی کی چاہت رشتۂ ازدواج میں تبدیل نہیں ہو سکی۔ مس مالتی کی طرز زندگی

پریم چند نے اگرچہ تہذیبی تصادم کو مرکز بنا کر کوئی ناول نہیں لکھا ہے لیکن غبن، چوگان ہستی اور پردۂ مجاز جیسے ناولوں میں بھی ضمنی واقعات کے ذریعے تہذیبی تصادم کی جھلکیاں در آئی ہیں۔

ہندوستانی خواتین سے بالکل مختلف ہے۔ شرم و حیا اور پردہ اس کے نزدیک لغویات کے قبیل میں سے ہیں۔ وہ ایسی عورتوں سے چڑھتی ہے جو اپنے شوہروں سے مار کھاتی رہتی ہیں پھر بھی انھیں کے گن گائے جاتی ہیں۔ آزاد خیالی اس حد تک ہے کہ وہ شادی کو ایک بندھن سمجھتی ہیں، ظاہر ہے یہ خیالات مغربی تہذیب کے مظاہر ہیں۔ جس سے متنفر ہو کر اونکارناتھ کہتے ہیں:

"اور وہ جو ہے مالتی۔ جو بہتر گھاٹوں کا پانی پی کر بھی مس بنی پھرتی ہے، شادی نہیں کرے گی کیونکہ اس سے زندگی بندش میں پڑ جاتی ہے اور بندش میں زندگی کا کامل ارتقا نہیں ہو پاتا ہے۔ ارتقا تو اسی میں ہے کہ دنیا کو لوٹے جاؤ اور آزادانہ عیش کیے جاؤ۔ ساری بندشیں توڑ دو، دھرم اور سماج کو گولی مارو، فرائض کو پاس نہ پھٹکنے دو، بس تمھاری زندگی مکمل ہوگئی۔ اس سے زیادہ آسان اور کیا ہوگا؟ ماں باپ سے نہیں پٹتی تو انھیں دھتا بتاؤ، بیاہ مت کرو یہ بندھن ہے۔ اور بچے ہوں گے تو یہ موہ کا جال ہے۔"[6]

مذکورہ سطروں میں مس مالتی کے اوصاف طنزیہ لہجے میں بتائے گئے ہیں۔ یہاں دو تہذیبیں باہم متصادم نظر آتی ہیں۔ ایک ہندوستانی تہذیب ہے جس کی نمائندگی پنڈت اونکارناتھ کر رہے ہیں، دوسری مغربی تہذیب ہے جس کا عکس مس مالتی میں صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔ تہذیبوں کی ترقی اور اسے ایک نئے موڑ دینے میں حکومتیں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ پریم چند جس عہد میں ناول لکھ رہے تھے وہ مکمل طور پر انگریزوں کی حکمرانی کا دور تھا۔ اس سے پہلے بھی یہاں دوسری بیرونی اقوام حکومت کر چکی تھیں لیکن انھوں نے شعوری طور پر تہذیبی اشتراکیت پر زور دیا تھا۔ انگریز پہلی حکمراں قوم تھی جس نے ہندوستانیوں کو حقارت کا احساس دلایا اور ان کی تہذیب کو کمتر سمجھا۔ جس کے نتیجے میں تہذیبی تصادم کی فضا پیدا ہوئی جسے بنیاد بنا کر ڈپٹی نذیر احمد نے 1888 میں ایک ناول 'ابن الوقت' لکھا۔ پریم چند کو تہذیبی تصادم سے زیادہ عوام کی سسکتی ہوئی آوازیں بے چین کرتی ہیں اسی لیے انھوں نے اپنے ناولوں میں سماج کے مظلوم طبقے کی زندگی پیش کی ہے۔ پریم چند نے اگرچہ تہذیبی تصادم کو مرکز بنا کر کوئی ناول نہیں لکھا ہے لیکن غبن، چوگان ہستی اور پردۂ مجاز جیسے ناولوں میں بھی ضمنی واقعات کے ذریعے تہذیبی تصادم کی جھلکیاں در آئی ہیں۔

حواشی

1. میدان عمل، پریم چند، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1943، ص، 305
2. ایضاً، ص، 294
3. Novel and People، رالف فاکس، ناول اور عوام، مترجم، ڈاکٹر سید محمود کاظمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، 2014، ص، 171
4. میدان عمل، پریم چند، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1943، ص، 294
5. پریم چند کا تنقیدی مطالعہ۔ بحیثیت ناول نگار، ڈاکٹر قمر رئیس، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2004، ص، 298
6. گئودان، پریم چند، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 19

Dr. Mohd Naseem
Ward No: 21,H/O Md Amin
Opposite- Rahbar Children School
Rahamatganj,Masaurhi
Patna- 804452 (Bihar)
Mob.No.9618474155S
Email.naseemmanuu@gmail.com

عبدالغنی شیخ

بادشاہ کیسر کی زندہ جاوید داستان

دیو مالائی بادشاہ کیسر کی داستان فی زمانہ دنیا کی لگ بھگ دو ارب آبادی میں مشہور اور مقبول ہے۔ ان ممالک میں چین، روس، سنٹرل ایشیا، منگولیا، بھوٹان اور جزوی طور پر ہندوستان اور پاکستان شامل ہیں۔ چین میں (Epic) رزمیہ کی ابتدا تبت سے ہوئی اور اس کا ترجمہ ملک کی تمام علاقائی زبانوں میں ہوا ہے۔ اب تک چین نے کیسر پر کئی بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کی ہیں۔

ہندوستان میں کیسر کی داستان لداخ، سکم، ہماچل پردیش اور پاکستان میں بلتستان، گلگت اور ہنزہ میں بڑی مقبول ہے۔

ایک اسکالر پروفیسر Klaw Sagajter نے لکھا ہے:

''اس داستان کا جنم مشرقی تبت میں ہوا جہاں سے یہ شمال میں پہنچی اور منگولیا آئی۔ تبت سے یہ لداخ بلتستان اور یہاں کچھ حد تک مقامی داستانوں میں ضم ہوئی اور کیسر مقامی ہیرو بنا۔''

روس میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کی روداد بڑی تقطیع میں 244 صفحات پر محیط ہے۔ اس میں روس سمیت دس ملکوں کے 56 شرکا اسکالروں کے مقالوں کی تلخیص یا پورا متن دیا ہوا ہے۔ ایک لداخی اسکالر نوانگ چھرنگ شقسپو اور ایک لداخی طالبہ دیسکیت آنگموں کو بھی کانفرنس میں مدعو کیا لیکن کورونا وائرس کی وجہ سے وہ شرکت نہیں کر سکے تاہم انھوں نے اپنے مقالے آن لائن پیش کیے۔ دیسکیت آنگموں نے کیسر اور اس کی داستان پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ کانفرنس کی روداد اور مقالے پڑھ کر مجھے ادراک ہوا کہ کیسر کی شخصیت اور داستان روس میں مقبول ہے۔

اگر ہندوستان اور پاکستان میں ملک گیر سطح پر یہ داستان مقبول ہوتی ہے تو یہ دنیا کی نصف آبادی کی مقبول داستان ہوگی۔ دنیا کی کسی بھی مشہور داستان کو تاریخ میں آج تک اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔

2009 میں یونیسکو نے کیسر کی رزمیہ داستان کو بنی نوع انسان کے Intangible (اچھوتے) ثقافتی ورثے کی فہرست میں شامل کیا جس سے رزمیہ کو عالمی سطح پر ایک مستند ورثے کی حیثیت اور قبولیت ملی ہے۔

میں نے پڑھا ہے کہ دنیا کی بہت ساری یونیورسٹیوں اور اسکالروں میں کیسر کے رزمیہ (Epic) کے تئیں بڑی دلچسپی ہے۔

دنیا کی بہت ساری زبانوں میں داستان کا جزوی یا کسی حد تک کلی طور پر ترجمہ ہوا ہے۔ ان میں انگریزی، جرمنی، فرانسیسی، روسی، چینی، کوریائی، تبتی، بھوٹانی، منگولیائی اور اردو شامل ہیں۔ صرف انگریزی میں پچاس سے زیادہ کتابیں کیسر پر لکھی گئی ہیں۔ داستان کیسر نثری اور شعری ادب پر مشتمل ہے اور اس کے گیت دنیا کا طویل ترین شعری سرمایہ ہیں۔ یہ دس لاکھ اشعار پر مبنی ہے، جو دنیا کی مشہور و معروف داستانوں جیسے الیڈ، اوڈیسی، مہابھارت، رامائن اور پایایان کے مجموعی اشعار سے زیادہ ہیں۔

ایک تبتی اسکالر **رینچین** کا بیان ہے کہ ''شاہ کیسر کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے جس کے موضوعات سماجی ترقی، تاریخ، مذہبی عقائد، لوک ادب، لسانیات اور جنگوں کے تذکروں پر مشتمل ہیں جو مختلف قبائل کی مشترکہ میراث ہیں۔''

اصل داستان بڑی ضخیم ہے چینی ریسرچ کے مطابق اس کی ایک سو بیس جلدیں ہیں۔

لداخ اور بلتستان میں مقامی ادیبوں نے داستان کیسر پر انگریزی میں تین اور اردو میں دو کتابیں تصنیف اور تالیف کی ہیں جو بارہ سے اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہیں۔

داستان کیسر کی ہر کتاب میں چند واقعات کا تذکرہ ہے جیسے کیسر کے دیش لینگ کا ارتقا، جہاں آگے جا کر کیسر حکومت کرتا ہے۔ سورماؤں کا جنم، کیسر کی دنیا میں آمد، کیسر کا دوبارہ جنم، کیسر کی شادی، دُوت یول، میں کیسر کی مہم، کیسر کی بیوی کا اغوا، اغوا کرنے والے بادشاہ کا قتل اور بیوی کو آزاد کرنا شامل ہیں۔ تبت اور لداخ کے سماج اور دیومالائی حکایتوں میں 'دوت' کا اکثر ذکر کیا ہے۔ دوت سے ایک ایسی مخلوق کی تصویر ذہن میں آتی ہے جس میں بدی کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور ایذا رسانی اس کا شیوہ ہے۔ انسانوں کی نظر میں دوت ایک ملعون اور منحوس مخلوق ہے۔ اردو میں اس کے لیے مردود اور ہندی میں شاید راکھشس متبادل لفظ ہو سکتا ہے۔ یول سے مراد دیش ہے۔

چین کی نئی حکومت کے قیام کے بعد سرکاری سطح پر کیسر پر بڑے پیمانے پر تحقیقی کام ہوا ہے اور ریسرچ، طباعت، صدابندی وغیرہ پر خطیر رقم خرچ کی جا رہی ہے۔

لداخ اور بلتستان میں معاشرے اور ثقافت پر کیسر کی گہری چھاپ ہے۔ کیسر کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ پہاڑوں، چٹانوں وغیرہ کی اشکال کو کیسر کے تخت، تیر کمان، چولھا، نقش پا اور ہاتھ، کیسر کے گھوڑے کے سُم وغیرہ سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ کیسر کی بیوی لہامو برانگمو کو مستثنیٰ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس سے وابستہ کئی نشانیاں ہیں۔

لداخ اور تبت میں کیسر کی زندگی اور کارناموں کو

ڈراما یا جاتا ہے۔ ہوٹل اور ثقافتی اداروں کے نام کیسر پر رکھے گئے ہیں۔

لداخ بلتستان اور تبت میں کیسر کے شوقیہ یا پیشہ ور داستان گو گزرے ہیں۔ ماضی قریب تک لوگوں کو داستان سننے کا بڑا شوق تھا بلتستان نے عبدالرحمٰن مستری، کیسر کے معروف ترین داستان گو پیدا کیا ہے۔ بلتی اسکالر سید محمد عباس کاظمی نے انہی کی زبانی کیسر کی داستان سن کر انگریزی میں کیسر پر اپنی کتاب Kesar, the Son of God لکھی اور اردو میں اس کا ترجمہ شائع کیا۔ روندو کے محمد حسین اور سکردو کے غلام حسین منجھے ہوئے داستان گو ہیں۔ اسی طرح لداخ کے چیکتن گاؤں کے کیسر کے داستان گو عبدالرحیم اور رحمت اللہ کا آج بھی چرچا ہے جو اب دنیا میں نہیں ہیں۔ کوکشو کا محمد علی جو ضم چھرنگ کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ اپنے زمانے کا پسندیدہ داستان گو تھا۔ آج بھی کوکشو کا موسی ینگجور، اچی ناتھنگ کا ٹشی رگیس، چیکتن کا ابول اور ہانس کا جعفر تونچے بطور داستان گو چند اہم نام ہیں۔ 75 سال یا اس سے زیادہ عمر والے یہ داستان گو چراغ سحری ہیں۔ سماج میں داستان گو کی قدر و منزلت تھی۔

Rara میں:

کاچو اسفندیار خان لکھتا ہے:

"قدیم زمانے میں داستان گو کو دانش مند سمجھا جاتا تھا۔ داستان میں عقل و دانش کے مقولے بھی دیے گئے ہیں۔ کیسر پر خان کی انگریزی کتاب بڑی مقبول ہے۔

ماضی میں لوگوں کو داستان سننے کا بڑا شوق تھا۔ مسلم چیکتن کے باشندے لیہہ کے بودھ گاؤں تمسگام خشک شلغم اور سبزیاں فروخت کرنے لاتے تھے۔ گاؤں والے ان سے کیسر کی داستان سنانے کی فرمائش کرتے تھے اور اس کے لیے معاوضہ دیتے تھے۔ بعد میں کئی گھرانوں میں داستان گو کو مدعو کیا جاتا تھا۔ سردیوں میں الاؤ جلایا جاتا اور سامعین اس کے گرد بیٹھتے تھے۔

ایک یورپی محقق سون ہیڈین اپنی کتاب Trans Himalaya میں لکھتا ہے۔ اس کے 1908 کی مہم تبت میں ایک ملازم ٹنڈوپ گیالچن داستان گو تھا۔ وہ ہر شام منزل پر پہنچنے پر مہم کے دوسرے لداخی ملازموں کو داستان کیسر سناتا تھا۔ اس نے لیہہ سے یہ داستان شروع کی، جو تبت کی راجدھانی لہاسہ تک جاری رہی۔ واپسی سفر میں لہاسہ سے لیہہ تک جاری رکھی، جہاں داستان ختم ہوئی۔ اس زمانے میں لیہہ سے لہاسہ پیدل یا گھوڑے پر تین ماہ کا لمبا سفر تھا۔

حال میں لداخ کے ایک معروف گلوکار مورو پ نمگیل نے داستان کیسر کی بتیس قسطیں یوٹیوب پر پیش کیں جو لداخ میں پسند کی گئیں۔

تبت میں داستان کیسر کے متعدد شوقیہ اور پیشہ ور گویے ہیں۔ داستان کا بڑا حصہ منظوم ہے۔ ماضی قریب میں نامور ترین گویا دراق پا (1906-1985) کے نام سے گزرا ہے۔ اس کو داستان کی 25 قسطیں زبانی یاد تھیں جن کو ضبطِ تحریر میں لانے سے پندرہ ہزار صفحات بنے۔

تبت کے دورِ حاضر کا مشہور گویا سنگروپ مانا جاتا ہے۔ اس کے گائے ہوئے گیتوں کی صدابندی میں ڈھائی ہزار گھنٹے لگے۔

تبت میں عورت گلوکارہ کم ہیں۔ البتہ رزمیہ میں خواتین کیریکٹر جیسے ماں، بیٹی، بیوی، چچی وغیرہ کا کردار عورتیں ادا کرتی ہیں۔

> لداخ اور تبت میں کیسر کی زندگی اور کارناموں کو ڈراما یا جاتا ہے۔ ہوٹل اور ثقافتی اداروں کے نام کیسر پر رکھے گئے ہیں۔

سید محمد عباس کاظمی نے اپنی کتاب میں بلتستان میں داستان کیسر سننے کی روایت' کے عنوان سے اپنے مضمون میں لکھا ہے "دیوتا کے فرزند کیسر کی داستان نے بلتستان کی سماجی زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ تفریح طبع کا ایک ذریعہ اور..... پیغام رسانی کا ایک وسیلہ تھا۔ سماج میں ایک داستان گو کا بڑا احترام تھا۔ تبھی گاؤں کا سرکردہ فرد یا ایک امیر آدمی موسم سرما کی شروعات میں کیسر کے داستان گو اور ایک گلوکار کو اپنے گھر پر داستان سنانے کے لیے مدعو کرتا تھا۔ گاؤں کے لوگ داستان سننے کے لیے اس کے مکان پر جمع ہوتے اور الاؤ کی دھیمی آنچ اور روشنی میں اس کے گرد بیٹھ جاتے تھے۔ داستان گو کی حرکات اور سکنات اور داستان کی دلچسپی سامعین کو اپنے ساتھ بہالے جاتی اور داستان گو کو داد دیتے اور اس کی عمر درازی کی دعائیں کرتے تھے۔

داستان کے بارہ ابواب ختم ہونے میں عام طور پر دو سے تین مہینے لگتے تھے۔ اس طرح سردیوں کے دو تین مہینے بڑے لطف اور شادمانی سے گزر جاتے تھے۔"

کیسر کون تھا؟ اس کو دنیا میں کیوں بھیجا گیا؟ یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے۔ کیسر رسنگ لہایول' دیوتاؤں کے بالائی دیش سے تعلق رکھتا تھا جس طرح خدا نے ہر قوم کو ہدایت دینے کے لیے دنیا میں پیغمبر بھیجے تھے۔ کیسر کے داستان نگاروں کا دعویٰ ہے کہ کیسر کو دنیا میں ظالموں، دوت یا راکھشس (مردود)، ریٹھو (جنوں)، ڈے، (شیطان خصلت مخلوق)، Monsters (عفریتوں) وغیرہ سے نجات دلانے اور دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے عالم دیوتا سے بھیجا گیا تھا۔

دنیا میں کیسر کا دوبارہ جنم ہوا۔ کہاں اور کب ہوا؟ اس پر بھی سوالیہ نشان ہے۔ اس نوجنم کیسر نے دنیا میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔

کیسر کی جائے پیدائش کے بارے میں مختلف اور متضاد روایات ہیں۔ ایک مشہور روایت یہ ہے کہ کیسر کا جنم اور داستان کی تخلیق سنٹرل ایشیا میں ہوئی۔ اس روایت کے مطابق کیسر کو آٹھویں یا نویں صدی میں سنٹرل ایشیا کی ایک قلمرو کا حکمران قرار دیا گیا ہے اور اس قلمرو کے ایک قدیم سکے پر کیسر کا نام دیا گیا ہے۔

تاہم تبتیوں کے لیے کیسر تبت کی ایک تاریخی ہستی ہے۔ جو مغربی تبت کی ایک سلطنت کھم میں پیدا ہوا تھا اور لینگ میں حکومت کی جو تیرہویں اور چودہویں صدیوں میں ترقی اور طاقت میں بام عروج پر پہنچی۔ لینگ مشرقی تبت میں یانگزے اور یالونگ دریاؤں کے درمیان واقع ہے۔

اس کے برعکس چین اور تبت کے ماہرین کے لیے قابل قبول جائے پیدائش AXU یا NGAXU ہے، جو چین کے صوبہ سچوان کے علاقے ڈیگے میں واقع ہے جہاں کیسر کے بارے میں قلمی نسخہ، لکڑی کے بلاک اور دستاویزات ہیں جو مستند سمجھی جاتی ہیں۔ منگولیا کے باشندوں کا دعویٰ ہے کہ کیسر منگولیا کا ایک بادشاہ تھا۔ بلتستان کے بلتیوں کا کہنا ہے کہ کیسر بلتستان کی وادی روندو میں پیدا ہوا۔ ایک اور روایت کے مطابق بلتستان کے ہرداس گاؤں کے نزدیک پھون کاٹو نام کی ایک جگہ کیسر کی جنم بھومی ہے۔

لداخ کا شاہی خاندان اور لداخ کے علاقہ گیا کا قدیم حکمران گیاپاچو اپنے آپ کو کیسر کی اولاد بتاتے ہیں۔ Kesar Ling Norbu Dadul کے مصنف موٹوپ نمگیل کا دعویٰ ہے کہ کیسر نے لداخ میں لمبا سفر کیا تھا۔

ایک دفعہ جب کیسر کی حقیقت منظر عام پر آئی اور اس کا دبدبہ اور شہرہ دور دور تک پھیلا۔ ہر خطے اور ہر ملک میں اس کو اپنا منسوب کیا جانے لگا اور اس کو اپنے ملک اور خطے کا سب سے بڑا ہیرو قرار دیا جانے لگا۔ داستان نگاروں نے Super man فوق البشر کے طور پر پیش کیا

اور محیر العقول اور مافوق الفطرت (Super natural) کارنامے اس کی ذات سے وابستہ اور منسوب کیے۔

کیسر کے دوبارہ جنم کے سنہ وسال اور داستان کی تشکیل کے بارے میں بھی مختلف روایات ہیں۔ چند مصنفوں کے مطابق کیسر کا رزمیہ ساتویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کہ رزمیہ کے گیتوں کی نسبت اور حوالے سے یہ آٹھویں صدی میں معرضِ وجود میں آیا۔

سید محمد عباس کاظمی کے مطابق کیسر کی داستان حضرت عیسیٰ کے ایک ہزار سالہ دور میں لکھی گئی۔ بعد میں اس میں متعدد واقعات اور کہانیوں کا اضافہ ہوا۔

تبت میں رزمیہ نے بارہویں صدی میں مقبولیت حاصل کی۔

وجہ تسمیہ: بچپن میں وقتی طور پر کیسر کے کئی نام رکھے گئے۔ تاہم اس کا اصلی نام کیسر تھا۔ انگریزی کتابوں میں ک کی جگہ گ استعمال کیا ہے اور گیسر لکھا ہے۔ تبتی لغات میں کیسر کا لفظی معنی Reincarnated یعنی دوبارہ جنم یا تجسیم نو بتایا گیا ہے۔ ایک بولی میں کیسر کا مطلب مشیر بتایا ہے۔ کاظمی کے مطابق یہ روما کے کیسر یا فارسی تاریخ کے کسرا اور عربی کے قیصر کا دوسرا روپ لگتا ہے۔ قیصر کا معنی بھی بادشاہ یا شہنشاہ ہے اور ترکی زبان میں بھی یہ مستعمل ہے۔

ترکی حکمراں کو جس نے اس کی بیوی کا اغوا کیا تھا، کراری شکست دینے کے بعد کیسر نے حملوں اور لڑائیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع کیا۔ تبت کی اٹھارہ چھوٹی قلمروؤں اور بیرونِ تبت کی چار سلطنتوں کو مغلوب کیا۔ ان کے مال و دولت کو لوٹا اور لینگ کے لوگوں میں تقسیم کیا۔ ایک نئی تصنیف Epic of King Gesar- New World Enceclopedia میں کیسر کی چند فوجی مہمات اور فتوحات کا تذکرہ ہے جن میں وہ ہمیشہ غالب آتا ہے۔ بلتی اور لداخی داستانوں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔

کیسر کے مذہب اور عقیدے کے بارے میں متضاد نظریے ہیں۔ تبت کے بہت سارے لوگوں کے لیے وہ ایک عظیم سورما اور مقبول ہیرو ہے۔ داستان میں کیسر کو عموماً بودھ کیریکٹر کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔

لیکن کیسر کے عمل سے عیاں ہے کہ وہ بودھ فرقے کا پیروکار نہیں تھا۔ کیسر نے اپنے دیوتا کو خوش کرنے کے لیے جانوروں کی قربانیاں دی ہیں۔ اس کا ذکر 'کیسر ـــــ دیوتا کا بیٹا' کے گیارہویں باب میں ہے جب وہ میلونگ گیالمو کی تلاش میں نکلتا ہے۔

اسی طرح The Story of Gylam Kesar میں لکھا ہے:

''ہور دیش میں کیسر کے سامنے جب اس کے تئیں سورما احترام سے سرنگوں ہوتے ہیں تو کیسر ان سے کہتا ہے 'میرے سامنے نہیں جھکو۔ میں نے لوہار کا کھانا کھایا ہے۔ لوہار کے کپڑے پہنے ہیں۔ لوہار کا کام کیا ہے اور لوہار کی عورت سے شادی کی ہے۔''

کیسر نے چھوت چھات کی وجہ سے تینوں سورماؤں کو لوہار کے گھر کے بجائے ہمسایے کے مکان میں دعوت دی اور لوہار کے مکان میں پہنے ہوئے اپنے لباس کو تطہیر کرنے کے لیے لوبان کی دھونی دی۔

"
داستان کیسر کے تخلیق کاروں نے محیر العقول کردار تخلیق کیے ہیں اور حیرت انگیز واقعات پیش کیے ہیں۔ یہی داستان کی غیر معمولی مقبولیت اور پسندیدگی کا راز ہے۔ سائنس فکشن اور فلموں میں آج کل جو تصویریں ملتی ہیں۔
"

بودھ مت میں قربانی اور ذات پات کی اجازت نہیں ہے۔

سید عباس کاظمی نے ایک اہم نکتہ یہ ابھارا ہے کہ بلتستان کی داستان کیسر کلی طور پر ایک غیر مذہبی رزمیہ ہے۔ اس میں اسلام کی کوئی روایت نہیں ہے اور نہ بودھ مت سے تعلق کی کوئی بات ہے۔ البتہ اس میں شائزم کی بہت ساری روایات ہیں۔ اس کے برعکس تبت، چین، منگولیا اور ہندوستان میں اسے ایک بودھ رزمیہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

داستان پڑھتے ہوئے عمومی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہماری اس دنیا کے گوشت و پوست کا انسان ہے۔ اس کی سوچ، عمل اور طور طریقے ہماری دھرتی کے جیتے جاگتے انسانوں سے میل کھاتے ہیں۔ کیسر میں خوبیاں اور خامیاں دونوں ہیں۔ اپنے سے طاقتور سے گھبرا بھی جاتا ہے۔

اسی ضمن میں رویل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے ممبر ایس کے چٹرجی رقم طراز ہے:

''تمام رزمیہ داستانوں اور رومانی حکایتوں میں مافوق الفطرت (Supernatural) باتوں کی کثرت ہوتی ہے۔ تاہم کیسر کے رزمیہ میں انسانی دلچسپی کی بہت ساری باتیں ہیں اور یہ (داستان) حتمی طور پر انسانی زندگی کی عکاسی کرتی ہے جہاں کیسر پروان چڑھا ہے۔ اس لیے داستان میں انسانی مصائب، کامرانیوں اور انسانی جذبات کے تذکروں کی فراوانی ہے۔

کیسر کی فطرت میں تضاد ہے۔ جہاں وہ خوبیوں اور محاسن کا مجسمہ نظر آتا ہے، وہاں اس کی شخصیت میں بڑی کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔

کیسر کی داستان سے قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ہر جائز اور ناجائز طریق کار اختیار کرتا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ جنگ اور عشق میں سب کچھ جائز ہے۔ اپنے محسنوں کو ہلاک کرتا ہے۔

اپنی محبوبہ لہاموواگلمو کو حاصل کرنے کے لیے ایک کتیا کو بھوکا اور پیاسا رکھتا ہے اور اتنی سخت ایذائیں پہنچاتا ہے کہ کتیا کو قوت گویائی ملتی ہے اور کیسر کے خلاف شکایت کرتی ہے۔ (ماخوذ: کیسر دیوتا کا بیٹا)

ضرورت پڑنے پر وہ جھوٹ بولتا ہے اور دھوکا دیتا ہے۔ ان تمام عوامل کے باوجود ہر ایک کو کیسر پسند ہے۔ ہر ایک کی مدد کرنے کے لیے وہ ہر وقت آمادہ ہوتا ہے۔ تن تنہا بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لینے کے لیے نکلتا ہے۔ مشکل سے مشکل مہم کی ذمے داری اپنے سر لیتا ہے۔ مظلوموں اور کمزوروں کی مدد کرتا ہے۔ اس نے کئی دفعہ قصورواروں اور اپنے دشمنوں کو دریادلی سے معاف کیا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں بڑی کشش تھی۔

داستان کیسر کے تخلیق کاروں نے محیر العقول کردار تخلیق کیے ہیں اور حیرت انگیز واقعات پیش کیے ہیں۔ یہی داستان کی غیر معمولی مقبولیت اور پسندیدگی کا راز ہے۔ سائنس فکشن اور فلموں میں آج کل جو تصویریں ملتی ہیں۔ کیسر کے داستان گویوں اور قلم کاروں نے آج سے ایک ہزار سال پہلے ایسے دلچسپ اور انوکھے نقشے پیش کیے ہیں۔ داستان کے کردار جدید سائنس اور جاسوسی فکشن کے کردار لگتے ہیں۔

داستان میں ایک ملک سے دوسرے ملک کے سفر کی روداد پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ انسانی کائنات کے ایک انجان سیارے سے دوسرے سیارے کا سفر کر رہا ہے۔ ان

گنت صحراؤں، پہاڑوں اور سمندروں کے اوپر سے اڑ کر منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے۔ کیسر اپنے اڑن گھوڑے یا کبھی کسی پرندے پر سوار ہو کر اپنی مہم پر روانہ ہوتا تھا۔

ہور (ترکی) دیش میں جاتے ہوئے کیسر کو ایک تنگ کھائی میں سے گزرنا پڑا۔ کھائی کی گزرگاہ پر دو بڑے پتھر تیزی سے مسلسل اوپر نیچے ہوتے رہتے تھے۔ اگر تیزی سے نکل نہ پائے تو ان دو پتھروں کے درمیان مسافر کچل جاتا تھا۔ کیسر اپنے تیز رو گھوڑے پر کھائی کے دو پتھروں کے درمیان سے بجلی کی سی تیزی سے نکل گیا۔

پھر ایک چٹان پر پہنچا، جس پر ایک دروازہ ہر لمحہ رات دن آنکھ کی جھپک میں کھلتا اور بند ہوتا تھا۔ کیسر کو ترکی پہنچنے کے لیے اس دروازے سے گزرنا ناگزیر تھا۔ کیسر اپنی محافظ دیوی کی مدد سے یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔

دراصل کیسر کی کامیابی کے پیچھے اس کی رشتے دار محافظ دیوی نانے کرمن لہامو اور دیوی دیوتاؤں کا ہاتھ تھا۔ خاص کر کرمن لہامو مصیبت اور مشکل کی ہر گھڑی میں مختلف روپ میں کیسر کی رہبری اور رہنمائی کے لیے جائے واقعہ پر بروقت پہنچ جاتی تھی۔ عالم دیوتا سے انسانوں کی دنیا میں آتے وقت کیسر نے اپنے والد سے کرمن لہامو کو اس کے ساتھ جانے کے لیے درخواست کی تھی جو اس کے والد نے قبول کی۔ اسی طرح دوسرے دیوی دیوتا بھی کیسر کی مدد کرتے تھے۔ وہ ان کی مدد سے سورج کو تیز چمکا سکتا تھا اور موسلا دھار بارش برسا سکتا تھا۔

کیسر کے سورما کے پاس معجزاتی اور جادوئی تیر تھا جو تمام رکاوٹوں کو پھاندتا اور پھلانگتا ہوا اپنے ہدف پر پیوست ہوتا تھا۔ اڑنے والے گھوڑوں پر سوار ہو کر سورما دشمن سے نبرد آزما ہوتے تھے۔ کیسر کا اڑن گھوڑا اس کو لے کر انتہائی سرعت سے دنیا کے کسی کونے میں پرواز کرتا تھا۔

داستانِ کیسر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کردار اپنے آپ کو مختلف رنگ و روپ جیسے پرندہ، درندہ، چرندہ وغیرہ میں بدل سکتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر کیسر اپنے گھوڑے کو ایک پن میں تبدیل کر کے اپنے کلر پر چھپا کر رکھتا تھا اور جب چاہتا، اس پن کو گھوڑے کے روپ میں لاتا تھا۔

داستانِ کیسر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کردار اپنے آپ کو مختلف رنگ و روپ جیسے پرندہ، درندہ، چرندہ وغیرہ میں بدل سکتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر کیسر اپنے گھوڑے کو ایک پن میں تبدیل کرکے اپنے کلر پر چھپا کر رکھتا تھا اور جب چاہتا، اس پن کو گھوڑے کے روپ میں لاتا تھا۔

داستان پنچ تنتر اور دوسری حکایتوں کے مشابہ ہے۔ جہاں پرندے، چرندے اور درندے جیسے کوا، یاک، گھوڑا، بچھیرا اور بھیڑیا انسانوں سے باتیں کرتے ہیں۔ سارس پیام رسانی کا فریضہ نبھاتا ہے۔

داستان کا ایک مزاحیہ کردار آگو ٹو تھونگ قارئین کے لیے ہنسی مذاق اور تفریح فراہم کرتا ہے۔ یہ بذات خود بڑا بزدل ہوتا ہے لیکن بزعم خود اپنے آپ کو سورما سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو کیسر کی جگہ لینگ کا حکمراں تصور کرتا ہے، خواب دیکھتا ہے اور کیسر کی غیر موجودگی میں اس کی حسین و جمیل بیوی سے محبت کی پینگیں بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں اردو ناولوں اور حکایتوں کے مقبول کردار تیس مار خان، خوجی، لال بجھکڑ اور شیخ چلی کا علم و گمان ہوتا ہے۔ ان کی طرح ٹوتھونگ ڈینگیں مارتا ہے اور مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ہے۔

داستان میں بہت سے نسوانی کیریکٹر بھی ہیں۔ ایک نسوانی سورما اماں پلموں مردم خور ہے۔ ایک آٹھ سالہ بچہ درپون ایک لڑائی میں دشمن کے ہزاروں جنگجوؤں پر بھاری ہوتا ہے۔

مختلف ملکوں اور علاقائی داستان کے کرداروں کے ناموں میں قدرے فرق ہے یا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یا امتدادِ زمانہ سے بگڑے لگتے ہیں۔ البتہ کیسر واحد نام ہے، جو ہر ملک اور خطے کی داستان میں مروج ہے۔

داستان کیسر کا مطالعہ اور موازنہ کرتے ہوئے مجھے ادراک ہوا کہ داستان کی جزئیات حقیقت نگاری کا ایک نادر نمونہ ہے۔ دیومالائی شخصیت کیسر کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ہر کردار کو عمومی طور برا بھلا دونوں دکھایا گیا ہے۔ کوئی کلی طور پر فرشتہ یا شیطان نہیں ہے بلکہ دونوں کا امتزاج ہے۔ ایک کردار اچھا ہے تو آگے وہ برا بنتا ہے یا برا کردار اچھا بن سکتا ہے۔

کیسر اور اس کی بیوی لہامو برانگمو میں گہری محبت ہوتی ہے۔ جب کیسر اپنی محافظ دیوی کے حکم پر ایک 'ریتھو' (جن) کو مارنے کی مہم کے لیے نکلا، تو لہامو برانگمو نے کہا ''میں کچھ فاصلہ آپ کے ساتھ چلوں گی اور آپ کو الوداع کروں گی۔'' چنانچہ دونوں کچھ فاصلہ ساتھ چلے۔ جب وہ جدا ہوئے تو کیسر بولا ''میں تمھیں اکیلا گھر جانے نہیں دوں گا'' اور لہامو کے ساتھ محل گیا۔ دوبارہ سفر پر نکلا۔ لہامو برانگمو دوبارہ چھوڑنے نکلی اور کچھ دوری پر جا کر الوداع کہا۔ کیسر دوبارہ لہامو کو چھوڑنے محل آیا۔ لہامو پھر الوداع کہنے ساتھ نکلی۔ دونوں کی محبت کا یہ عالم تھا کہ میاں بیوی سات روز یہی ناٹک کرتے رہے۔ ایسے میں محافظ دیوی آدھمکی اور کیسر کو ٹوکا۔

لداخ کی داستان میں کیسر کی بیوی کا نام ڈوگوما دیا ہے۔

کیسر کی بیوی لہامو برانگمو یا ڈوگوما کے فوت ہونے کے بعد اس نے دوبارہ جنم لیا۔ جب وہ ایک نوخیز خوبصورت دوشیزہ تھی تو کیسر نے اپنا حوالہ دے کر اس کا ہاتھ مانگا۔ ان کی شادی ہوئی۔ بلتی داستان کے مطابق کیسر اور اس کی بیوی بلتستان کے ہمسایہ قراقرم کے گلیشروں کے مرکز میں ہیں۔

مہاتما بدھ نے ڈھائی ہزار سال سے زیادہ عرصہ پہلے کہا تھا ''لوگ بچوں کی طرح ہیں اور کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں''

رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جنرل سکریٹری بی ایس گوہا رقم طراز ہیں ''ہندوستان میں رامائن کی جو افادیت ہے۔ سنٹرل ایشیا میں داستان کیسر کی یہی اہمیت ہے۔''

سوسائٹی کے ایک اور رکن ایس کے چٹرجی نے کیسر کے رزمیہ کے بارے میں لکھا ہے ''ہندوستان میں رام کی کہانی (رامائن) اور ارجن اور پانڈوؤں (مہابھارت) کی طرح لداخ یا مغربی تبت کی ایک مقبول حکایت کا Legend بادشاہ کیسر ہے۔ پروفیسر Sylvain Levi نے کیسر کی حکایت کو سنٹرل ایشیا کا Iliad کہا ہے۔ ہمیں یہ اضافہ کرنا چاہیے کہ یہ سنٹرل ایشیا کی Odyssey بھی ہے۔ یہ بلاشبہ تبت کے لوگوں کے لیے رامائن اور مہابھارت دونوں ہے۔ منگولوں اور منچوؤں نے کیسر کو اپنا قومی ہیرو بنایا ہے۔''

داستان سے متعلق سید محمد عباس کاظمی کے تاثرات کا میں یہاں حوالہ دیتا ہوں، جو انھوں نے اپنی کتاب -Kesar The son of God کے پیش لفظ میں دیے ہیں:

''کیسر کا رزمیہ سمندر کی تہہ میں چھپا ہوا ایک خزانہ ہے۔ جب تک اس کو سمندر کی تہہ سے نکال کر منظرِ عام پر نہ لایا جائے اور اس کے مداحوں کے سامنے نہ رکھا جائے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔''

■

Abdul Ghani Shaikh
'Yasmeen' Fort Road
Leeh- 194101 (Laddakh)

نولکھا راج محل

صدر عالم گوہر

مدھوبنی ضلع ویسے تو کئی چیزوں کے لیے جانا جاتا ہے جیسے پان، مکھانا، مچھلی، ندی، تالاب، مدھوبنی پینٹنگ اور راج نگر کا راج محل نولکھا۔ راج محل نولکھا سیاحوں کا پسندیدہ مقام و پکنک منانے والوں کا پکنک اسپاٹ یا جنت ہے۔ یہاں قرب و جوار کے لوگ سیر و تفریح کے لیے بھی آتے ہیں۔ راج نگر کا راج پیلس یا راج محل نولکھا کو میں کئی طرح سے جانتا ہوں بلکہ یوں سمجھ لیجیے کہ میرا بچپن سے اس سے تعلق ہے۔ بہت سی یادیں اس سے جڑی ہیں۔ چونکہ میرا ننیہال راج نگر کے پاس ایک گاؤں من ٹولا پچڑی میں تھا۔ اس لیے میں اپنے گاؤں پر سولیا ضلع مدھوبنی (بہار) سے من ٹولا راج نگر جاتا آتا رہتا تھا، اپنی ماں کے ساتھ۔

بچپن میں جب راج محل نولکھا کے کیمپس سے گزرتا تھا تو محل کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیل تھی۔ قلعہ نما بنایا ہوا تھا بلکہ قلعہ ہی تھا۔ اب جب کہ مدتوں بعد وہاں جانا ہوا تو دیکھا فصیل ٹوٹ چکی ہے، لوگوں نے راج محل کے اندر سے راستہ بنا لیا ہے۔

جس راج محل میں لوگ پیدل بغیر اجازت داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک خوف لوگوں کے دلوں میں رہتا تھا۔ وہاں اب لوگ پیدل، سائیکل، موٹر سائیکل اور فور وہیلر سے بے روک ٹوک، بے خوف و خطر آتے جاتے ہیں۔ یہ راج محل جسے راج پیلس بھی کہا جاتا ہے لیکن عرف عام میں نولکھا کے نام سے لوگ جانتے ہیں۔ اب حکومت کی ملکیت ہے۔ اس کے کچھ حصے میں بورڈر سیکورٹی فورس کے افسران اور سپاہی رہتے ہیں اور آگے کا جو حصہ ہے جس میں عمارتیں کچھ صحیح سلامت ہیں۔ اس میں ایک کالج قائم کر دیا گیا ہے۔ جس کا نام وشویشور سنگھ جنتا مہاودیالیہ ہے۔ ابھی کچھ برسوں پہلے اس راج محل نو لکھا میں ایک شاندار سہ روزہ پروگرام کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس کے لیے نولکھا کے کچھ حصے جو ابھی خالی ہیں، ان کو خوب سجانے اور صاف صفائی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا پروگرام بہت بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا۔ اس پروگرام کا نام تھا، 'مدھوبنی لٹریچر فیسٹیول'۔ اس سہ روزہ پروگرام کے دو سیشن میں مجھے حصہ لینے کا موقع ملا۔ ایک پروگرام میں بطور شاعر اور ایک ڈسکشن کے سیشن میں۔ جس کی وجہ سے راج محل نولکھا کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ اور نولکھا محل میں جانے کا موقع ملا۔ اس بار اس محل میں واقع کالج 'وشویشور سنگھ جنتا مہاودیالیہ' میں منعقد شب افسانہ پروگرام میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے۔ اس موقعے پر نولکھا راج محل کا وہ حصہ جو مقفل رہتا ہے اور کالج کے لیے وقف ہے اس حصے کو دیکھنے کا موقع ملا۔

راج نگر جس کے لیے مشہور ہے وہ ہے یہاں کا دربھنگہ مہاراج کا بنوایا ہوا راج محل یا راج پیلیس۔ جسے عرف عام میں لوگ نولکھا کہتے ہیں۔ اور نولکھا کے نام سے یہ جانا جاتا ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ اس راج محل کو بنانے میں نولاکھ روپے لگے ہوں گے۔ اس لیے اس راج محل کا نام نولکھا ہے۔ مگر بعد کی تحقیق سے پتہ چلا کہ نولکھا کیمپس جس میں مندر، تالاب اور عمارتیں ہیں، وہ سب دربھنگہ مہاراج کے ایک انگریز قرضدار نے بنایا تھا۔ اس کا نام ایم ایس کورنی تھا۔ کورنی ایک اچھا اور معروف آرکیٹیکٹ تھا۔ جب وہ دربھنگہ مہاراج کا قرض ادا نہیں کر سکا تو قرض کے عوض اس نے دربھنگہ کے راجہ مہاراج لکشمیشور سنگھ کے لیے راج نگر میں ایک ایسے راج محل کی تعمیر کا وعدہ کیا جس کا مضبوطی میں کوئی ثانی نہیں ہوگا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک ایسا محل راجہ کے لیے بنا دے گا جو کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ کورنی نے پہلی دفعہ ہندوستان میں سیمنٹ کو متعارف کرایا۔ کورنی نے دربھنگہ مہاراج سے کہا کہ وہ محل کی تعمیر میں ایک ایسے سامان کا استعمال کرے گا، ایک ایسی چیز کا استعمال کرے گا، جس سے اس کا بنایا ہوا محل کبھی برباد نہیں ہوگا۔ کبھی ٹوٹے گا نہیں۔ مثال کے طور پر اس نے سیمنٹ کا استعمال کر کے ایک ہاتھی بنایا اور اپنے دعوے کا ثبوت دیا کہ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا ہے۔ مہاراج کو اس کا بنایا ہوا یہ ہاتھی بہت پسند آیا اور اس کی مضبوطی کو دیکھ کر مہاراج نے کہا کہ اسے توڑا نہ جائے، برباد نہ کیا جائے، بلکہ اس کو ہی کھمبا بنا کر اس پر عمارت تعمیر کی جائے، جو آج بھی راج نگر میں موجود ہے اور راج پیلیس کو دیکھنے والے سب سے پہلے یہیں آتے ہیں۔ ان ہاتھیوں کو دیکھتے ہیں، ان ہاتھیوں کے ساتھ اپنی تصویریں کھنچواتے ہیں۔

بعد کی تحقیق سے یہ عقدہ بھی کھلا کہ راج محل کو بنانے میں نہیں، صرف راج محل کے اندر جو مندر بنوایا گیا ہے، اس کو بنانے میں دربھنگہ راج کے مہاراج رامیشور سنگھ نے (جو دربھنگہ مہاراج لکشمیشور سنگھ کے چھوٹے بھائی تھے) نو لاکھ چاندی کے سکے خرچ کیے تھے۔

یہ مندر سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے، جو بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس کی خوبصورتی آج بھی لوگوں کو متاثر کرتی ہے اور راج محل میں جانے والا کالی مندر ضرور جاتا ہے۔ اس مندر کے سامنے ایک بہت بڑا گھنٹہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ گھنٹہ پہلے پیتل کا تھا لیکن اس کو چور چرا کر لے گئے اور ابھی جو ہے وہ دوسرا اسی سائز کا گھنٹہ ہے جسے بنوا کر لگا دیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چور جب اس بڑے سے گھنٹے کو اٹھا کر نہیں لے جا سکے تو وہیں سامنے کے تالاب میں پھینک کر چلے گئے۔ حقیقت جو بھی ہو مگر آج بھی اس کالی مندر کے سامنے ایک بہت بڑا گھنٹہ رکھا ہوا ہے۔ جس کو چھونا اور گھنٹہ بجانا منع ہے۔ مگر چونکہ گھنٹے کے پاس کوئی پہریدار نہیں رہتا ہے۔ اس لیے بچے اس کو چھوتے اور کھیلتے ہیں۔ یہ کالی مندر چاندنی رات میں تو اور بھی خوبصورت نظر آتی ہے۔ میں جب بھی اس مندر کو دیکھنے گیا یہاں لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔

اس راج محل کی حصار بندی کے بعد 1934 عیسوی میں بہار اور نیپال میں ایک ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ اس سے پہلے کبھی ایسا زلزلہ لوگوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں بہار کے 1934 عیسوی کے

زلزلے کا ذکر موجود ہے۔ ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ پورا راج محل ہی نہیں سارا بسا بسایا ہوا شہر تہس نہس ہو گیا۔ اور ایم۔ ایس۔ کورنی کا بنایا ہوا راج محل اور اس کا دعوی بھی اسی کی نذر ہو گیا۔ اس زلزلے میں راج محل اس بری طرح برباد ہوا کہ کہنا مشکل ہے۔ اس کے بعد پھر اس راج محل کی مرمت نہیں ہوئی۔ راج محل کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا گیا مگر کورنی کا بنایا ہوا ہاتھی آج بھی موجود ہے اور عوام کی تفریح کا سامان بنا ہوا ہے۔ راج نگر کا نولکھا محل ایک اور تاریخی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ راج نگر متھلا میں ہے جہاں کی زبان میتھلی ہے اور اسی میتھلی زبان میں پہلی بار ایک میتھلی فلم بنانے کا منصوبہ راج نگر کے مرزا پور کے مہنت مدن موہن داس نے بنایا تھا اور ان کے اس منصوبے میں شریک تھے ان کے جگری دوست کیدار ناتھ چودھری۔ جو بعد میں ایک ادیب کے طور پر مشہور ہوئے اور کئی ناول لکھے، جن میں ایک سوانحی ناول بھی ہے، جس میں اس میتھلی فلم کے بننے کے دوران کیا کیا مسائل پیش آئے ان کا ذکر ہے، اس فلم کا نام تھا 'ممتا گاب گیت'۔ اس فلم کی ہیروئن مسلمان گجراتی اداکارہ عذرا تھی۔ چونکہ پہلی دفعہ میتھلی زبان کی کوئی فلم بن رہی تھی جس کے لیے سارے اداکار اور فلم سے متعلق عملہ ممبئی سے پٹنہ ہوتے ہوئے راج نگر آئے تھے۔ اور اسی راج نگر کے راج پیلس میں اس فلم کی شوٹنگ دو مہینے 13 دن تک ہوئی تھی۔ راج نگر کے راج پیلس میں سارا سیٹ لگایا گیا تھا اور ساری شوٹنگ یہیں ہوئی تھی۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ عذرا گجراتی تھی اس لیے عذرا کو میتھلی زبان میں اپنا ڈائلاگ بولنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ اس فلم کے گیت اس وقت تو مشہور ہوئے ہی تھے، اب بھی اس کے گیت لوگوں کی زبان پر ہیں جیسے:

بھر نگری میں شور بوا ماں تو ہر گورر ماما چان سن۔
(گلوکارہ سمن کلیان پور، گیت کار رویندر ناتھ ٹھاکر)

دوسرا گیت تھا۔

ارا بکری گھاس کھو چھوڑ گو ٹھلا باہر جو (گلوکارہ گیتا دت)

اس فلم میں میتھلی کے عظیم شاعر ودیاپتی کا بھی ایک گیت تھا۔

تو ہے جنو جاہ بدلیس، ہے مادھو رتو ہے جنو جاہ بدلیس
(گلوکارہ۔ سمن کلیان پور شاعر۔ ودیاپتی)

راج نگر پہلے دربھنگہ ضلع میں ہی پڑتا تھا، جب دربھنگہ کئی ضلعوں میں منقسم ہوا تو ان میں سے ایک ضلع مدھوبنی بھی وجود میں آیا۔ دربھنگہ کے راجا کی خواہش تھی کہ راج نگر کو متھلا کا دارالسلطنت بنایا جائے اور یہیں سے سارے متھلا پر حکومت کی جائے۔ اسی لیے بطور خاص راج نگر کو بسایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کی یہاں زمین کی کوئی کمی نہیں تھی۔ خالی زمین ہونے کی وجہ سے یہ سہولت رہتی ہے کہ شہر کو اپنی ضرورت اور اپنی مرضی کے حساب سے بسایا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا ہو نہ سکا اور راج نگر دارالسلطنت ہوتے ہوتے رہ گیا۔ دربھنگہ کے راجا یعنی دربھنگہ مہاراج کا تعلق مغلیہ سلطنت سے بھی رہا ہے۔ کیونکہ دربھنگہ کے راجا کو اکبر بادشاہ نے متھلا پر حکومت کرنے کا اختیار دیا تھا۔ اور متھلا کا رقبہ یا چوحدی اس طرح کتابوں میں درج ہے: مغرب میں گنڈک کی ندی، مشرق میں کوسی ندی، شمال میں کوہ ہمالیہ اور جنوب میں گنگا ندی۔ راجہ دربھنگہ کے یہاں مغلیہ سلطنت کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر کے پوتے شہزادہ میرزا محمد رئیس بخت زبیر الدین گورگان تشریف لائے تھے اور مہاراج چھمیشر سنگھ بہادر والی ریاست دربھنگہ کی فرمائش پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں ان کا سفرنامہ ہے اور دربھنگہ کے شاہی خاندان کا ذکر ہے۔ کتاب کا نام 'موج سلطانی' ہے۔

جب مجھے معلوم ہوا کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ کے پوتے دربھنگہ مہاراج کے مہمان ہوئے تھے اور انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی تو میرے دل میں یہ جستجو پیدا ہوئی کہ میں اس کتاب کو دیکھوں۔ اتفاق سے دربھنگہ مہاراج کے آخری راجہ مہاراج کامیشور سنگھ کا یوم پیدائش ہر سال منایا جاتا ہے، جس میں دربھنگہ، مدھوبنی، پٹنہ، دلی اور ملک بھر سے گنے چنے لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے اور ایک شاندار جشن کا انعقاد ہوتا ہے۔ میری خوش قسمتی کہ مجھے بھی اس جشن کا دعوت نامہ آتا ہے اور میں اگر بہار میں ہوں تو ضرور اس جشن میں شریک ہوتا ہوں۔ اتفاق سے ایک بار جب میں اس جشن میں شرکت کی غرض سے گیا۔

کتب کی نمائش بھی دیکھی، وہاں مجھے وہ کتاب نظر آئی جسے مغل شہزادے زبیر الدین بہادر گورگان نے تصنیف کی ہے۔ کتاب دیکھتے ہی مجھے یک گونہ مسرت کا احساس ہوا اور میں نے فوراً وہ کتاب جس کی قیمت چار سو پچاس روپے تھی خرید لی۔ گو کہ یہ کتاب دیوناگری (ہندی) میں ترجمہ شدہ ہے۔ لیکن اس کے اردو سرورق کو برقرار رکھا گیا ہے اور ہندی میں بھی کتاب کا نام تحریر ہے۔ اس کتاب کا سرورق کچھ یوں ہے:

نام موج سلطانی جلی حروف میں تحریر ہے اور اس کے نیچے یہ تحریر درج ہے:

جس کو نہایت عرق ریزی اور کوشش سے جناب شاہزادہ والا تبار سموالمکان میرزا محمد رئیس بخت زبیر الدین گورگان دام اقبالہ نے تصنیف فرمایا۔

بحسب ارشاد

رئیس نامدار نو آئین بلند اقتدار ملک جناب مہاراج چھمیشر سنگھ بہادر والی ریاست دربھنگہ دام اقبالہ مطبع نامی منشی نول کشور میں بمصقل انطباع متجلی ہوا

اسی کتاب یعنی موج سلطانی میں شہزادہ گورگان نے یہ بھی تحریر کیا ہے، "راجہ مہیش ٹھاکر صاحب میتھل برہمن پسر رام چندر ٹھاکر نے شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں دہلی سرکار سے حکومت حاصل کی۔"

دربھنگہ کے راجاؤں میں علم دوست راجا بھی ہوئے ہیں۔ جن میں دو راجاؤں کا نام سر فہرست ہے۔ ایک تھے مہاراج سر رامیشور سنگھ اور دوسرے کا نام تھا مہاراج کامیشور سنگھ۔ یہ دونوں تعلیمی اداروں کے قیام اور ترقی میں تعاون کیا کرتے تھے۔ ایک طرف جہاں انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی کو امداد دی وہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بھی ایک خطیر رقم سے امداد کی۔ جس کا ذکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دستاویزات میں کیا گیا ہے۔ مہاراجہ سر رامیشور سنگھ جب علی گڑھ پہنچے تو انھوں نے علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو بیس ہزار روپیوں کا عطیہ دیا تھا۔ یہ 1912 کی بات ہے۔

اس کے علاوہ 1945 میں دربھنگہ مہاراج کامیشور سنگھ (1907-1962) نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے لیے 50,000 روپے کی مدد کی۔ اس کی جانکاری خلیق احمد نظامی کے ذریعے مرتب کتاب 'ہسٹری آف دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (1920-1945)' میں بھی ملتی ہے۔ واضح ہو کہ کامیشور سنگھ دربھنگہ مہاراج سر رامیشور سنگھ کے بیٹے تھے۔

نولکھا بنانے والے دربھنگہ مہاراج اور ان کے اہل خاندان کی علم دوستی کی ایک اور مثال ہمارے سامنے دربھنگہ کے للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے کیمپس میں بنی نادر و نایاب لائبریری ہے۔ جو مہاراجہ کامیشور سنگھ کی بیوہ کے زیر سایہ جاری ہے۔ اسے ایک فاؤنڈیشن کے ذریعے چلایا جاتا ہے۔ جس کا نام ہے 'مہارانی کلیانی فاؤنڈیشن'۔ اسی فاؤنڈیشن کے ذریعے ہر سال 28 نومبر کو مہاراجہ کامیشور سنگھ کے یوم پیدائش پر ایک یادگاری جلسہ منعقد کیا جاتا ہے۔ جس میں ملک بھر سے شاعر، ادیب اور نامور ہستیاں شامل ہوتی ہیں اور مہاراجہ کامیشور سنگھ کو یاد کیا جاتا ہے۔

■

Sadre Alam Gauher
Vill+Po-Pursaulia,
Distt.: Madhubani - 847226 (Bihar)
Cell-7715980144
Emai-gauhersadre@gmail.com

محمد راشد عزیز

نئے تعلیمی نظام میں لوک ادب کی اہمیت

تعلیم انسانی شعور و ادراک کی بیداری کا ذریعہ ہے۔ سائنسی اور مشینی دور سے پہلے ہندوستان اپنے تعلیمی اداروں، نالندہ اور ٹکشلا کے امتیازی اوصاف کے باعث پوری دنیا میں مشہور و معروف رہا ہے۔ یہاں کی علمی و عملی اقدار نے ہمیشہ اپنی تہذیبی روایات کی پاسداری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی تعلیمی نظام میں ہمیشہ گزرتے وقت کے حاصل سے سبق لے کر مستقبل کے خواب سجائے اور اپنی پالیسیوں میں ترمیم و اضافے کو ترجیح دی گئی ہے۔ یہ تبدیلیاں ایک تو حکومتی سطح پر عمل میں لائی جاتی رہی ہیں اور دوسرے تعلیمی اداروں اور ان کے شعبہ جات کے ذریعے یہ حسنِ عمل اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے ذریعے ہندوستانی تاریخ و تہذیب سے نئی نسلوں کو روشناس کرایا جاتا ہے، جس میں ان کے روشن مستقبل کی فکر اور ہندوستانی سماجوں کی اقدار و روایات سے واقفیت کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ اقدار و روایات ہندوستان کے قومی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت و اہمیت رکھتی ہیں اور مشترکہ تہذیب و ثقافت کی امین ہوتی ہیں۔ انھی شہری و دیہی عوام کے بل بوتے پر قومی یکجہتی منحصر ہوتی ہے، جو اپنی روزمرہ زندگی کے شب و روز میں قدر و روش کے نئے آمیزوں سے دن کے اجالے اور رات کی چاندنی و سیاہی کو نئی تازگی و توانائی عطا کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس طرح تمدن کی شان اور عوام کی آن دونوں کو اپنے اپنے اوپر ناز کرنے کی طمانیت و ہمت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ یہی ہمت و طاقت ہے جو ہندوستانی قومیت کے مختلف المذاہب اور کثیر اللسان ہونے کی ضمانت پیش کرتی چلی آ رہی ہے۔ اسی ضمانت کے ذخیرہ وراثت میں لوک ادب اور اعلیٰ ادب کے سرمایوں کی موجودگی پائی جاتی ہے۔ لوک ادب اور اعلیٰ ادب ہماری علمی و فطری اور فکری و تہذیبی عمل داریوں کا آئینہ ہونے کی وجہ سے ہمارے تعلیمی نظام میں حصے داری اور شمولیت کا شرف رکھتے ہیں۔ لہٰذا جس طرح اعلیٰ ادب کو تعلیمی نظام میں نصاب کا حصہ بنایا جاتا ہے اسی طرح لوک ادب کو بھی تعلیمی نصابات میں شامل کیا جانا چاہیے۔ کیونکہ لوک ادب سانجھی سنسکرتی یعنی مشترکہ تہذیب و ثقافت اور خصوصاً ہندوستانیت کی ترجمانی کرتا ہے۔

کسی بھی زبان اور قوم اور ملک کا لوک ادب اس کی لسانی اور سماجی و تہذیبی تاریخ کا بیش بہا خزینہ ہوتا ہے۔ یہ سماج کے ہر فرد کے سینے میں زبانی روایت میں موجود رہتا ہے اور ہر فرد کی زندگی کے شب و روز کے ہر لمحے اور ہر ایک کیفیت کو اپنے دامن میں سجالیتا ہے۔ سکھ دکھ، سرد و گرم اور بزمیہ و طربیہ موقعوں پر اکثر اجتماعی حالتوں میں اس کی عکاسی کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ مواقع ہی اعلیٰ ادب اور ادیبوں کو موضوع اور مواد فراہم کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ کیونکہ لوک فن کار نام و نمود اور صلے و ستائش کے حصول اور شہرت سے بے نیاز رہتے ہیں جب کہ اعلیٰ ادب کے تخلیق کار ان ہی عوام اور ان کی زندگی کے شب و روز کے لمحات سے اپنی بصیرت اور مشاہدات کی قوت کے بل پر انفرادی تجربات کو تخلیقی اور عملی سطح پر پیش کرتے ہیں اور شہرت و دولت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ ادنیٰ و اعلیٰ یعنی عام و خاص، دیہی و شہری، لوک ادب اور ادب عالیہ ایک سکے کے دو پہلو بن جاتے ہیں۔ دونوں کی حیثیت و اہمیت ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ثابت ہوتی ہے۔ اس نزاکت کو سمجھنے کے لیے پیڑ کی مثال بہت ممد و معاون ہے۔ اس طرح کہ پیڑ کی زمیں دوز جڑیں اور سوتے ادنیٰ، عام، دیہی اور لوک ادب کی حیثیت و اہمیت رکھتے ہیں اور پیڑ کا ظاہری حصہ یعنی تنا، شاخیں اور پتے اعلیٰ، خاص، شہری اور ادب عالیہ کی ترجمانی پیش کرتے ہیں۔ جس طرح پیڑ کی جڑیں اور سوتے پیڑ کے ظاہر ہونے سے پہلے ارتقائی منزلیں طے کرتے ہیں اُسی انداز میں لوک ادب اپنے اختراعی و تخلیقی

> **کسی بھی زبان اور قوم اور ملک کا لوک ادب اس کی لسانی اور سماجی و تہذیبی تاریخ کا بیش بہا خزینہ ہوتا ہے، یہ سماج کے ہر فرد کے سینے میں زبانی روایت میں موجود رہتا ہے اور ہر فرد کی زندگی کے شب و روز کے ہر لمحے اور ہر ایک کیفیت کو اپنے دامن میں سجا لیتا ہے، سکھ دکھ، سرد و گرم اور بزمیہ و طربیہ موقعوں پر اکثر اجتماعی حالتوں میں اس کی عکاسی کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔**

ہم ہندوستانیوں کی دیہی زندگی کا انداز لوک وراثت کا امین ہے اور اس کا انحصار قدیم اور روایتی نظام حیات پر ہوتا ہے۔ جب کہ شہری اور تمدنی طرزِ زندگی نئی اور جدید تازہ کاری پر منحصر ہوتا ہے۔

عمل سے بہتے پانی کی طرح گزرتا اور آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اسی لیے جس طرح جن پیڑ پودوں کی جڑیں اور سوتے جس قدر اور جس تناسب میں صحت مند ہوتے ہیں اُن کی ظاہری حالت اور ثمر آوری اتنی ہی تندرست اور توانا پائی جاتی ہے۔ یعنی وہ زبانیں اور قومیں جن کے لوک ادب کا ورثہ جتنی وافر مقدار میں مروج و محفوظ ہوتا ہے اُن کا ادبِ عالیہ اتنا ہی زیادہ اور اعلیٰ درجے کا ہوتا ہے۔

ہم ہندوستانیوں کی دیہی زندگی کا انداز لوک وراثت کا امین ہے اور اس کا انحصار قدیم اور روایتی نظامِ حیات پر ہوتا ہے۔ جب کہ شہری اور تمدنی طرزِ زندگی نئی اور جدید تازہ کاری پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کے عملی شب و روز بت نئے خاکے کشید کرتے ہیں اور سماجی و تہذیبی تاریخ میں لسان و ادب کی سطحوں کی پاسداری کا لحاظ رکھتے ہوئے نئے سنگِ میل نصب کرنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دیہی و شہری، قدامت و جدت اور لوک ادب و ادبِ عالیہ کے یہ سلسلے انسانی سماجوں اور ان کی زبانوں اور تہذیبوں کی تاریخوں میں اساسی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی ارتقائی تفصیل کی داستانوں میں انسان کے خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے کے آغاز سے لے کر ماہتاب کو مسخر کر لینے اور مریخ پر کمندیں ڈال دینے کے نشیب و فراز کی روداد ملاحظہ کی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ لوک وراثتوں کے امین اور شیدائی تحقیقی حکمت عملی میں لوک ادب کو فنونِ لطیفہ کے طور پر دیکھنے اور پرکھنے کے ساتھ علم البشریات کے اہم شعبے سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ اس کا مطالعہ و مشاہدہ فطرتِ انسانی کے اسرارِ نہانی سے پردہ ہٹانے کی خدمت کا کردار نبھاتا ہے۔ اس کی مدد سے انسان کی انفرادی و اجتماعی فطری و جبلی کیفیتوں تک رسائی حاصل کرنے کا امکان نکلتا ہے۔ آسان لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ انسان کو سمجھنے اور ظاہر و باطن کے کرداروں کو دیکھنے اور آزمانے کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے تعلیمی نظام میں جو بول بالا ادبِ عالیہ کے حصے میں آتا رہا ہے اسی کا تقاضا لوک ادب کا بھی استحقاق ہے۔

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور زندگی روح و بدن کے امتزاج کا نام ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں کی صحت مندی و توانائی نبض کے تحرک کی طاقت و تسلسل کی مناسبت و مطابقت رکھتی ہے۔ ادیب نباض ہوتا ہے اور اپنی ہنروری و فن کاری کی مہارت سے مجموعہ اعضا روح و بدن اور مجموعہ انسان سماج کی زندگی کو بہتر و صحت مند بنائے رکھنے کے لیے نباضی کرتا ہے۔ اس کی حکیمی و ڈاکٹری جہاں روح و بدن کی فلاح و بہبود کی ضامن بنتی ہے وہیں نئی روشنی اور نئے عرفان و آگہی کی ہمہ جہت روشنیوں کی کائناتوں سے روشناس کراتی ہے۔ حکیم اور ڈاکٹر ہی کی طرح ادیب اور فن کار ظاہر و باطن سے باخبر ہوتا ہے۔ لہٰذا ادیب و ادب کو تشخص کے اعتبار سے ناصح اور نصیحت، مصلح اور اصلاح یا صوفی و سنت کی حالتوں اور زمروں میں رکھ کر سمجھنا آسان ہے۔ یعنی ایک طرح کی خدمت انجام دینے والے دو طبقوں اور دو زمروں کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک جسموں پر راج کرتا ہے اور دوسرا دلوں پر۔ اس کلیے کا اطلاق کم و بیش تقریباً اٹھارہ ہزار مخلوقات اور کائنات کے ہر ایک شعبے پر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں صرف زبان و ادب مقصود ہیں۔ اس لیے ہمارے ادیب و ادب کے صوفی و سنت میں ایک کی حکمت عملی حصول بدل ہوتی ہے۔ جب کہ دوسرا دیوانہ وار خدمت کو اپنا نصب العین اور مقصدِ حیات تصور کرتا ہے۔ ٹھیک ان ہی دو زمروں اور طبقوں جیسا حال و احوال اور آثار ہندوستانی لوک ادب اور ادبِ عالیہ کا ہے۔ اس لیے ادبِ عالیہ کے اختراعی عوامل و محرکات کی نشاندہی میں لوک وراثت کی معاونت طمانیت افزا ثابت ہوگی اور ادبِ عالیہ کی معنوی تہوں کی پرتیں کھولنے اور زیریں لہروں میں غواصی کرنے میں مشعلِ راہ ہونے کا کردار ادا کرے گی۔ اس کے دم خم کے دوش پر سوار ہو کر زبان فہمی کی راہیں ہموار ہوں گی اور الفاظ کے لباس بدلنے اور لباسوں کے نئے بدن اختیار کرنے کا سراغ ملے گا۔ کیونکہ لوک وراثت میں عصبیت و فرقہ واریت کے عناصر نہیں پائے جاتے۔ اس سرمائے کی نظر اتنی تیز ہوتی ہے کہ کسی قسم کی عینک کا سہارا لینے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اسی کا نام ہندوستان اور ہندوستانیت کی پہچان ہے۔

المختصر ہندوستانی لوک وراثت جو مشترکہ گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کی ضامن ہے اس کا وافر سرمایہ اُردو ہندی کی مشترکہ روایت کی تاریخ کا عظیم سرمایہ ہے۔ یہ عمارت مخلوط قدروں کی بنیادوں پر تعمیر ہوئی ہے اور جسے قلعہ ہندوستانی کہے جانے پر ہم ہندوستانیوں کو وہ خوشی حاصل ہوتی ہے کہ سر فخر سے بلند اور سینہ چوڑا ہو جاتا ہے۔ اس بحث کی وضاحت کے لیے چند مثالیں ایک کہانی، دو گیت اور دو اشعار کے طور پر اس طرح ہیں۔

ادب زندگی کا آئینہ ہوتا ہے اور زندگی روح و بدن کے امتزاج کا نام ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں کی صحت مندی و توانائی نبض کے تحرک کی طاقت و تسلسل کی مناسبت و مطابقت رکھتی ہے۔

لوک کہانی

ایک چڑا تھا ایک تھی چڑیا۔ چڑا لایا چاول کا دانا چڑیا لائی دال کا دانا۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔

لوک گیت

گھوڑی برسانے سے آئی وا پہ چڑھو نہ اترو جائے
اللہ میاں توری بگیا میں میں نے مانگی مراد اللہ میاں توری بگیا میں
لوگ چڑھاویں مرگے مرگیاں میں چڑھاؤں اپنی جان

اشعار

بیادِ دل ربا خوشحال می باش   گہے افضل گہے گوپال می باش
(مولانا محمد افضل پانی پتی)

اُردو کے چند لفظ ہیں جب سے زبان پر   تہذیب مہرباں ہے مرے خاندان پر
(اشوک ساحل)

ان مثالوں میں برتے گئے الفاظ کی تلازماتی کیفیت بات میں بات اور گرہ میں گرہ کی خوبی رکھتی ہے اور اصل اور شفاف ہندوستانی سماج کی شبیہ پیش کرتی ہے۔ تخلیق اور پیش کش کے اعتبار سے آفاقی اقدار کی پاسدار ہے۔ مثلاً چڑے اور چڑیا کی لوک کہانی میں انسانی اور مخلوقی ارتقا کی مفصل واردات، ذاتی اور جسمانی ساخت ان کے اوصاف اور نتیجہ خیزی، الغرض جتنی گرہیں کھولی جائیں اتنی وضاحتیں اور توجیہیں سامنے آتی ہی رہیں گی۔ یہاں تک کہ کل کائنات روح و بدن کے مرکب میں سمٹ آئے گی۔ اسی طرح لوک گیت کی مثال میں گھوڑی کا برسانے سے آنا اور اس پر چڑھنا اور اترنا یعنی پھسلنا اور پھر چڑھنا۔ ہندوستانی تاریخ میں شری کرشن جی کا مثالی کردار اور اس تناظر میں برسانے کی تاریخی و تہذیبی اہمیت سب اُجاگر ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرا گیت جس میں اللہ میاں کی بگیا اور اُس میں مراد اور چڑھاوا، گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کے ترجمان ہیں اور دو مختلف تہذیبوں کے اختلاط و اشتراک کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ اسی طرح اشعار کی مثالوں میں مولانا محمد افضل پانی پتی کے بارہ ماسے جسے مثنوی نما ہونے کا شرف بھی حاصل ہے اس کا آخری شعر نہایت شفاف آئینہ ہے۔ آخری شعر کا تعلق دیومالائی روایت کے امین اشوک ساحل سے ہے۔ اس شعر میں تہذیب کی زمینی حقیقت اجاگر کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہوا کہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو کا ذخیرہ ادب بھی بیان و بلاغت کے زیورات سے آراستہ ہونے ہی کی صورت میں ہر دلعزیزی سے سرفراز ہوا ہے۔ اردو ادب کی مقناطیسی کشش اس کے لوک ادب کی مرہونِ منت ہے۔ کیونکہ الفاظ کی ترویج اور اخذ و قبول کی پہلی آماجگاہ عوام ہوتے ہیں۔ یہی اپنی روزمرہ زندگی کے دامن کو نت نئے لسانی گل بوٹوں سے سجاتے اور سنوارتے رہتے

> **اردو ادب اور لوک ادب کے دو اہم زمرے شعری اور نثری شاخوں کے طور پر مطالعے میں آتے ہیں اور ان دونوں کے مرکب سے ایک اور شاخ بھی ادبی تاریخ کا حصہ رہی ہے جسے ناٹک یا عوامی کھیل اور ڈرامے کے زمرے کی حیثیت و اہمیت حاصل ہے۔**

ہیں۔ ماہرین لسانیات کے مطابق دیہی اور ناخواندہ افراد تعلیم یافتہ افراد کے مقابلے میں آٹے میں نمک جتنے الفاظ کے ذخیرے کے سہارے تمام عمر اسی طرح گزار دیتے ہیں جس طرح پڑھے لکھے سماج کے افراد اپنی زندگی کے شب و روز اور ماہ و سال بسر کرتے ہیں۔ اور رنج و راحت کے سرد و گرم احساسات کے نشیب و فراز کی مختلف النوع منزلیں طے کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ لوک ادب اولاً بیان و بلاغت کی کسوٹی کے لیے الفاظ، محاورے، روزمرہ اور ضرب الامثال وغیرہ کی ترویج و اختراع کا کردار ادا کرتا ہے اور اسی مروجہ وجمع شدہ خزینے کی ترقی یافتہ اور توسیع شدہ شکل فنکاری کے انفرادی چاک پر ڈھل کر ادب کہلاتی ہے۔ یعنی

شعر میرے ہیں گو خواص پسند   پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

اردو ادب اور لوک ادب کے دو اہم زمرے شعری اور نثری شاخوں کے طور پر مطالعے میں آتے ہیں اور ان دونوں کے مرکب سے ایک اور شاخ بھی ادبی تاریخ کا حصہ رہی ہے جسے ناٹک یا عوامی کھیل اور ڈرامے کے زمرے کی حیثیت و اہمیت حاصل ہے۔ ادب کے ان تینوں اہم زمروں اور شاخوں میں پائے جانے والے آداب علم بیان، علم

> **نظم و نثر ہوں یا لوک قصے کہانی اور لوک گیت، طبعی اظہار کے ان پیرایوں میں خطِ امتیاز و انفراد موزونیت اور ناموزونیت ہے۔**

بلاغت اور علم عروض کے تابع ہوتے ہیں اور ان علوم کے ادراک و شعور کے متقاضی ہوتے ہیں۔ یعنی نظم اور نثر کے معیارات کا تعین اور فنکارانہ جوہروں کی تصدیق کیا جانا ان ہی علوم کے اصول و قواعد کے تحت ممکن ہو پاتا ہے۔ لیکن یہ کیسا المیہ ہے کہ ان علوم یا ان کے کسی اصول کا ذکر آتے ہی خدمت گارانِ ادب کہلانے والے زیادہ تر اساتذہ دامن بچانے کی راہیں نکال لیتے ہیں۔ ہماری دانشگاہوں کے زیادہ تر اعلیٰ تعلیمی نصابات میں شاذ و نادر ہی ان علوم کی موجودگی دیکھنے میں آتی ہے۔ حالانکہ ہمارے نصابات میں نظم و نثر خصوصاً اور ڈراما و ترجمہ عموماً شامل رہتے ہیں۔ البتہ ان ادبی زمروں کے جواہر پاروں کی صحت مندی کی ضامن کے آلے نما اصول و قواعد والے علوم سے چشم پوشی و بے حسی کے بادلوں کا منڈراتے رہنا زبان، سماج اور ادب کے حق میں کسی بھی طرح مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے۔

نظم و نثر ہوں یا لوک قصے کہانی اور لوک گیت، طبعی اظہار کے ان پیرایوں میں خطِ امتیاز و انفراد موزونیت اور ناموزونیت ہے۔ موزونیت اردو میں وزن اور ہندی میں راگ کے آداب اور اصولوں کی ترجمانی اور پیشکش ہوتی ہے۔ ہندی میں اسے چھند گیان کے تحت تلاش کیا جاتا ہے۔ جبکہ اردو میں اس کا مطالعہ علم عروض کی روشنی میں دریافت ہوتا ہے۔ علم عروض میں برتے جانے والے ارکان کو تشکیل دینے والے اجزا دو حرفی اور سہ حرفی ہوتے ہیں۔ لیکن ہندی میں اچھند گیان میں استعمال ہونے والے یہی سَم اور وِشم کہلانے والے اجزا لگھو گرو یعنی یک حرفی اور دو حرفی ہو جاتے ہیں۔ یہاں عروضی باریکیوں کی گتھیوں کو سلجھانے کے بجائے وزن کی حقیقت سے باخبری مقصود ہے۔ وزن دراصل صوتی پیمانے کو کہا جاتا ہے۔ یعنی جس میں سُر تال کی ہم آہنگی ظاہر ہو۔ مثلاً

کیسا اچھا تو ہے اللہ   تو نے ہم کو دی ہیں آنکھیں   دنیا بھر کو جن سے دیکھیں

اللہ اللہ کیا کرو   نام نبی کا لیا کرو   دکھ نہ کسی کو دیا کرو   وہ ہم سب کا مالک ہے   نام اسی کا لیا کرو

اس مختصر بحث کا مجموعی حاصل یہ ہوا کہ ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے اختراعی پہلو نکالنے کے لیے ادبیاتی قواعد کے علوم، علم بیان و بلاغت اور عروض سے واقفیت لازمی ہے۔ ان علوم کا انحصار لفظ و صوت پر ہوتا ہے۔ الفاظ اصوات کی تصویر ہوتے ہیں۔ ان تصویروں کی خاکہ کشی اور رنگ آمیزی کی خدمت عام عوام انجام دیتے ہیں۔ عام عوام کی اس خدمت کی ثمر آوری اور ذخیرہ دوزی لوک ادب ہوتا ہے۔ لہٰذا اردو کا باشعور طالب علم، ماہر استاد، منجھا ہوا نقاد اور لائق محقق بننے کے لیے اردو لوک ادب، بیان و بلاغت اور ادب کے آداب اور اردو کے مزاج سے باخبری ضروری ہے۔ اس مقصد کے ہدف کی خاطر اردو کے نصابات میں لوک ادب کی آمیزش اور شمولیت ناگزیر ہے اور یہی نئی تعلیمی پالیسی کا اشارہ و مشورہ ہے۔

■

Dr. Rashid Azeez
Dept of Urdu
Central University of Kashmir
Ganderbal- 191131 (J & K)
Mob.: 8803766036
rashidazeez128@gmail.com

سلام کی سادگی کو سلام

غضنفر

جس وقت اردو کہانی لکھی تو جا رہی تھی مگر پڑھی اور سنی نہیں جا رہی تھی کہ کہانی شروع کرتے ہی قاری کے ذہن کے تار جھنجھنانے لگتے، اس کے دماغ کی ہڈیاں چٹخنے لگتیں اور اس کا ہاضمہ خراب ہو جاتا، اس وقت بھی ایک آدھ جائے پناہ موجود تھی۔ جہاں کہانیاں سر سہلا دیا کرتی تھیں۔ یہ ان معدود چند ایسے افسانہ نگاروں کی کہانیاں تھیں جن پر وقت کی ادبی وثقافتی آندھی کا دباؤ تو تھا مگر وہ اس آندھی میں بہہ نہیں گئے، وہ جھکڑوں کی سیلیوں کے باوجود جڑ سے اکھڑے نہیں۔ آندھی کے اس زور وشور میں بھی وہ اپنی روش پر قائم رہے۔ اور قاری کی افسانوی پیاس بجھانے کا جتن کرتے رہے۔ جو افسانوی پیڑ جدیدیت کی آندھی میں نہیں اکھڑے ان میں ایک سلام بن رزاق بھی تھے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جن دنوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریسرچ کر رہا تھا، جدیدیت کے زیرِ سایہ جنے افسانوں کا بڑا زور تھا۔ ہم اکثر جدیدیوں کے افسانے مشترکہ طور پر پڑھتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے جن میں میرے ساتھ طارق چھتاری، خورشید احمد، شارق ادیب، پیغام آفاقی، نسیم صدیقی غیاث الرحمان وغیرہ بھی ہوا کرتے تھے۔ اپنی مختصر سی مخصوص محفل میں خاص طور پر قمر احسن کو سمجھنے کے لیے ہم ان کا کوئی افسانہ لے کر بیٹھ جاتے۔ افسانے کی پیشکش، اس کے تھیم، اس کے ڈکشن اس کی بنت پر خوب غور کرتے۔ ہم سبھی اپنا اپنا دماغ لگاتے۔ اس زمانے کے مشہور و مقبول فکشن پارکھی مہدی جعفر کے تجزیوں کے چراغ بھی سامنے رکھتے پھر بھی قمر احسن کے شیر آہو خانہ کے افسانے :اسپ کشت مات۔ 1 اسپ کشت مات۔ 2 کوڑھی کی مٹھی میں سور کی ہڈی، ہڈی کی مٹھی میں سور کا کوڑھی، نمود پر شکستہ شب، الطارق الطارق وغیرہ افسانوں کے خط و خال، اس کے رنگ روپ وغیرہ کو دیکھ نہیں پاتے تھے۔ زیادہ زور لگاتے تھے تو واقعی ہمارے دماغ کی ہڈیاں بھی چٹخنے لگتیں۔ ذہن ماؤف ہو جاتا، طبیعت مکدر ہو جاتی۔ ہمارا احساس ایک عجیب و غریب قسم کی کیفیت سے گزرنے لگتا۔ ایسے میں ہم یا تو اقبال مجید کے افسانوں کی طرف رخ کرتے یا سلام بن رزاق کی کہانیوں کی جانب بڑھ جاتے۔ زیادہ تر ہمارے قدم سلام بن رزاق کے افسانوں کی طرف بڑھتے کہ سلام بن رزاق اسی دور سے تعلق رکھتے تھے جس دور سے قمر احسن اور ان کے قبیل کے افسانہ نگاروں احمد ہمیش، بلراج مین را، سریندر پرکاش، حمید سہروردی وغیرہ کا تعلق تھا۔ سلام تک پہنچنے کے پیچھے منطق شاید یہ ہوتی کہ سبھی ایک ہی زمانے میں لکھ رہے تھے اور سبھی کا تعلق جدیدیت سے تھا مگر ایک کی کہانیاں ذرا سی محنت کے بعد سمجھ میں آ جاتیں اور دوسروں کی کہانیاں پورا زور لگانے کے باوجود بھی کھل نہیں پاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان پر کیے گئے تجزیے بھی ان کے مفاہیم کو واضح نہیں کر پاتے تھے۔

جب ہم نے غور کیا کہ آخر کیا بات ہے کہ ایک کی تحریر تو سمجھ میں آ جاتی ہے اور دوسرے کی تحریر لاکھ کوشش کے باوجود سمجھ میں نہیں آتی تو ہماری نظریں دونوں کی زبان پر رک گئیں:

اندازہ ہوا کہ سلام بن رزاق کی زبان، آسان، سہل رواں، واضح اور غیر مبہم ہے جب کہ احسن کی زبان مشکل ادق، پیچیدہ اور مبہم ہے۔ مثلاً:

''شکست خوردہ فوج کی ٹکڑی کے زخم سپاہیوں کو چھوڑ کر وہ بہت آگے نکل

گئے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑی ہوئی گرد نہ جانے کب کی ٹھنڈی ہو گئی۔ انھوں نے دھندلی نظروں اور سن کانوں سے شیروں اور بھیڑیوں کے ریت پر سرکنے کی سرسراہٹ محسوس کی تو بے چارگی سے مسکرا کر رہ گئے۔ لہریں کبھی صف بستہ گھوڑوں کی قطاریں بن کر ان کی طرف دوڑیں اور کبھی بادلہ پوش علم کی شکل اختیار کر لیتیں جن کے پھریرے لہر بہ لہر چکرا رہے تھے۔ کبھی پھر وہی پُر اسرار سرسراہٹ جیسے لاتعداد درندے ان کی بو کی طرف ہیبت ناک خاموشی اور چالاکی سے بڑھتے چلے آ رہے ہوں۔"

(نمود پر شکستہ شب: شیر آہو خانہ: قمر احسن ص 69)

"دیواروں پر ہزاروں مٹ میلے، ہلکے زرد، لمبے نیم مردہ کیچوے چپکے ہوئے تھے۔ دیواریں پھیلتی ہوئی جا رہی تھیں۔

جیسے انھیں لونا لگ گیا ہو۔ جب کبھی یہ ختم ہوں گے تو دیوار کس قدر مکروہ، پچپلے، جالی دار خانوں سے بھری ہوگی۔ اس نے دیوار کو دیکھا اور پھپھک کر رو پڑا... میں کب کسی کے لیے کار آمد رہا ہوں۔ میں محض تاریخ اور محض

یک لویہ نے جھٹ سے کمان سیدھی کی۔ ترکش سے تیر کھینچا اور اپنی مضطرب نگاہوں سے ادھر ادھر تاکا۔ آسمان پر ایک مرغابی اڑتی جا رہی تھی۔ بھیل بچے نے بجلی کی سرعت کے ساتھ تیر کمان پر چڑھایا۔ بایاں پاؤں آگے رکھا، دائیں پاؤں کا گھٹنا زمین پر ٹیکا اور نشانہ باندھ کر چلہ چھوڑ دیا۔ تیر سنسناتا ہوا نکلا اور چشم زدن میں مرغابی تیر میں بند پھڑ پھڑاتی یک لویہ کے قدموں میں آ گری۔

گھڑی کی پیدائش، ساری زندگی مجھے غم و آلام کا شکار رہنا ہے۔ (اماں! تمھیں میرے وجود کے علاوہ میری زبان سے بھی دکھ پہنچے ہیں اور تم بلک بلک کر روئی ہو میری ماں ہونے کے باوجود) اچانک وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا پھر گھور گھور کر سارے کمرے کو دیکھا۔ قمیض کا دامن اٹھایا اور اپنے پھولتے بڑھتے پیٹ کو سہلانے لگا۔ اس نے دیکھا کہ وہی گھوڑا تراخ تراخ جنگل اور پہاڑی میں دوڑ رہا ہے۔ جہاں جہاں کانٹے دار جھاڑیاں ہوتیں وہاں وہ چوپا بن کر پھدک کر نکل جاتا اور جہاں دلدل آتی تھی وہاں وہ کیچوا بن کر رینگ کر باہر نکل آتا۔"

(اسپ کشت مات 2، شیر آہو خانہ، قمر احسن ص 33)

"یک لویہ نے جھٹ سے کمان سیدھی کی۔ ترکش سے تیر کھینچا اور اپنی مضطرب نگاہوں سے ادھر ادھر تاکا۔ آسمان پر ایک مرغابی اڑتی جا رہی تھی۔ بھیل بچے نے بجلی کی سرعت کے ساتھ تیر کمان پر چڑھایا۔ بایاں پاؤں آگے رکھا، دائیں پاؤں کا گھٹنا زمین پر ٹیکا اور نشانہ باندھ کر چلہ چھوڑ دیا۔ تیر سنسناتا ہوا نکلا اور چشم زدن میں مرغابی تیر میں بند پھڑ پھڑاتی یک لویہ کے قدموں میں آ گری۔"

(یک لویہ: سلام بن رزاق: اردو کی تیرہ نئی مقبول کہانیاں، مرتبہ ڈاکٹر ریشما قمر ص 35)

"کہتے ہیں بستی کے پاس ہی ایک گھنے پیڑ پر ایک پری رہتی تھی۔ ننھی منی، موہنی صورت اور معصوم سیرت والی، گلابی آنکھوں اور شہابی ہونٹ سنہرے بالوں اور سرخ گالوں والی پری۔ پری گاؤں والوں پر بڑی مہربان تھی۔ وہ اکثر اپنے چمک دار پروں کے ساتھ اڑتی ہوئی آتی اور ان کے روتے ہوئے بچوں کو گدگدا کر ہنسا دیتی۔ لڑکیوں کے ساتھ ساون کے جھولے جھولتی، آنکھ مچولی کھیلتی، لڑکے بالوں کے ساتھ پیڑوں پر چڑھتی، ندی میں تیرتی، کبھی کبھی کسی کے کھلیان کو اناجوں سے بھر دیتی، کبھی کسی کے آنگن میں رنگ برنگے پھول کھلا دیتی.. بستی والے بھی اس کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اگر وہ ایک دن بھی دکھائی نہیں دیتی تو وہ بے چین ہو جاتے۔"

(ایک جھوٹی سچی کہانی: سلام بن رزاق، اردو کے مختصر افسانے، مرتبہ: صغیر افراہیم، ص 265)

ابتدائی دو اقتباسات قمر احسن کے افسانوں سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعد کے دو اقتباسات سلام بن رزاق کی کہانیوں سے لیے گئے ہیں۔

دونوں فن کاروں کی زبان، ان کی لفظیات، لفظوں کی ترتیب اور جملوں کی ساخت سے صاف پتا چلتا ہے کہ کس کے یہاں وسیلۂ اظہار صاف ستھرا، سہل، سبک اور رواں دواں ہے اور کس کا پیرایۂ بیان پیچیدہ، مشکل مبہم اور الجھا ہوا ہے۔

گہرائی سے غور کرنے پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ افسانوی نگارش کی زبان وہ نہیں ہوتی جو کسی غیر افسانوی یا علمی و فلسفیانہ تحریر کی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ کہانی کی زبان کا بنیادی منشا لطف و انبساط کی فراہمی، بیداری احساس، بالیدگی ادراک و شعور اور تزکیۂ نفس ہے۔ اس کے لیے کہانی کار کو وہ کرنا پڑتا ہے جن سے علمی زبان اور فلسفیانہ اظہار میں بچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ سعی اس لیے کی جاتی ہے کہ اگر وہ کیا گیا جو کہانی کی زبان میں کیا جاتا ہے تو علمی تحریر کے اظہار میں بیڑیاں پڑ جائیں۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگ جائیں۔ اس کے ذہن کو لقوہ مار جائے۔ اس کی زبان اینٹھ جائے اور اس کا مقصد فوت ہو جائے۔ کیونکہ علمی زبان کا مقصد ہوتا ہے کہ معلومات کی ترسیل آسانی سے ہو جائے۔ اس کی راہ میں کسی قسم کی کوئی اڑچن نہ آئے۔ اگر یہاں تشبیہ استعارے اور صنائع بدائع کی پریاں اتر گئیں یا اتار دی گئیں تو موضوع و مواد کا آگے بڑھنا دشوار ہو جائے گا۔

اور اگر علامتیں شامل کر دی گئیں تو ممکن ہے اظہار کا کھلنا بھی دشوار ہو جائے۔ جبکہ کہانی کی زبان عام زبان نہیں ہوتی۔ وہ کسی اہم خبر کو اس طرح نہیں سناتی کہ میں ایک چونکانے والی یا حیرت میں ڈالنے والی خبر لایا ہوں۔ بلکہ یوں سناتی ہے:

"لا، ہاتھ دے، ایسی خبر سناؤں تیری گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔"

تخلیقی زبان فکر مند، بیمار اور لاغر ابا کو یہ نہیں کہتی کہ ابا دبلے پتلے ہو گئے ہیں بلکہ ان کی اس حالت کو اس طرح بیان کرتی ہے:

"ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔"

پریم چند کی تخلیقی زبان کفن کے بے درد، خود غرض اور بے حس کرداروں گھیسو اور مادھو کے بارے میں یہ نہیں کہتی کہ وہ آلو کھا کر اطمینان اور بے فکری سے سو گئے بلکہ یہ کہتی ہے:

"آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔"

اس زبان میں ان کی بے حسی اور بے فکری کا بیان ہی نہیں ہے بلکہ ان کی طینت کی سفاکی کی عکاسی بھی ہے اور ان کو انسان سے سانپ بنا دینے والی صورت کی تصویر کشی اور معصوم عورت کی چھٹپٹاہٹ کی مصوری بھی۔

تخلیقی زبان کا حسن دیکھنا ہو اور اس حسن سے حواس میں حرکت و حرارت محسوس کرنا ہو تو ان نمونوں پر بھی نگاہیں مرکوز کیجیے:

''نام کی گوری تھی مگر کم بخت سیاہ بہت تھی، جیسے الٹے توے پر کسی پھوہڑ نے پراٹھے تل کر چمکتا چھوڑ دیا ہو۔''

''اس کی باہیں جو کاندھوں تک ننگی تھیں، پتنگ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں جو اوس میں بھیگ جانے کے باعث پتلے کاغذ سے جدا ہو جائے۔ دائیں بازو کی بغل میں شکن آلود گوشت ابھرا ہوا تھا جو بار بار موڑنے کے باعث نیلی رنگت اختیار کر گیا تھا جیسے نچی ہوئی مرغی کی کھال کا ایک ٹکڑا وہاں پر رکھ دیا گیا ہے۔''

''وہ گا رہی تھی۔ اس کی آواز میں ایسا سوز تھا کہ ان کے سینوں میں دل تڑپ اٹھے... لوگ حیرت سے آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے اس کا گیت سنتے رہے، سنتے رہے یہاں تک کہ ان کے ہاتھوں میں دبی تلواریں پھولوں کی چھڑیوں میں تبدیل ہو گئیں اور نیزے مور چھل بن گئے۔''

(ایک جھوٹی سچی کہانی: سلام بن رزاق)

تخلیقی زبان جب آگے بڑھتی ہے تو اپنے پیچھے دھنک تانتی جاتی ہے۔ شفق کی لالی اور پھولوں کی مہک چھوڑتی جاتی ہے۔ چلتی ہے تو اس سے پٹاخے پھوٹتے ہیں۔ پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں۔ اس کی دھمک سے دھند چھٹتی ہے۔ بدلی پھٹتی ہے۔ تیرگی ہٹتی ہے۔ تخلیقی زبان وہ آبشار ہے جس سے پگھلی ہوئی چاندی کی دھاریں اچھلتی ہیں۔ رنگین پھوہاریں نکلتی ہیں اور فضائیں ٹھنڈک سے بھر جاتی ہیں۔ یہ وہ زبان ہے جس میں خوشبو دکھائی دیتی ہے۔ رنگ سنائی دیتا ہے۔

اس کی صوت و صدا کا لمس چھوتا ہے تو لہو میں لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ رگوں میں کیف و سرور کی نہریں بہنے لگتی ہیں۔ مساموں میں لطف و نشاط موجیں لہر لینے لگتی ہیں۔

تخلیقی زبان یوں نہیں بنتی۔ یہ تشبیہوں کے جمال، استعاروں کے کمال، صنعتوں کے خط و خال، علامتوں، اور لفظوں کے تخلیقی استعمال سے خلق ہوتی ہے۔ یہ وہ آبشار ہے جس سے پگھلی ہوئی چاندی کی دھاریں اچھلتی ہیں۔ رنگین پھوہاریں نکلتی ہیں۔ یہ وہ زبان ہے جس میں خوشبو دکھائی دیتی ہے۔ رنگ سنائی دیتا ہے۔

انسان اپنی سیمابی جبلت کے سبب ہر دم، ہر پل، ہر گام پر کچھ ایسا کرنا چاہتا ہے کہ جس سے اس کے آس پاس کی صورت حال بدل جائے۔ کسی گوشے سے کچھ نیا نکل آئے یا پرانا پن نئے پن میں تبدیل ہو جائے تاکہ زندگی میں نیا رنگ، نیا رس بھرتا رہے۔ دل و دماغ کو تازگی کا احساس ہوتا رہے۔ لطف و انبساط ملتا رہے۔ انسان کی یہی خواہش، اس کے اندرون کی یہی رو اور ان دونوں کا اظہار اس کی تخلیقیت ہے۔ اسی تخلیقیت سے فنون لطیفہ وجود میں آتے ہیں۔ تخلیقی رو کے زیر اثر ہی ترسیل و ابلاغ کے نئے وسیلے پیدا ہوتے ہیں۔ انھیں وسیلوں کی غمازی سلام بن رزاق کی کہانیوں سے ماخوذ درج بالا اقتباسات

تخلیقی زبان یوں نہیں بنتی۔ یہ تشبیہوں کے جمال، استعاروں کے کمال، صنعتوں کے خط وخال، علامتوں، اور لفظوں کے تخلیقی استعمال سے خلق ہوتی ہے۔ یہ وہ آبشار ہے جس سے پگھلی ہوئی چاندی کی دھاریں اچھلتی ہیں۔ رنگین پھوہاریں نکلتی ہیں۔ یہ وہ زبان ہے جس میں خوشبو دکھائی دیتی ہے۔ رنگ سنائی دیتا ہے۔

میں ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قمر احسن کے یہاں تخلیقیت نہیں ہے۔ تخلیقیت ان کے افسانوں میں بھی ہے۔ زبان و بیان میں حسن ان کے یہاں بھی پیدا کرنے کا جتن کیا گیا ہے مگر ان کے خیالات کی پیچیدگی ان کے اسلوب میں بھی در آئی ہے اور اظہار کو اتنا پیچیدہ اور بوجھل بنا دیا ہے کہ حسن معدوم ہو گیا ہے۔

سلام اس لیے بھی سمجھ میں آئے کہ ان کے افسانوی متن میں فلسفیانہ موشگافیاں نہیں ٹھوس حقائق تھے۔ صفحۂ قرطاس پر آسمان نہیں زمین بچھی تھی۔ ان کے اوراق میں خیالات کم محسوسات زیادہ تھے۔ مطالعات کم تجربات و مشاہدات زیادہ تھے۔ ان کی کہی گئی باتیں اپنی لگیں۔ ان کا احساس اپنا احساس محسوس ہوا۔ ان کے جذبات میں اپنے جذبوں کا رنگ نظر آیا۔ ان کا کرب اپنا کرب لگا۔ ان کا تجربہ ایسا لگا جیسے اپنا تجربہ ہو۔

افسانہ یک لویہ ہو، یا ایک جھوٹی / سچی کہانی ہو، انجام کار ہو یا بجوکا ہو، ننگی دوپہر کا سپاہی ہو یا معبر ہو، آواز گریہ ہو یا گیت ہو سلام بن رزاق اپنی ہر کہانی میں سہل، سہج اور قابل فہم لگتے ہیں۔ اسی لیے وہ سب کو اچھے لگتے ہیں۔ انھیں سمجھنے کے لیے کبھی بھی کسی مہدی جعفر کی ضرورت نہیں پڑی۔ انجام کار کی علامتی گرہوں کو کھولنے میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ذہن کو لہولہان نہیں ہونا پڑا۔

گویا سلام بن رزاق نے اس زمانے میں بھی کہانی کو کہانی بنائے رکھنے میں اہم کردار نبھایا جس عہد نے کہانی سے کہانی پن کو دور کرنے کا پوری طرح من بنا لیا تھا۔ جس نے کہانی کاروں کے دماغوں میں کچھ ایسا خیال پیوست کر دیا تھا کہ کہانی اگر سمجھ میں آ گئی تو وہ کہانی نہیں رہ پائے گی۔ اچھی کہانی وہ ہے جو آسانی سے کھلے نہیں اور کھلے بھی تو صاف صاف دکھائی نہ دے۔ کچھ پردے ضرور حائل رہیں۔ تخلیق کاروں نے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے میں ایسے دبیز پردوں کا استعمال شروع کر دیا کہ ان کو ہٹانے میں قاری کے ذہن کی ہڈیاں چٹخنے لگیں۔ تخلیق کاروں نے ان پردوں کو ٹانگنے میں رسیاں بھی ایسی لگائیں کہ ان پردوں کو سرکانا دشوار ہو گیا۔ ساتھ ہی اس درجہ تکلیف دہ بھی کہ قاری کہانی کے پاس جانے سے گھبرانے لگا۔ اور اس طرح قاری کہانی سے دور ہو گیا۔

ایسی صورت حال میں بھی سلام بن رزاق نے خود کو اور اپنے ساتھ کچھ اور لوگوں کو بھی اردو کہانی کی ہموار ڈگر پر روکے رکھا اور کہانی کی روح کو بھٹکنے نہیں دیا۔ اپنے معاصرین اور اپنے جونیئرز کو بھی اپنے ساتھ لگائے رکھا اور کہانی میں کہانی پن کی واپسی کے لیے انھوں نے وہ کچھ کیا جو ایک باپ راہ سے بھٹکی ہوئی اپنی اولاد کو راہِ راست پر لانے کے لیے کرتا ہے۔

نئے زمانے کی نئی ڈگر پر نئی نسل کے افسانہ نگاروں کو چلانے کے لیے 'بزم افسانہ' کے نام سے انھوں نے ایک ایسا افسانوی فورم کا قیام تیار کیا جو آج بھی نئے افسانہ نگاروں کے لیے مشعل راہ بنا ہوا ہے۔

سلام بن رزاق جتنے سہل اور سہج اپنی کہانی میں لگتے ہیں اتنے ہی سہل و سہج اپنی زندگانی میں بھی محسوس ہوتے تھے۔ وہ جو باہر تھے وہی اندر بھی تھے۔ ایسا نہیں کہ وہ ناریل یا بیل پھل ہوں کہ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ۔ وہ کسی بھی جذبے یا کیفیت کے اظہار میں ایکٹنگ نہیں کرتے تھے۔ اپنے اوپر کوئی ملمع نہیں چڑھاتے تھے۔ کسی قسم کی کوئی منافقت نہیں دکھاتے تھے۔ محبت، نفرت، خلوص، غصہ کسی بھی اظہار میں تماشا نہیں کرتے تھے، کسی

سلام کسی بڑی پوسٹ پر نہیں تھے، ممکن ہے اس کا انھیں ملال بھی رہا ہو کہ وہ بڑی سے بڑی پوسٹ کے لیے ڈزرو کرتے تھے مگر انھوں نے کبھی کسی سے اپنی معاشرتی پوزیشن کو چھپایا نہیں اور نہ ہی اس میدان میں پچھڑ جانے پر کبھی نادم ہوئے یا احساسِ کم مائگی کے شکار ہوئے۔ ان کا یہ رویہ بھی ان کو بڑا بناتا ہے اور ان کے قد کو اونچا کرتا ہے۔

بھی جذبے کو دبا کر نہیں رکھتے۔ تھے بلکہ ہر ایک کا برملا اظہار کرتے تھے۔ میں نے عالمِ سرشاری میں ان کے ہونٹوں سے پھول کی مانند جھڑتے ہوئے تحسینی کلمات بھی سنے اور حالتِ غیظ وغضب میں منہ سے نکلتے اور ابلتے ہوئے مغلظات بھی۔ محفلوں میں اظہارِ خیالات کی خواہش ان کی بھی ہوتی تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ انھوں نے ادب کو براہ راست پڑھا تھا۔ متن میں اتر کر مواد و موضوع کا مطالعہ کیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے چپو چلا کر تخلیق کے سمندر کو پار کیا تھا کسی ناخدائے نقد کے چپوار کے سہارے نہیں، اس کے باوجود میں نے دیکھا کہ کلکتے کی ایک بڑی اہم اور یادگار افسانوی محفل کی جب انھیں صدارت سونپی گئی تو انھوں نے انکار کر دیا جبکہ وہ پہلی بار کولکتہ کے کسی ادبی جلسے میں شریک ہوئے تھے اور جس میں انھیں اپنی تنقیدی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع مل رہا تھا۔ یہ کسی فن کار کی وہ ادا تھی جو اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ فن کار کس حد تک بے نیاز ہوتا ہے اور اس کی یہی بے نیازی اس کے قد کو اور بلند کر دیتی ہے۔

سلام کی سادگی اور سادہ مزاجی کا انداز اس واقعے سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو میرے علی گڑھ کے مکان جو نیا نیا بنا تھا میں دوستوں کی ایک دعوت کے دوران رونما ہوا تھا۔ طعام سے پہلے خوش گپیوں کے دوران یکا یک سلام سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بول پڑے۔

" مجھے بے پناہ خوشی ہو رہی ہے کہ میرے کسی دوست کے پاس اتنا بڑا مکان ہے۔"

سلام کا یہ جملہ سن کر یک لخت میرے لبوں سے قہقہہ پھوٹ پڑا "سلام کو میری ہنسی ناگوار لگی۔"

مجھے اس طرح قہقہہ لگاتے ہوئے دیکھ کر بولے:

''اس میں اس طرح ہنسنے کی کیا بات ہے غضنفر!''

'' آپ اس مکان کو بڑا بتا رہے ہیں اس لیے ہنسی چھوٹ پڑی۔ لگتا ہے آپ نے بڑا مکان نہیں دیکھا ہے؟''

میری بات سن کر وہ مزید سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے:

''غضنفر ! تم نے چھوٹا مکان نہیں دیکھا ہے۔ کبھی بمبئی آؤ تو تمھیں دکھائیں گے کہ چھوٹا مکان کیسا ہوتا ہے۔''

اس سے پہلے میں نے اپنے کسی دوست یا ادیب کو ایسا سفاک سچ اپنے بارے میں بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔

ایک بار ممبئی جانے کا اتفاق ہوا تو سلام نے اپنے گھر پر میری دعوت کی اور میرے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام بھی کیا۔ جب شعر وسخن اور ماحضر مرغن سے فارغ ہو گئے اور خوش گپیاں شروع ہوئیں تو اچانک سلام مجھے مخاطب کر کے بول پڑے:

غضنفر! تمھیں شاید یاد ہوگا کہ تمھارے گھر ایک دن میں نے تم سے کہا تھا کہ کبھی ممبئی آؤ گے تو میں تمھیں دکھاؤں گا کہ چھوٹا مکان کیسا ہوتا ہے تو لو دیکھ لو، چھوٹا مکان ایسا ہوتا ہے۔

سلام کی بات سن کر میں بولا:

''ہاں ہے تو یہ چھوٹا مگر اس میں وسعت بہت ہے۔ اتنی وسعت کہ اس میں آکھا (پورا) ممبئی سما گیا ہے۔''

میرے اس جملے کو سنتے ہی سلام کی بیٹھک میں ایک ساتھ بہت ساری صدائیں گونج پڑیں جن میں ساجد رشید، انور قمر، علی امام نقوی، قاسم امام، وقار قادری، فصیح اکمل، مقدر حمید، الیاس شوقی، علی احمد فاطمی، رحمان عباس، عبدالاحد ساز وغیرہ کے سر بھی شامل تھے۔
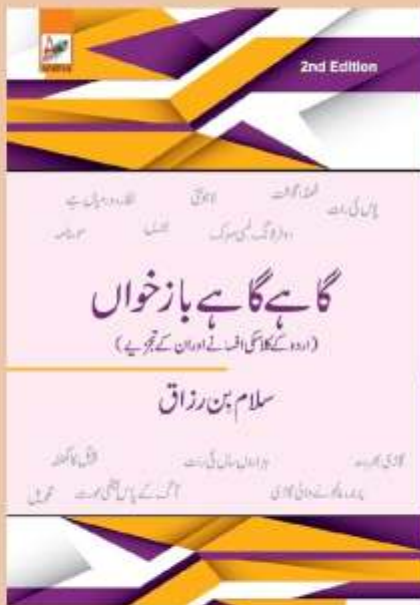
سلام کسی بڑی پوسٹ پر نہیں تھے، ممکن ہے اس کا انھیں ملال بھی رہا ہو کہ وہ بڑی سے بڑی پوسٹ کے لیے ڈزرو کرتے تھے مگر انھوں نے کبھی کسی سے اپنی معاشرتی پوزیشن کو چھپایا نہیں اور نہ ہی اس میدان میں پچھڑ جانے پر کبھی نادم ہوئے یا احساسِ کم مائگی کے شکار ہوئے۔ ان کا یہ رویہ بھی ان کو بڑا بناتا ہے اور ان کے قد کو اونچا کرتا ہے۔

ویسے تو سلام کا قلم ہر جگہ بے باکی سے چلتا ہے اور بنا کسی مصلحت کا شکار ہوئے آگے بڑھتا جاتا ہے اور وہ سب کچھ لکھتا جاتا ہے جو سلام کے مشاہدے اور تجربے میں آتا ہے مگر آوازِ گریہ میں اس خامۂ خوں چکاں نے جس بے باکی اور کربناکی کا مظاہرہ کیا ہے اسے دیکھ کر آنکھیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ اس کہانی میں سلام کا خامہ تیغِ بے نیام بن گیا ہے۔ جو بھی اس کے راستے میں آتا ہے کٹتا چلا جاتا ہے۔ اور قاری کا سینہ بھی پھٹتا جاتا ہے۔

یہ انداز بھی سلام کو ان کی شخصیت کی سادگی نے بخشا ہے۔ یہاں سلام کی سادگی کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے اور اس کرب کے اظہار کا بھی جو سلام کی مفارقت کی ضرب سے ان کے چاہنے والوں کو پہنچا ہے۔

سب کو سلام کر گیا پیارا سلام آج
رخصت ہوا زبانِ قلم سے کلام آج

کیا بات ہو گئی کہ ہوا، ربط منقطع
کیوں روٹھ گیا بزمِ ادب کا امام آج

اتنا تھا وہ عزیز کہ روتے ہیں زار زار
فرقت میں اس کی چاروں طرف خاص و عام آج

کیا تھا وہ میرا کون تھا رشتہ تھا کیا مرا
اشکوں کا کیوں نگاہ میں ہے ازدہام آج

اتنا اہم تھا شہرِ فسانہ میں وہ فقیہ
ٹھپ ہو گئے ہیں، سارے کہانی کے کام آج

اپنا خلوص، اپنی دعا، اپنی آرزو
پونجی تمام نذر کریں اس کے نام آج

ایسا ہے اضطراب غضنفر دماغ میں
جی چاہتا ہے لب سے لگاؤں میں جام آج

■

Ghazanfar
Bushra, Lane A-12
Hamza Colony
New Sir Syed Nagar Ext.
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.: 7678436704
ghazanfarjmi@gmail.com

نورالحسنین

شکستہ بتوں کے درمیان سلام بن رزاق

جن افسانہ نگاروں نے بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اپنی شناخت قائم کی ان میں انور خان، سلام بن رزاق، شوکت حیات، حسین الحق، عبدالصمد، شفق، علی امام نقوی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ یہ دور جدیدیت کے رجحان کا دور تھا اس دور میں بلراج مینرا، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، جوگندر پال، زاہدہ حنا، رشید امجد جیسے افسانہ نگاروں کا طوطی بولتا تھا، افسانہ غور و فکر کی دعوت دیتا تھا اور ایک نیا مزاج سامنے آرہا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ ذہین افسانہ نگاروں کے ساتھ ہی ایک ایسی جماعت بھی جدید افسانہ لکھنے لگی تھی جنھوں نے جدیدیت کو سمجھا ہی نہیں تھا اور انشائیہ کے مماثل بلکہ لایعنی تحریروں کا انبار سامنے آنے لگا تھا اور ایسے افسانے بھی رسالہ شب خون، اور جواز میں شائع ہونے لگے تھے اور کچھ ناقدین ان کا تجزیہ بھی کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے ایک ذہین رجحان کو خود ساختہ علامتوں میں پھنسا دیا تھا، ان کی تشبیہات، استعارے قاری کی سمجھ سے بالاتر تھے۔ کہانی خود کلامی اور مختلف اسالیب میں سانسیں لے رہی تھی اور ناقدین ادب کے تجزیوں اور تشریحات ہی میں کہانی اس دلہن کی طرح نہایت دھیمے لہجے میں اقرار کرتی کہ قبول ہے قبول ہے۔ مجبوراً وہ نسل جو بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں اپنی شناخت بنا رہی تھی وقت اور ضرورت کے تحت جدید رجحان کو اپنانے پر مجبور تھی۔ لیکن سلام بن رزاق جن کے مطالعے میں ہندی ادب بھی تھا وہ اس بات کو جان چکے تھے کہ یہ رجحان اب زیادہ دیر تک باقی نہیں رہے گا اور افسانہ کروٹ بدلے گا۔ اس رجحان سے نکلنے کے لیے انھوں نے تمثیلی افسانے لکھنا شروع کیے۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ ان کے دیگر ساتھی بھی اسی قسم کے افسانے لکھنے لگے تھے اور افسانہ نگاری کا مزاج بدلنے لگا تھا۔

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی تک پہنچتے پہنچتے جدیدیت کا خمار بھی اترنے لگا تھا۔ افسانہ خود اختراع علامتوں اور تمثیل سے باہر نکلنے لگا تھا اور کچھ اور نام اس فہرست میں جڑنے لگے تھے جن میں سید محمد اشرف، ساجد رشید، بیگ احساس، مشتاق مومن، شموئل احمد کے ساتھ ہی ساتھ راقم اور کئی اور نام دکھائی دینے لگے تھے۔ جو افسانے کو حقیقت پسندی اور ایک نئے بیانیے سے روشناس کروا رہے تھے۔ اس بیانیے میں زبان کا مزاج تو جدیدیت سے قریب تر تھا لیکن ماجرا سازی اور کردار نگاری ترقی پسند تحریک سے لی گئی تھی۔ نیا افسانہ ماجرا، کردار، حسب ضرورت علامتوں اور تشبیہات کی شمولیت کے ساتھ اپنا سفر طے کرنے لگا تھا۔ افسانے کا یہ مزاج پھر ایک بار قاری کو واپس لانے کے قابل ہو گیا تھا۔

یہاں تک پہنچتے پہنچتے سلام بن رزاق کے دو افسانوی مجموعے ننگی دوپہر کا سپاہی، اور معبر شائع ہو چکے تھے۔ جنھیں ناقدین ادب اور قارئین نے نہ صرف پسند کیا تھا بلکہ سلام بن رزاق کے سر وہ مقبولیت کا تاج رکھ دیا تھا جو آج تک بھی ان ہی کے سر پر موجود ہے۔ اس مضمون میں میں ان کے تیسرے افسانوں کے مجموعے 'شکستہ بتوں کے درمیان' کے افسانوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا کیونکہ ان کے مذکورہ دونوں مجموعوں کے افسانوں پر تفصیلی مضمون لکھ چکا ہوں۔

سلام بن رزاق کا سفر اپنے تیسرے افسانوں کے مجموعے تک پہنچتے پہنچتے بیانیہ کے اس مزاج تک پہنچ گیا تھا جو مطالعاتی وصف کی جمالیات، لفظوں کے دروبست کی خوبیوں اور ماجرے کے تجسس میں قاری کو کس طرح الجھا کر افسانے کی آخری سطر تک لے جایا جا سکتا ہے۔ ان کے اس مجموعے میں جملہ 16 افسانے شامل ہیں لیکن موضوعاتی سطح پر ان میں بھی قومی یکجہتی، عام آدمی کا استحصال، عدم تحفظ کا احساس، فرقہ واریت اور تنہائی کا احساس، نیا معاشرتی نظام اور اس نئے نظام سے جوجھتا ہوا فرد وغیرہ شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل افسانے 'اندیشہ' اور 'شکستہ بتوں کے درمیان' ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے تعاقب میں دکھائی دیتے ہیں۔ نفرتوں کے مختلف انداز، فسادات اور تحفظ کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے اب ہر فرقہ اپنی ایک الگ کالونی بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ محفوظ زندگی بسر کر سکے۔ اب اس قسم کی کالونی دیکھنے کو بہت کم ملتی ہے جس میں ہندو، مسلمان، بودھ، عیسائی اور سکھ ایک ساتھ ہی رہتے ہوں، ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوں، عیدین اور تہواروں پر سچے دل سے ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوں۔

افسانہ 'اندیشہ' کا مرکزی کردار رضی الدین جب اپنی ملازمت سے وظیفے پر سبکدوش ہوتا ہے تو اپنے لیے ایک سستا سا مکان بنانا چاہتا ہے لیکن بیوی اور لڑکوں کا اصرار ہے کہ مکان کسی ایسی جگہ بنوایا جائے جہاں پر مسلمانوں کی بڑی آبادی ہو، شہر میں کبھی بھی فسادات پھوٹ پڑتے ہیں۔ پچھلے بار ہی کس مصیبت سے سامنا ہوا تھا؟ یاد ہے نا؟ اس کے بعد وہ اپنے دوستوں سے مشورہ کرتا ہے۔ جو اس کی طرح ہی بزرگ ہیں۔ اس گفتگو کو ملاحظہ فرمائیں:

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ سستا مکان عظمت نگر کے آس پاس شاستری نگر یا جنتا کالونی میں بھی مل سکتا ہے۔ مگر شیخ صاحب وہاں مکان اس لیے نہیں لیا جا سکتا کہ وہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے اور عظمت نگر میں سو فیصد مسلم آبادی ہے۔''

''ارے یار! تو اس میں کیا برائی ہے۔ ہر شخص اپنوں کے درمیان ہی تو رہنا چاہتا ہے۔'' گپتا نے پھر وکالت کی۔

''گپتا! یہی اپنوں والی بات تو ہمیں ایک دوسرے سے دور کر رہی ہے۔ ہم دھیرے دھیرے اپنے ہی گھر میں دیواریں کھڑی کر رہے ہیں۔ ہمارے ذہنوں سے انسانی برادری کا آفاقی تصور ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہم ہندو، مسلم، مراٹھا، گجراتی، پنجابی اور کشمیری جیسے ذیلی ناموں سے پکارا جانا پسند کرنے لگے ہیں۔ملک غیر محسوس طور پر خانوں میں بٹتا جا رہا ہے۔ یہ رجحان یقیناً پوری قوم کو پارہ پارہ کر دے گا۔'' (افسانہ:اندیشہ،کتاب شکستہ بتوں کے درمیان، ص 6)

معمر افراد اگر چہ اس سوچ سے اتفاق نہیں کرتے لیکن حالات اور اولاد کے سامنے بے بس ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ رضی الدین اپنا مکان عظمت نگر میں بنوا لیتے ہیں جو شہر سے دور ہے لیکن خالص مسلمانوں کی بستی ہے۔یہاں ایک بڑی سی مسجد بھی ہے جس میں مسلمان پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں خود رضی الدین بھی پہلے پابندی سے جاتے تھے۔لیکن انھیں اپنے دوستوں کی یاد ستاتی ہے اور وہ ان سے ملنے کے لیے بس گاڑی میں دھکے کھاتے ہوئے جاتے ہیں۔ بعد میں ایک سائیکل خرید لیتے ہیں۔ ایک روز انھیں واپسی میں دیر ہو جاتی ہے وہ بھاجی ترکاری اور کچھ کھانے پینے کا سامان لے کر عظمت نگر لوٹ رہے تھے اندھیرے میں کتے انھیں بھونکتے ہیں بلکہ پیچھا کرتے ہیں اور وہ گر جاتے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ رات کو کتوں کا بھونکنا اور حملہ کرنا یہ ان کی جبلت ہے۔ پھر یہ کتے شہر کے نہیں اسی عظمت نگر کے ہیں۔ وہ علامت نہیں بن سکے۔ کسی بھی پلاٹ پر مشاق تو کہانی تیار کرسکتی ہے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اس قسم کا پلاٹ ذہن میں آسکتا ہے لیکن اس پر جس قسم کی کہانی لکھی جانا چاہیے تھی وہ نہیں بن سکی۔ ہم نے شروع ہی میں کہا کہ افسانہ 'اندیشہ' اور 'شکستہ بتوں کے درمیان' ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے تعاقب میں دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کہانیاں اقدار کے بکھرنے کا سبب بیان کرتی ہیں۔ وہ لوگ جو ممبئی میں رہتے ہیں وہاں پر اکثر نوجوان اپنے فن کا مظاہرہ پبلک اسپاٹ پر کرتے ہیں کوئی اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرتا ہے تو کوئی ڈانس کا، ریت پر مجسمے بنا کر یا ڈرائنگ بنا کر لوگوں کو متوجہ کرتے رہتے ہیں اور دیکھنے والے کچھ روپیہ ان کے سامنے پھینک کر چلے جاتے ہیں۔ اِن مناظر نے سلام بن رزاق کو ایک کہانی کا پلاٹ عطا کیا ہے۔

کہانی کچھ اس طرح ہے کہ سمندر کنارے مختلف کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ ہی کچھ فنکار بڑی عجیب عجیب پینٹنگ بھی بناتے ہیں ریت کے مجسمے بھی بناتے ہیں ایک روز مائیکل نامی ایک نوجوان ریت پر ایک خوب صورت بچے کا مجسمہ بناتا ہے، جس کے دونوں ہاتھ آسمان کی جانب اٹھے ہوئے ہیں گویا وہ چاند کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہیں پر ایک بوڑھا مجسمہ ساز بھی آجاتا ہے۔ اسے مائیکل کی فنکاری بہت متاثر کرتی ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ اپنے اسٹوڈیو لے کر آتا ہے جہاں بوڑھے کے بنائے ہوئے بہت سارے مکمل، ادھورے مجسمے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اسے انھیں مکمل کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ نوجوان اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر کے انھیں مکمل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شہرت کی بلندیوں کو پالیتا ہے۔ ایک دن وہ اپنے اسٹوڈیو میں آتا ہے اپنے بنائے ہوئے مجسموں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ ان بتوں کے درمیان وہ خود بھی ایک بت بن کر رہ گیا ہے۔ یہیں سے افسانہ ایک نیا رخ بدلتا ہے۔

''اس نے حسرت سے اپنے اسٹوڈیو اور شکستہ، نیم شکستہ بتوں پر ایک نظر ڈالی اور لاٹھی ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا اسٹوڈیو کے باہر نکل آیا۔ دھوپ سے اس کی بوڑھی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اس نے داہنے ہاتھ سے ہتھیلی کا چھجا بنا کر آنکھوں کو دھوپ سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ لاٹھی ٹیکتا اور کھٹ کھٹ کی آواز کرتا شہر کی گلیوں، فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر چلتا رہا۔ شہر بدل چکا تھا۔ پرانے مکانوں کی جگہ اونچی اونچی عمارتیں بن گئی تھیں۔ اور اونچی عمارتیں اور بھی اونچی ہو گئی تھیں۔ سڑکیں کشادہ اور فٹ پاتھ کشادہ ہو گئے تھے۔ بڑی بڑی دکانیں کھل گئی تھیں۔ دکانوں کی رونق بڑھ گئی تھی۔ گہما گہمی میں اضافہ ہو گیا تھا لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ لوگوں کے قد گھٹ گئے تھے۔ مرد عورت، بوڑھے جوان کسی کا بھی قد تین چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا... سب اپنے اپنے کاروبار میں ایسے محو تھے کہ کسی سے کسی کو واسطہ نہیں تھا۔ اسے بچے کہیں نظر نہیں آئے۔''
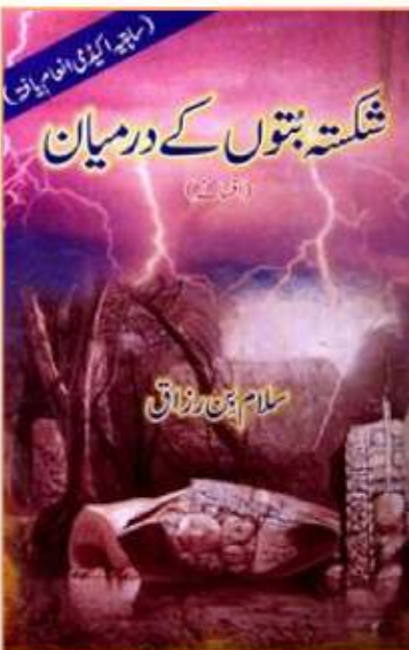
(افسانہ:شکستہ بتوں کے درمیان، کتاب:شکستہ بتوں کے درمیان، ص 49)

یہ ایک تہہ دار افسانہ ہے اور کہانی کے اندر سے بننے والی علامتیں قاری کے ذہن میں آپ ہی آپ سوال بننے لگتی ہیں۔ مثلاً لوگوں کے قد کیوں چھوٹے ہو گئے تھے اور بچے کہاں چلے گئے تھے یا بچے تھے ہی نہیں؟ افسانہ جواب دیتا ہے کہ لوگوں کے قد اس لیے گھٹ گئے تھے کہ وہ اپنی قدروں سے دور ہو گئے تھے جس کی وجہ سے بستی میں بے حسی پیدا ہو گئی تھی۔ کوئی کسی کے حال چال دریافت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا۔ بچوں کا غائب ہو جانا یعنی شہر سے معصومیت اور اخلاق کے خاتمے کا سبب ہے۔

سلام بن رزاق کی کہانیوں کا اختتام قاری کی سوچ پر نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے اس مقام پر پہنچاتے ہیں جو اکثر اس کی سوچ سے پرے ہوتا ہے۔ بوڑھا قدم آگے بڑھاتا ہے اور سمندر کے ساحل پر پہنچتا ہے جہاں پھر کسی نوجوان فنکار نے وہی بچہ بنایا ہے جس کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے ہیں اور وہ چاند کو چھونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس کو بنانے والا مر گیا ہے اور اس کی لاش پر لوگ پیسے پھینک رہے ہیں۔

بچہ یہاں پھر ایک نئی علامت کا روپ لیتا ہے کہ بچہ دراصل انسان ہے اور فنکار اس کا خالق، اور بوڑھا مائیکل وقت کی علامت ہے اور انسان خواہشات کا پتلا ہے۔ چاند کو پکڑنا یا چھونا دراصل وہ خواہشات ہیں جن کی کبھی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

فساد کے موضوع پر ان کا ایک اور افسانہ 'چادر' ہے جس کا تعلق 1992 میں ممبئی میں ہونے والے بھیانک ترین فساد پر ہے بقول سلام بن رزاق یہ کہانی جو حقیقت پر مبنی ہے ان کے ایک دوست نے سنائی تھی، وہ جب بھی اسے لکھنے کی کوشش کرتے ظلم و جبریت کے واقعات ان کو لرزا دیتے اور کہانی ادھوری رہ جاتی آخر اس کہانی کو انھوں نے 1996 میں لکھا تھا۔ یہ کہانی آج بھی قاری کو خون کے آنسو رلاتی ہے۔

سلام بن رزاق نے بعض افسانے ضرورت کے تحت بھی لکھے جن میں 'دوسرا قتل'، بنارسی ساڑی اور 'ہدف' جیسے افسانے شامل ہیں۔ جو افسانے فرمائش پر یا ضرورت کے تحت ہوتے ہیں ان میں کوئی گہرائی و گیرائی نہیں ہوتی، بس وہ بیانیہ کی عمدہ مثال ہوتے ہیں چنانچہ افسانہ 'دوسرا قتل' ایک نہایت کمزور افسانہ ہے۔ یہ ایک دولتمند انسان کی کہانی ہے جس کا مقصد محض دولت کمانا ہے۔ خوب دولت کمانے کے بعد اس کی نظریں اپنے دوست کی دولت پر پڑتی ہیں۔ وہ اس کی بیوی کو اپنی محبت کے جال

میں پھانستا ہے اور آخر ایک دن اپنے دوست کو اس کی بیوی کی مدد سے قتل کر دیتا ہے۔ کچھ دن کے بعد اسے پچھتاوا ہوتا ہے اور ایک دن وہ خود بھی اپنے آپ کو قتل کر دیتا ہے۔ یہ ایک کمزور کہانی ہے اور تنقید نے اس کہانی پر زبان بھی نہیں کھولی، دوسری کہانی 'بنارسی ساڑی' بھی ایک گھریلو کہانی ہے اور افسانہ 'ہدف' فقیروں پر لکھی ہوئی ایک کہانی ہے۔

اس کے علاوہ بھی اس افسانوں کے مجموعے میں کچھ اور بھی کہانیاں شامل ہیں جیسے 'آندھی میں چراغ' اور 'آواز گریہ' پہلی کہانی کا موضوع بے حد اہم ہے۔ فسادات کے بعد کے حالات، جوان بیٹے کی شہادت، جوان بیوی، ایک ننھا سا معصوم بیٹا، اور گھر کی ساری ذمے داریاں ایک ضعیف اور ناتواں کے کندھوں پر۔ خاندان میں مرکز نظر ایک شادی شدہ بھتیجا اس کے دو بچے جو گاؤں سے دور ممبئی میں رہتا ہو۔ یہی کہانی کے کردار ہیں جن کے اطراف سلام بن رزاق نے ایک طویل کہانی کو بنا ہے۔ اس میں خاندانی محبتیں بھی ہیں، اپنی اپنی ذمے داریاں بھی ہیں اور ایک آفت نا گہانی بھی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ملک میں بار بار فسادات ہو رہے تھے اور مسلمان اس ظلم کو بار بار جھیل رہے تھے۔ رضوان کو ممبئی میں اطلاع ملتی ہے کہ دھرم پور میں پھر ایک بار فساد ہوا ہے۔ وہ اپنے اکلوتے چچا ہاشم علی اور ان کے لواحقین کی خیریت جاننے کے لیے دھرم پور پہنچتا ہے۔ اس بار سب ہی خیریت سے تھے لیکن دو سال پہلے جو فساد ہوا تھا اس میں اس کا نوجوان چچازاد بھائی ارشد مارا گیا تھا۔ اس کی نوجوان بیوی اس کے سامنے سفید لباس میں دکھائی دیتی ہے، اسے اس روپ میں دیکھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ فساد تھم گیا تھا لیکن اب بھی کرفیو جاری تھا۔ چچا ہاشم علی اس کرفیو میں بھی عشا کی نماز پڑھنے اپنی خاندانی مسجد میں جاتے کیونکہ وہ گھر سے بہت قریب ہے۔ تین دن کے بعد رضوان ممبئی واپس ہو جاتا ہے اور اپنے بیوی بچوں میں مصروف ہو جاتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد دھرم پور میں پھر فساد ہو جاتا ہے اور ہاشم چچا کا خط رضوان کو ملتا ہے کہ وہ جلد آنے کی کوشش کرے اور وہ پھر ایک بار گاؤں پہنچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بار گھر پر بھی حملے کی کوشش کی گئی تھی بلکہ جلانے کی کوشش بھی ہوئی تھی لیکن ارشد کے ہندو دوست وکرم نے بہت ساتھ دیا تھا۔ رضوان کو وکرم یاد آتا ہے کہ ارشد کی موت کے بعد جب وہ گاؤں آیا تھا تو اس سے ملاقات بھی ہوئی تھی اور اس نے کہا تھا:

''رضوان بھائی! آپ وشواس رکھیے۔ میں پوری کوشش کروں گا ارشد کے قاتلوں کا پتہ چلانے کی۔''

''وکرم صاحب! اب اس غیر ضروری تسلی سے کوئی فائدہ نہیں آج تک فسادات میں قتل کرنے والوں کا کبھی کوئی سراغ ملا ہے جو آپ کو مل جائے گا۔ آپ کس کس کو پکڑیں گے اور سزا دیں گے اور پھر قاتلوں کو پکڑ بھی لیں تو آپ میرا بھائی تو مجھے لوٹا نہیں سکتے۔ نہیں وکرم صاحب نہیں... آپ کچھ نہیں کر سکتے۔''

وکرم شاید اس کے لہجے کی تلخی کو بھانپ گیا تھا، نادم ہو کر بولا، ''میں آپ کا دکھ سمجھ سکتا ہوں رضوان بھائی... ارشد آپ ہی کا نہیں میرا بھی بھائی تھا۔ اس کی موت سے میرا بھی ایک بازو کٹ گیا ہے۔ اس کے باوجود آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم لوگ کچھ نہیں کر سکتے۔''

(افسانہ، آندھی میں چراغ، کتاب، شکستہ بتوں کے درمیان، ص 35)

فسادات کیوں ہوتے ہیں اور اس کے پیچھے کیا مقاصد ہوتے ہیں سلام نے نہایت واضح انداز میں اس کی پول کھول دی ہے۔

جس مقصد کے لیے رضوان کو ہاشم علی نے بلوایا تھا وہ اسے بتاتے ہیں کہ ان فسادات نے زندگی اجیرن کر دیا ہے۔ خاندانی مسجد جسے اس کے پرکھوں نے بنوایا تھا وہ اب بہت شکستہ ہو چکی ہے، وہ کسی بھی وقت ڈھے سکتی ہے لیکن مجھے اس کا خوف نہیں ہے کیونکہ وہ اللہ کا گھر ہے وہی اس کی حفاظت کرے گا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی کھیتی باڑی کو بیچ دیتا ہوں جس سے مجھے پانچ لاکھ روپیہ آئے گا۔ وہ رقم میں صحیفہ (راشد کی بیوہ) اور بچے کے نام جمع کر دوں گا، اور میری خواہش ہے کہ تم اس سے نکاح کر لو اور اسے اور اس کے بچے کو یہاں سے ممبئی لے کر چلے جاؤ اور منا کو خوب پڑھاؤ لکھاؤ۔ رضوان یہ بات سن کر سکتے میں آجاتا ہے تو چچا بتاتے ہیں میں نے اس کے لیے صحیفہ کو بھی راضی کر لیا ہے۔ رضوان اسی وقت صحیفہ کی طرف دیکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے جیسے اس کی آنکھیں حیا سے بند ہو رہی ہیں۔ رضوان کی خاموشی دیکھ کر چچا کہتے ہیں تم ممبئی جاؤ اور تمھاری بیوی کو بھی سمجھاؤ مجھے یقین ہے ان حالات کو دیکھتے ہوئے وہ راضی ہو جائے گی۔

دوسرے دن رضوان ممبئی کے لیے روانہ ہو جاتا ہے اور جیسے ہی اس کا رکشہ ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوتا ہے صحیفہ اسے الوداع کہتی ہے۔ لیکن وہ سوچتا ہے:

''رکشہ گھر کے پچھواڑے سے گھوم کر بڑی سڑک پر چلا تو اس نے دیکھا کہ پچھواڑے کے دروازے میں صحیفہ منے کو گود میں لیے کھڑی اس کے رکشے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خدا حافظ کہا۔ وہ بھی منے کا ہاتھ ہاتھ میں لیے الوداع کہہ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی مسکراہٹ تھی اس کا رکشہ پھٹ پھٹ کرتا تیزی سے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا مگر اسے لگ رہا تھا کوئی زبردست قوت اسے پیچھے کی طرف کھینچ رہی ہے۔ صحیفہ اور منا کا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا صحیفہ ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہہ رہی تھی۔ مگر وہ اسے الوداع کہاں کہہ رہی تھی وہ تو اسے واپس بلا رہی تھی۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی اسے روزی اور بچے یاد آگئے معاً روزی کے غصے سے تمتمایا ہوا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ وہ کسی خونخوار شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ اور صحیفہ کا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔ مگر وہ دھندلاتے دھندلاتے بھی سات پردوں سے روزی کے چہرے پر امپوز ہو رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں اور سینے میں ایک تلاطم سا پیدا ہوا، اچانک اسے لگا وہ رونا چاہتا ہے، پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا ہے۔ اس نے محسوس کیا ہزار ضبط کے باوجود آنسوؤں کا ایک تیز و تند سیلاب اس کی پلکوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

(افسانہ، آندھی میں چراغ، کتاب، شکستہ بتوں کے درمیان، ص 45)

سلام بن رزاق کی یہ ایک بہت عمدہ کہانی بن سکتی تھی لیکن غیر ضروری طوالت اور جزئیات نگاری نے اس کے تاثر کی شدت کو قاری پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ اسی طرح افسانہ 'آواز گریہ' کا بھی یہی حال ہوا۔

سلام بن رزاق کا ایک افسانہ جس کا عنوان 'خبر' ہے۔ یہ افسانہ ان کی سیاسی بصیرت کا ایک عمدہ افسانہ ہے کہ سیاست داں اور انتظامیہ کا سربراہ بھولی بھالی عوام کو کس طرح اصل موضوع سے بہلا کر ان کی توجہ دوسری طرف بھٹکا دیتے ہیں۔ یہ پورا افسانہ مکالموں کے ذریعے مکمل ہوا ہے۔

سلام بن رزاق کے تیسرے افسانوں کے مجموعے کے چند اہم افسانوں پر ہم نے گفتگو کی ہے۔ ان میں بعض افسانے یقیناً بہت عمدہ ہیں۔ ان افسانوں میں سلام نے منظر نگاری اور کردار سازی میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ ان کا بیانیہ بے حد کسا ہوا ہے۔ اور حقیقت پسندانہ اسلوب اختیار کرنے کے باوجود بھی علامتیں در آتی ہیں جو افسانے میں گہرائی و گیرائی پیدا کرتی ہیں۔ ان کی نثر رس دار ہے الفاظ کا استعمال وہ بہت سوچ سمجھ کے ساتھ کرتے ہیں جس کی وجہ سے تحریر میں مطالعاتی وصف پیدا ہو جاتا ہے اور قاری ایک بیٹھک ہی میں پورا افسانہ پڑھ لیتا ہے۔ یہ سلام بن رزاق کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

■

Noorul Husnain
1- 12- 31, Pragati Colony
Ghai, Aurangabad - 431001 (M.S)
Mob.:9284606318

سلام بن رزاق
به حیثیت افسانہ نگار کا اختصاص

صفدر امام قادری

جدیدیت کے علم بردار ادبا کے ساتھ ساتھ 1970 کے بعد جن افسانہ نگاروں نے رفتہ رفتہ خود کو ایک نئے اور مختلف اظہاریے کی طرف موڑنے میں کامیابی پائی، ان میں سلام بن رزاق سرخیل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے بعد کے افسانہ نگاروں میں شوکت حیات، شفق، حسین الحق، ساجد رشید، سید محمد اشرف، طارق چھتاری اور عبد الصمد وغیرہ نے بھی اس بدلتے ہوئے افسانوی اسلوب کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اولاً سب کے سب جدیدیت بردار قافلے کے سفیروں میں انھی مخصوص موضوعات اور اسلوب کے ساتھ پہنچے تھے لیکن ایک دہائی بھی نہیں گزری ہوگی کہ جدید افسانوں کی نامقبول دنیا سے نکل کر کسی دوسری فضا اور کیفیت کی تلاش میں یہ لوگ منہمک ہوگئے۔ اس دوران کھلے طور پر یہ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، بلراج مین را اور احمد ہمیش کے افسانوی سرمائے سے یکسر مختلف ایک نئی دنیا خلق ہونے لگی ہے۔ جدیدیت کے بعض نقاد اور کچھ رسائل کے مدیران بھی اس خاموش تبدیلی کو شاید ہی بروقت سمجھ سکے۔ دیکھتے دیکھتے ایسے دوسرے رسائل اور مدیران کے ساتھ ساتھ نئے نقادوں کی صف سامنے آنے لگی جو اس نئے افسانوی بیانیے کو اسلوب آئندہ کے طور پر پہچاننے کی کوشش کرے۔ کہنا چاہیے کہ جدیدیت کی تربیت گاہ سے ایک مختلف طرز کی افسانہ نگاری کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور کم از کم افسانے کی حد تک 1970 کے بعد کی نسل ایک نئی تاریخ گڑھنے کے لیے بڑی تعداد میں میدانِ عمل میں کود چکی تھی۔

جدید افسانے کے معتبر نقاد اور محققین نے تجرید اور علامت کو نشان زد کر کے اس عہد کے نئے افسانوں کے امتیازات واضح کیے تھے۔ 1960 کے پہلے تک ترقی پسند افسانہ نگاروں کی وہ کہکشاں جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی جسے پریم چند کے بعد افسانہ نگاروں کی سب سے توانا اور مقبول نسل تسلیم کیا جاتا ہے۔ 1936 سے 1960 کے بیچ معتبر افسانہ نگاروں کی ایک سرسری فہرست بھی تیار کیجیے تو ان میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، دیویندر ستیارتھی، بلونت سنگھ، قرۃ العین حیدر، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی اور اپندر ناتھ اشک وغیرہ کے نام بیک نظر سامنے آجائیں گے۔ ان میں سے اکثر کا اسلوب اور افسانوی تکنیک بلاشبہ ایک دوسرے سے مختلف ہے اور پریم چند کی مقبول افسانوی پہچان کے فوراً بعد اس نسل نے ادب کی موضوعاتی دنیا میں انقلاب آفریں تبدیلیاں کر دیں۔ اس نسل نے روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں سے بھی استفادہ کیا لیکن ان کی حیرت انگیز مقبولیت کی پشت پر پریم چند کا آزمایا ہوا وہی بیانیہ سایہ فگن رہا جس میں حسب ضرورت رد و بدل کر کے اس نسل کے افسانہ نگاروں نے اس بیانیے میں توسیع کی تھی اور اپنے عہد کے افسانے کو قبولِ عام کے درجے تک پہنچایا تھا۔

جدیدیت کے عہد میں ابھرنے والے بعض ابتدائی افسانہ نگاران بزرگوں کے ذرا پیچھے چل رہے تھے۔ غیاث احمد گدی، اقبال مجید، رتن سنگھ اور قاضی عبد الستار جیسے اصحاب قلم نے 1960 سے پہلے اچھا خاصا لکھ لیا تھا اور متواتر لکھنے کی وجہ سے ان کی ایک ادبی پہچان بھی قائم ہونے لگی تھی مگر جدیدیت کے بدلتے اسلوب اور نئے ہم عصروں کی ہم رکابی میں ان سب کے یہاں بھی خالص جدید تبدیلیاں آئیں مگر ان جیسے چند لوگوں نے اس بات کا دھیان رکھا کہ علامت یا تجرید کو اپنے فن کی شکست یا تبلیغ نہیں مانیں گے بلکہ فطری طور پر موضوع و اسلوب کی تبدیلیوں کا سلسلہ چلنا چاہیے۔ اسی اندازِ نظر کی ترجمانی و طرف داری کا ایک ابتدائی شعور مذکورہ افراد میں موجود تھا۔ ان چند لکھنے والوں کی آنکھیں اس وقت پھٹی رہ گئیں جب انھوں نے دیکھا کہ اپنے بعد کے لکھنے والوں میں متعدد افراد فیشن زدہ جدیدیت کے پہلو سے ایک نئی راہ کی تلاش میں کامیاب ہو رہے تھے۔ یہ نئی نسل بے شک سلام بن رزاق اور ان کے دوسرے ہم عصروں اور کم عمر ساتھیوں کی وجہ سے میدانِ عمل میں اپنی صلاحیت کا اظہار کر رہی تھی۔

اس وقت یہ افسانہ صرف بیانیہ کی سطح پر تبدیل نہیں ہو رہا تھا، اسلوب اور موضوع بھی بدلنے لگے تھے اور ہر پڑھنے والا یہ سمجھ سکتا تھا کہ سلام بن رزاق یا ان کے دیگر ہم عصروں کے افسانوں میں ایک طرف علامتیں بتدریج گھٹتی جا رہی ہیں تو دوسری طرف اپنے عہد کے پیچیدہ حقائق کے اظہار کے باوجود بیانیہ کچھ اس انداز سے مرتب کیا جا رہا ہے کہ اس کا ایک سرا ترقی پسند افسانے اور خاص طور پر پریم چند کی سادگی اور شفافیت سے جڑ

سلام بن رزاق نے یوں تو 1964-65 کے زمانے سے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی اور مختلف رسائل میں رفتہ رفتہ ان کے افسانے بھی شائع ہوتے رہے لیکن 1970 کے بعد رسائل و جرائد میں ان کے ایسے افسانے آنے لگے جو جدیدیوں سے مختلف تو تھے ہی; مکمل طور پر ایک نیا ذائقہ یا تصور بھی پیش کر رہے تھے۔

جائے۔ یہی بات کافی تھی کہ 1970 کے بعد کے افسانے بلراج مین را اور احمد ہمیش کے انداز و اسلوب سے مختلف معلوم ہونے لگے تھے مگر اس سے بڑھ کر بھی چند ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کی وجہ سے نیا افسانہ مزید بااعتبار ہوا۔ یہ بات اکثر افراد کے ذہن میں موجود ہوگی کہ جدید افسانوں میں کائنات اور زندگی کے مسائل کی شمولیت کے محدود مواقع تھے۔ پھر پیش کش کا انداز بھی کچھ اتنا اشاراتی تھا کہ اگر وہ عہد کسی طرح نظر بھی آ رہا تھا تو عکس بے حد دھندلے تھے۔ ترقی پسندوں سے داخلی مخاصمت بھی ایک خاص بات تھی جس کی وجہ سے جدید افسانہ نگاروں نے زندگی اور عہد کے مسائل سے ذرا دور کا رشتہ رکھا۔ نئے افسانہ نگاروں نے اس صورتِ حال کا ہوش مندانہ جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی کوشش کی کہ ایک نیا افسانوی ماحول پیدا ہو سکے۔

سلام بن رزاق نے یوں تو 1964-65 کے زمانے سے افسانہ نگاری شروع کر دی تھی اور مختلف رسائل میں رفتہ رفتہ ان کے افسانے بھی شائع ہوتے رہے لیکن 1970 کے بعد رسائل و جرائد میں ان کے ایسے افسانے آنے لگے جو جدیدیوں سے مختلف تو تھے ہی; مکمل طور پر ایک نیا ذائقہ یا تصور بھی پیش کر رہے تھے۔ اپنے ہم عصروں میں تقریباً سب سے پہلے ان کا افسانوی مجموعہ شائع ہوا جس کا عنوان 'ننگی دوپہر کا سپاہی' تھا۔ اس مجموعے میں پندرہ افسانے شامل تھے جن میں سے نصف سے زائد افسانے لازمی طور پر ایسے تھے جنھیں ایک مدت تک مابہ الامتیاز ہونے کی وجہ سے اکثر قارئین اور ناقدین نے توجہ سے پڑھا۔ بعد کے زمانے میں سلام بن رزاق کے لیے جو افسانے شناخت نامہ بنے، ان میں خاص طور پر درج ذیل تحریریں ہیں جنھیں ستر کے بعد کی نسل کا حقیقی اعتبار قرار دیا جاتا ہے: واسو، بٹا، بجوکا، کالے ناگ کے پجاری، ایک بکھوتی کہانی، ننگی دوپہر کا سپاہی اور انجام کار جیسے افسانے سلام بن رزاق نے اپنی افسانوی زندگی کے آغاز میں ہی لکھ لیے تھے۔ 'ننگی دوپہر کا سپاہی' 1970 کے بعد کے افسانے اور افسانہ نگاروں کے لیے ایک رہ نما کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ بات کھلے طور پر قبول کرنی ہے کہ سلام بن رزاق نے جدید افسانے کے پورے نظام سے مراجعت کرتے ہوئے اپنے ہم عصروں یا بعد میں آنے والے افسانہ نگاروں کے لیے ایک Point of Departure تیار کیا، اس لیے انھیں 1970 کے عہد میں نئے افسانے کی تشکیل کے لیے ماحول سازی اور ادبی نمونہ پیش کرنے کی ذمے داری بھی از خود ملی جسے انھوں نے اپنی تخلیقی خوبیوں کی بدولت استحکام بخشا۔ بے شک جدیدیت سے نکل کر ایک نئی ادبی دنیا اور ایک نئے ادبی ماحول کو تیار کرنے میں سلام بن رزاق اکیلے نہیں تھے۔ اس وقت نئے افسانے کی تعمیر و تشکیل میں ساجد رشید، انور خان، حسین الحق، عبدالصمد اور سید محمد اشرف اور دیگر افراد کی کوششیں بھی کارگر رہیں اور سب نے مل کر جدیدیت سے الگ وہ افسانوی نظام تیار کیا جو کم و بیش 1980 اور 1990 کی دہائی میں بھی اپنی موثر موجودگی درج کراتا رہا تھا۔

سلام بن رزاق نے زیادہ تعداد میں افسانے نہیں لکھے۔ چار افسانوی مجموعوں میں 62-60 افسانے شامل ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی طرح انھوں نے تعداد کے اعتبار سے زیادہ لکھنے پر توجہ نہیں کی۔ ان مجموعوں میں شاید ہی کوئی افسانہ طویل ہو۔ انھوں نے کچھ ترجمے اور کچھ درسی کتابیں تخلیقی وقفوں میں پیش کیں۔ کمال یہ ہے کہ ناول تو ایک بھی نہیں لکھا۔ ناول کے ترجمے البتہ وہ کرتے رہے۔ بیدی کی طرح انھوں نے طویل مختصر کہانی بھی نہیں لکھی۔ ان کے زمانے میں ان کے اکثر ہم عصروں نے مختصر یا طویل ناول لکھنے کی کوشش کی مگر سلام بن رزاق نے غالباً قصداً ناول نگاری کے کوچے کی سیاحی نہیں کی۔ ان کے ہم عصروں میں شوکت حیات نے ایک مدت تک انھی کی طرف صرف افسانہ نگاری کو اپنے تخلیقی کاموں کے مرکز میں رکھا تھا مگر ایک خاص تخلیقی عالم میں انھوں نے ایک ناولٹ 'سرپٹ گھوڑا' لکھ ہی دیا۔ سلام بن رزاق نے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے بھی اس میدان میں اترنا گوارا نہیں کیا۔ اگرچہ منٹو نے ایک ناولٹ لکھ دیا تھا مگر وہ اول و آخر افسانہ نگار ہیں۔ بیدی نے مختصر ناولٹ لکھا، ادبی حلقے سے انھیں اس کے لیے داد بھی بہت ملی مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بیدی بھی مکمل طور پر افسانہ نگار ہیں۔ سلام بن رزاق بھی بے شک اول و آخر افسانہ نگار ہیں۔

سلام بن رزاق نے پہلے مجموعے میں ہی اس بات کا اشارہ دے دیا تھا کہ وہ عام انسانی معاشرے میں اپنے لیے نئی، انوکھی اور انجانی کہانیوں کی دنیا تلاش کرنے کی مہم میں ہیں۔ اس زمانے میں اجنبی اور عجیب الخلقت کرداروں کی پیش کش قدرے مبہم انداز میں کر کے کہانی کو انجام تک پہنچانے کی کوشش ہوتی تھی۔ غیاث احمد گدی

سلام بن رزاق نے غالباً راجندر سنگھ بیدی کی افسانوی دنیا کے ان اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی کہ بڑی بڑی اور حیرت انگیز کہانیاں ہمارے آس پاس کے بے نام کرداروں میں پوشیدہ ہیں۔ بیدی نے عام انسانی گھروں کے بیچ سے اپنی کئی لازوال کہانیاں نکال کر پیش کر دی تھیں۔ سلام بن رزاق نے بھی افسانہ نگاری کے اس نئے طور کو اپنے لیے رہ نما سمجھا۔

نے کچھ ایسے افسانوی کردار خلق کیے جو بے نام سماج سے آتے تھے جن کی کوئی اپنی زندگی نہیں تھی۔ انھوں نے حسبِ ضرورت ایسے کرداروں کا سماجی اور نفسیاتی مطالعہ بھی کیا مگر سلام بن رزاق نے بے نام اور بے زبان معاشرے کے چلتے پھرتے کسی بھی کردار کو سامنے رکھ کر اس کی کہانی بیان کرنے کا انداز اختیار کیا۔ پریم چند کے یہاں جاگیردارانہ عہد میں ابھی بے آواز معاشرے کی بہت حد تک پہچان بھی نہیں ہوئی تھی اور جاگیردارانہ نظام

کے تحت معیشت کی بنیاد پر طبقات کی پہچان کا ایک مخصوص انداز سامنے آتا تھا۔ سلام بن رزاق نے غالباً راجندر سنگھ بیدی کی افسانوی دنیا کے ان اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی کہ بڑی بڑی اور حیرت انگیز کہانیاں ہمارے آس پاس کے بے نام کرداروں میں پوشیدہ ہیں۔ بیدی نے عام انسانی گھروں کے بیچ سے اپنی کئی لازوال کہانیاں نکال کر پیش کر دی تھیں۔ سلام بن رزاق نے بھی افسانہ نگاری کے اس نئے طور کو اپنے لیے رہ نما سمجھا۔

سلام بن رزاق نے نئی سماجی حقیقت نگاری کو ہی اپنی افسانہ نگاری کے بدل کے طور پر رکھا۔ ایک تخلیقی فن کار بالخصوص افسانہ نگار کے لیے موضوعات، واقعات اور کردار کی بنیادی اہمیت اپنی جگہ مگر چوں کہ وہ نہ مورخ ہیں اور نہ ہی صحافت پیشہ۔ اس لیے انھیں معلوم ہے کہ ایک افسانہ نگار کی تخلیقی ذمے داریاں اس حقیقت نگاری سے سوا ہوتی ہیں۔ یونانی عہد سے ہی تخلیق کی بنیاد میں تخیل کو پیوست مانا گیا ہے۔ سلام بن رزاق تخیل کی دولت سے کس درجہ مالا مال ہیں اور وہ اپنے اصل اور افسانوی کرداروں کی زندگی میں حقیقت اور گمان کے احوال کس مہارت سے شامل کرتے جاتے ہیں، اس کی قدرت کے لیے ان کا مشہور افسانہ 'معبر' ملاحظہ کرنا چاہیے۔ حقیقت میں یہ سیاسی بنیاد پر قائم ہوا افسانہ ہے مگر کہانی بننے کے عمل میں یہ ایک مکمل تخیلاتی شہ پارہ بن گیا ہے۔ یہ سلام بن رزاق کے دوسرے افسانوی مجموعے کی اہم ترین کہانی بھی ہے جسے افسانہ نگار نے اسی نام سے شائع کیا۔ 'معبر' کو اس بات کی سزا دی جا رہی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتاتا ہے۔ بہ ظاہر یہ کوئی ایسا جرم نہ ہونا چاہیے جس کی سزا مقرر ہو۔ سلام بن رزاق نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس معاشرے میں خواب دیکھنے پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے مگر جب لوگ سوتے وقت جو خواب دیکھتے ہیں، ان کی الگ الگ تعبیریں وہ معبر کیوں پیش کرتا ہے؟ حقیقی زندگی کی تعبیروں کی کون کہے، خواب کی انجانی اور غیر حقیقی تعبیریں ہی قابل سزا ہو چکی ہیں۔ کہانی میں ایک سطح طنزیہ اور ظریفانہ بھی ہے جس سے لطفِ بیان اور لہجے کی معصومیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسی کہانی صرف شفاف حقیقت نگار نہیں پیش کر سکتا ہے۔

ابتدائی زمانے میں ہی سلام بن رزاق نے اپنی مشہور کہانی 'بجوکا' لکھی تھی۔ بعد میں اس عنوان سے کئی افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیاں لکھیں اور باضابطہ طور پر افسانوی موضوع یا علامت کی نئی روایت کے حوالے سے اسے قبول کیا گیا۔ ایسے تمام افسانوں کو ڈاکٹر قمر علی نے اپنے

سلام بن رزاق تخیل کی دولت سے کس درجہ مالا مال ہیں اور وہ اپنے اصل اور افسانوی کرداروں کی زندگی میں حقیقت اور گمان کے احوال کس مہارت سے شامل کرتے جاتے ہیں، اس کی قدرت کے لیے ان کا مشہور افسانہ 'معبر' ملاحظہ کرنا چاہیے۔

طویل مقدمے کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ سلام بن رزاق کو دیہی زندگی سے 'بجوکا' کی علامت ملی۔ سلام بن رزاق کو یہ بات معلوم تھی کہ دیہی زندگی کی وہ پریم چند کے انداز کی ترجمانی کر کے اردو افسانے کی تاریخ میں اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتے۔ اس لیے انھوں نے کہانی کا پورا مواد ہماری عام خاندانی زندگی سے چنا۔ عورت مرد کی گھریلو زندگی کے خواب اور شکستِ خواب کے بیچ پرت در پرت زندگی کس انداز سے ہمارا امتحان لیتی رہتی ہے اور ہم چاہے اَن چاہے کسی نہ کسی رنگ میں بدلتے جاتے ہیں؛ اسے 'بجوکا' کا مرکزی خاتون کردار شالو کے ارد گرد ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں زندگی کی باریک بینی کے ساتھ تجزیہ ہی نہیں ہے بلکہ ہماری عام گھریلو زندگی میں کتنی نفسیاتی گرہیں موجود ہیں، اس کا اندازہ اس افسانے سے پہلے اور کم از کم اس افسانے کے عنوان کو دیکھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس افسانے کے اتنے رُخ ہیں اور زندگی کے تضادات کی اتنی جہتیں ہیں کہ کوئی قاری آسانی سے اولین قرأت میں اس بلندی تک پہنچ کر افسانہ نگار کو اس کی معقول داد بھی نہیں دے سکتا۔ سلام بن رزاق نے مرکزی کردار شالو کو جس اہتمام سے فنی چابک دستی کے ساتھ یہاں قائم کیا ہے جیسے محسوس ہو کہ وہ ایک شہ کار گڑھ رہے ہیں۔ سیرابی اور عدم سیرابی، محرومی اور نا محرومی، رسم ورواج کی تابع داری یا ان سے نکل بھاگنے کی خواہش جیسی نہ جانے کتنی دیواریں بیچ بیچ میں کھڑی ہوئی ہیں۔ جس زمانے میں سلام بن رزاق نے یہ افسانہ لکھا، اس ضبط اور فنی احتیاط کے ساتھ شاید ہی کوئی دوسرا اس موضوع پر لکھ سکتا تھا۔ کمال تو یہ ہے کہ بیدی کے 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کی رقیق القلبی سے بھی سلام بن رزاق نے یہاں ہوش مندی کے ساتھ دامن بچایا ہے۔

'کالے ناگ کی پجاری'، 'پنّا' اور 'ننگی دوپہر کا سپاہی' کی بنیادی زمین سیاسی ماحول اور اس کے اثرات ہیں۔ ان افسانوں کے ظاہر میں سیاسی اشارے کم ہیں مگر اطلاق کی سطح پر سیاسی نظام کہیں نہ کہیں ان کی زندگیوں کے مرکز میں چلا آتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک ابتدائی کہانی 'ایک نکونی کہانی' بھی ہے۔ سلام بن رزاق کے ہم عصروں میں شوکت حیات اور ساجد رشید نے سیاسی موضوعات کو اپنے افسانوں میں سب سے زیادہ برتنے میں کامیابی پائی۔ سلام بن رزاق کا ذہن سیاسی تفہیم و تجزیے کا متحمل تو ہے مگر وہ سیاست، سماج اور نفسیات کا ایک ایسا محلول تیار کرتے ہیں جس سے ان کا فکشن سارے سیاسی مفاہیم کے باوجود سیاسی اکھاڑا بننے کے درپے نہیں ہوتا۔ یہ ان کی فنی اعتبار سے ایسی کامیابی ہے جس کی کوئی دوسری نظیر شاید ہی مل سکے۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں ایک زمانے تک سیاسی موضوعات کھلے طور پر نظر نہیں آتے۔ وہ سب زیریں افسانوی لہروں میں دیکھے اور محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

2001 میں سلام بن رزاق کا تیسرا مجموعہ 'شکستہ بتوں کے درمیان' منظر عام پر آیا۔ دوسرے افسانوی مجموعے میں 'دود چراغ' کی شکل میں ایک ایسا افسانہ ضرور انھوں نے لکھا تھا جسے فرقہ واریت کے تناظر میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے مگر بعد کے دور میں یہ موضوع ملک کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کے پیش نظر سلام بن رزاق کے یہاں ایک مرکزی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ 'آوازِ گریہ' تو اس سلسلے سے ان کا شہ کار افسانہ ہے جس میں فرقہ وارانہ صورت کی بدلتی جہات پر قصے کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ سلام بن رزاق کے ابتدائی افسانوں میں ملک کی بدلتی ہوئی مذہبی صورتِ حال اور اس کے تکلیف دہ اثرات کے بارے میں کچھ زیادہ لکھا ہوا نہیں ملتا مگر 'معبر' کی اشاعت کے بعد سے ان کے یہاں سماجی اور سیاسی صورتِ حال کی تبدیلیوں کے اشارے ملنے لگتے ہیں۔ غالباً یہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کوئی بھی فن کار اپنے عہد کی تبدیلیوں سے زیادہ دیر تک بے رُخی یا لاتعلقی نہیں برت سکتا۔ اس سلسلے سے ان کے دوسرے افسانوں 'اندیشہ'، 'آندھی میں چراغ'، 'چادر'، 'چہرہ'، 'زمین'، 'باہم'، 'خبر' وغیرہ کو بہ غور تجزیے کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔

سلام بن رزاق کے تیسرے مجموعے میں ایک عجیب وغریب کہانی 'ابراہیم سقہ' ہے۔ یہ ایک بہشتی کی

زندگی کی کہانی ہے۔ اس کی جاں فشانی، فرض شناسی کے ساتھ ساتھ جس محبت سے اس کی جذباتی زندگی کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، وہ حیرت انگیز ہے۔ بڑے بڑے لوگوں اور نام ور زندگیوں کی کہانیاں لکھنے والے بہت سارے افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں مگر محروم و معدوم آبادیوں کی زندگی کو اس گہرائی اور انسانی سطح سے دیکھنے کا یہ کام واقعتاً شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ کرشن چندر کے افسانے 'کالو بھنگی' کی بہت شہرت ہے مگر زوال پذیر

اسلوب کی سطح پر سلام بن رزاق کے یہاں نہ کوئی شاعرانہ کیفیت ہے اور نہ ہی رواں دواں زور آور بیانیہ جس کے سحر میں پڑھنے والا گرفتار ہو جائے۔

معاشرے کے ایک فرد کی زندگی کو جس سلیقے سے 'ابراہیم سقہ' میں سلام بن رزاق نے پیش کیا ہے، وہ انھیں اردو افسانے کی تاریخ میں احترام سے دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اسی طرح کا ایک مختلف افسانہ 'شکستہ بتوں کے درمیان' ہے۔ افسانہ نگار کی قوتِ متخیلہ، فنتاسی اور فنونِ لطیفہ کے تئیں قلبی لگاؤ کا یہ ایسا نمونہ ہے جیسا ہمارے سرمایۂ افسانہ نگاری میں کہیں دوسری جگہ موجود نہیں۔ عالمی سطح پر جس Dying Culture کا تذکرہ ہوتا ہے اور یہ تصور کہ سارے فنون اور ہماری ساری زندگیاں تلف ہونے کے لیے ہی قائم ہوئی ہیں، اس کا ایک ہیبت ناک استعارہ یہ افسانہ ہے۔ 'گئودان' میں بھی پریم چند نے زراعتی سماج اور بالخصوص کسانوں کے زوال کا مرثیہ لکھا تھا۔ لیکن وہاں ایک امید بھی تھی کہ جاگیردارانہ سماج کا جہاز ایک نہ ایک دن ڈوب جائے گا اور ہماری جدوجہد آزادی سے ایک نئی معیشت اور نئی دنیا ضرور پیدا ہو سکے گی مگر 'شکستہ بتوں کے درمیان' افسانے میں کہیں جائے اماں نہیں ہے۔ چند صفحات کی یہ کہانی پوری انسانی تاریخ میں فنونِ لطیفہ کے ریاضت کاروں کا وہ مرثیہ ہے جہاں ہزاروں برس کی کاوشوں اور مشقتوں کی کوئی قدر دانی نہ ممکن ہو سکی۔ اردو شاعری نے میر کے حوالے سے احساسِ زیاں کی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ 'شکستہ بتوں کے درمیان' کا مائکل بھی اسی طرح اپنی ذات کے اندر لہو لہان ہے اور اپنے فن کے وارث اور قدر داں کی تلاش میں جی جی کر مرنے کے لیے مجبور ہے۔

سلام بن رزاق کے آخری مجموعے 'زندگی افسانہ نہیں' میں ایک کہانی 'استفراغ' ہے۔ یہ کہانی انسان کے شعور اور لاشعور کے بیچ کے رزم نامے کو پیش کرنے کے لیے بُنی گئی ہے۔ فنی احتیاط اور بیان کے نپے تلے انداز نے اس افسانے کو بکھرنے سے بچایا ہے۔ وہ کبھی اپنے مرکزی کردار کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور کبھی اس سے لاتعلق ہو کر دور سے زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ افسانہ نگار کے طور پر یہ حکمتِ عملی ایک عام بات نہیں کہ کرداروں کی زندگی بیان کرتے ہوئے حسبِ ضرورت فن کارانہ لاتعلقی پیدا کر لی جائے۔ سلام بن رزاق مشق کی ان منزلوں تک رفتہ رفتہ پہنچتے گئے جہاں انھیں معلوم ہو کہ کب انھیں اپنے کردار کے دفاع میں کھڑا ہونا ہے اور کب اس کی زندگی کو محض ایک تماش بین کے طور پر دیکھنا ہے۔ اسی صلاحیت سے ان کے افسانے فنی طور پر موضوعاتی پروپیگنڈا یا واقعاتی کولاج بننے سے محفوظ رہتے ہیں اور وہ فکشن کی ایک نرم اور نازک مٹی پر اگنے والے تازہ پودوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔

سلام بن رزاق نے متوسط طبقے سے زیادہ پسماندہ، محروم اور زوال پذیر طبقات کی کہانیاں لکھیں۔ ان طبقات کی زندگیاں ایک طویل مدت سے ضرر پذیر اور مرگ آشنا رہی ہیں۔ جمہوری اداروں نے ہماری تربیت ضرور کی مگر انصاف کی ڈور ابھی بھی ایسے ہاتھوں میں ہے جہاں سے ان زوال آمادہ لوگوں کو انصاف نہیں مل سکتا۔ سماجی اعتبار سے ان مشکل طبقوں کی حقیقی زندگی کی جانچ پڑتال اور ان کے بیچ جگہ جگہ پیدا ہو رہی کہانیوں کو سلام بن رزاق نے زبان دی۔ اسلوب کی سطح پر سلام بن رزاق کے یہاں نہ کوئی شاعرانہ کیفیت ہے اور نہ ہی رواں دواں زور آور بیانیہ جس کے سحر میں پڑھنے والا گرفتار ہو جائے۔ سلام بن رزاق نے جس انداز کے معاشرے کو اپنا موضوع بنایا، اس کے لیے یہ سب سے زیادہ موزوں تھا کہ وہ بیان کا نہ کوئی پُر پیچ انداز اپنائیں اور نہ ہی زبان کی شاعرانہ جہت کو آزمائیں۔ ان کے لیے یہی مناسب تھا کہ سادہ بیانیے کو اپنی مشق و ریاضت کی بھٹی میں تپا کر نئی اور مشکل زندگیوں کا حصہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کریں۔ یہ ہنر ان کے یہاں ابتدائی دور سے لے کر آخر تک موجود رہا۔ انھوں نے فیشن کے طور پر روز نئے نئے موضوعات کی تلاش کے مقابلے میں اپنی جانی پہچانی دنیا میں رہ کر مزید گہرائی اور وسعت کے ساتھ اس ماحول کی پیش کش کو اپنا شعار بنایا۔ سلام بن رزاق کے اکثر و بیشتر کردار محروم طبقوں سے آتے ہیں۔ زندگی کی چھوٹی بڑی جنگیں وہ روز لڑتے رہتے ہیں۔ اکثر انھی مبارزتوں میں اور بے نام جنگوں میں تلف بھی ہو جاتے ہیں۔ بعض نقادوں نے سلام بن رزاق کے افسانوں کے اس پہلو پر ایک سوالیہ نشان بھی قائم کیا ہے۔ سلام بن رزاق کی بنیادی تربیت سیاسی نہیں تھی اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ افسانوں کو کھلے طور پر سیاسی بنانے سے ان کا فن مجروح ہوگا۔ سلام بن رزاق نے جن چالیس پچاس برسوں میں اپنے افسانے لکھے، اس دوران ایسے لوگوں کی زندگی میں کوئی ایسی قابلِ ذکر یا انقلابی تبدیلی نہیں آئی۔ یہ آدھی صدی محروم طبقات کی پسپائی سے جدوجہد میں گزرتی ہوئی زندگی سے عبارت ہے۔ ان کی تربیت اگر ترقی پسندانہ ہوتی تو اپنے افسانوں میں وہ جگہ جگہ نئے سویرے کا اعلان کرتے مگر انھوں نے اس مژدۂ جاں فزا کے اظہار سے اس وجہ سے بھی خود کو روکا کیونکہ سماجی تبدیلی اور ارتقا کے سفر میں ابھی وہ پڑاو واضح نہیں ہے۔ ابھی جدوجہد، شکست اور زیاں در زیاں کے حالات ہیں مگر وہ ان طبقات کو سرگرمِ عمل ہوتے ہوئے

سلام بن رزاق کے آخری مجموعے 'زندگی افسانہ نہیں' میں ایک کہانی 'استفراغ' ہے، یہ کہانی انسان کے شعور اور لاشعور کے بیچ کے رزم نامے کو پیش کرنے کے لیے بُنی گئی ہے۔

اور اپنی زندگی کے تصورات اور خوابوں کی تشکیل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہوری نے زندگی میں تھوڑا بہت ہی پایا مگر اس کے آس پاس کی زندگیوں نے نئی صورتِ حال کی طرف بڑھنے کے اشارے پائے تھے۔ سلام بن رزاق کے افسانوں میں شفاف حقیقت نگاری کے بجائے داخلی سطح پر سماج کے محروم طبقات کی جدوجہد کا افسانہ مسلسل چلتا رہتا ہے۔ یہ ایسی حقیقی کہانیاں ہیں جو تصور اور تخیل سے بڑھ کر ہمارے عہد کا فکر و فلسفہ بن جاتی ہیں۔ اسی لیے سلام بن رزاق کو گذشتہ پچاس برسوں میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں کا حقیقی نمائندہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

■

Safdar Imam Quadri
202, Abu Plaza, NIT More, Ashok Rajpath,
Patna-800006 (Bihar)
Mob:09430466321,07903688448
Email: safdarimamquadri@gmail.com

سلام بن رزاق
زندگی جو افسانہ ہے

رحمن عباس

گوشۂ سلام بن رزاق

'سلام بن رزاق اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔' یہ جملہ لکھنا میرے لیے آسان نہیں ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں یہ بات تسلیم نہیں کرسکتا کہ وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ آدمی ہو یا ادیب ایک دن مرنا ہے۔ جسم کو مٹی ہو جانا ہے۔ ہم آج ہیں، کل نہیں ہوں گے۔ آج مٹی کی جون میں ہیں، کل مٹی میں لوٹ جائیں گے۔ لیکن سلام بن رزاق نے مٹی کی اس کایا میں جو زندگی گزاری اور جو ادب تخلیق کیا وہ انھیں سلام بن رزاق بناتی ہے۔ وہ ادب باقی ہے اور ایک عرصہ یاد رہے گا۔ نئے اذہان انھیں نئے انداز میں دریافت کریں گے۔ ان کے افسانوں اور جس عہد میں انھوں نے افسانے لکھے ان پر گفتگو کریں گے۔ چنانچہ میں یہ کہوں گا وہ ہمارے درمیان ہیں اور رہیں گے۔ جس طرح ہمارے بڑے فکشن نگار انتقال کے برسوں بعد بھی ہمارے ساتھ اور درمیان ہیں۔ سلام بھائی پر اس وقت لکھنا میرے لیے آسان نہیں ہے۔ میرا ان سے رشتہ یوں تھا جیسے نافرمان بیٹے اور شفیق باپ کے مابین ہوتا ہے۔ میری تمام حماقتوں کے باوجود مجھے ان کی شفقت نصیب رہی، رہنمائی کرتے رہے، مشورے دیتے رہے۔ گزشتہ بیس پچیس برسوں کا ساتھ رہا ہے۔ دو دہائیوں تک وہ میرے پڑوس میں مکین تھے۔ یہ سلسلہ تب رکا جب انھوں نے تین سال پہلے شہر کے دوسرے حصے میں سکونت اختیار کی۔ البتہ فون پر گفتگو ہوتی رہتی۔ انتقال سے تقریباً سال بھر پہلے بات کرنا ان کے لیے مشکل ہوگیا تھا۔ دو مہینے تین مہینے پہلے یکا یک چند روز کے لیے اسپتال میں ایڈمٹ کیا گیا تھا۔ میں عیادت کرنے نہیں جا سکا۔ اسپتال سے جب گھر وہ آئے، چند روز بعد فون کیا۔ میں نے اپنی مجبوری بتائی، کہا، کسی دن ملیں گے۔ ان کے استفسار پر بتایا کیا لکھ پڑھ رہا ہوں۔ خوش ہوئے، کہا اچھا ہوتا جب صحت ٹھیک تھی ناول لکھ لیتا۔ ان کے ذہن میں ایک ناول کا خاکہ تھا لیکن اب ہاتھوں میں حرکت نہیں تھی۔ تین چار مہینے پہلے ڈاکٹر سے ملنے یا کسی دوسرے کام سے میرا روڈ آئے۔ مجھے شام پانچ بجے ملنے کو بلایا۔ میں پہنچ گیا۔ جب انھیں دیکھا تو اندازہ ہوا صحت میں گراوٹ تیز ہوگئی ہے۔ وہ پارکنسن کے مرض میں مبتلا تھے۔ علاج جاری تھا لیکن دوائیں اثر نہیں کر رہی تھیں۔ چنانچہ اب رکشے میں مدد کے بغیر سوار ہونا ان کے لیے مشکل تھا۔ یہ منظر دیکھنا آنکھوں پر گراں بار تھا۔ میں دوسری طرف سے رکشے میں گیا۔ ان کی مدد کی۔ میری آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ میں نے اس شخص کے ساتھ دو دہائیوں میں کتنا یادگار وقت گزارا تھا۔ رات رات بھر محفلیں سجی تھیں۔ ان کی گفتگو میں کیسی بلا کی خود اعتمادی دیکھی تھی۔ کیسی انجانی قوت تھی ان کے اندر جو انھیں اپنے موقف پر کمزور ہونے نہیں دیتی تھی۔ لیکن آج وہ نحیف اور کمزور تھے۔ بات کرتے تو رال ایک طرف سے قمیض پر گر جاتی۔ آنکھوں میں جانے کیوں پانی دکھائی دیتا تھا۔ یہ پانی تھا یا آنسو تھے؟ رکشے سے کسی طرح وہ اترے۔ اب ایک قدم کے بعد دوسرا قدم رکھنے میں انھیں بیس پچیس سکینڈ درکار تھے۔ رفتہ رفتہ ہم ایک میز پر جا کر بیٹھے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ ان کی یادداشت متاثر نہیں ہوئی تھی۔ ان کا سینس آف ہیومر جوں کا توں تھا۔ گدھے کو گدھا کہنا جانتے تھے۔ قہقہہ لگا کر ہنسنا نہیں بھولے تھے۔ اس آخری ملاقات کے بعد میں ڈر گیا تھا۔ میں انھیں دیکھنا اور ان سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ میں انھیں اس حالت میں کیسے دیکھتا؟ میرے لیے مشکل تھا۔ بہت مشکل اور پھر ایک دن اللہ نے یہ مشکل ہم دونوں کے لیے آسان کردی۔

عرصہ ہوا سلام بن رزاق کے افسانوں پر ایک مضمون لکھا تھا وہ انھیں پسند نہیں آیا۔ ان کے ایک افسانے کا تجزیہ کیا وہ بھی انھیں پسند نہیں آیا۔ یہ تجزیہ اس کتاب میں شائع نہیں ہوا جو ان کے افسانوں کے تجزیوں پر مشتمل ہے۔ ہم نے اس پر کبھی بات نہیں کی۔ ان کا ایک انٹرویو کیا۔ وہ انھیں پہلے پسند آیا لیکن بعد میں کہا اس انٹرویو کے سبب کچھ لوگ مجھے شکست خوردہ افراد کا افسانہ نگار تصور کر رہے ہیں۔ ایسا افسانہ نگار سمجھ رہے ہیں جس کے تمام کردار سرینڈر کرتے ہیں۔ لڑتے نہیں ہیں، احتجاج نہیں کرتے۔ میں نے کہا یہ بات کسی حد تک درست ہوسکتی ہے۔ انھوں نے ماننے سے انکار کردیا۔ ان کے پاس دولتِ استدلال تھی، میں سنتا رہا۔ سب کا سچ ایک ہی سچ نہیں ہوتا ہے۔ ادب کا ڈسکورس کوئی ایک نظریہ طے نہیں کرسکتا۔ مارکسزم کے بغیر جدیدیت فراڈ ہے۔ ترقی پسندوں نے ادب کم پروپیگنڈہ زیادہ کیا ہے۔ لایعنیت بیمار اذہان پیدا کرتی ہے۔ علامت ادب ہے لیکن چیستان خراب ادب پیدا کرتا ہے۔ یہ اور ایسے ہزاروں موضوعات پر ہم گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ میرے اشتعال انگیز جملوں پر وہ متانت سے اظہار خیال کرتے۔ ایک ایک بات کو دھیمے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کرتے۔ کبھی غصہ نہیں ہوتے اور نہ سخت رائے دینے پر منھ موڑ لیتے۔ بے شمار باتیں اور یادیں ہیں جن کا عرصہ تین دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ وہ عرصہ بھی ہے جس میں سلام بن رزاق میری طرح بے شمار نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ میں نے ان کی طرح متوازن، سنجیدہ، مددگار، نئے اذہان کی آبیاری کرنے میں خوشی محسوس کرنے والا، اختلافِ رائے کا پاس رکھنے اور سب کو ساتھ لے کر چلنے والے لوگ کم دیکھے ہیں۔ ان کی شخصیت میں اتنا کھلا پن اور بے

ساختگی تھی کہ آپ بلاتکلف ان سے اختلاف کر سکتے تھے۔ انھیں کوئی بات پسند نہیں آئی تو برملا اظہار کر دیتے۔ ان کی اپنائیت میں کسی سطح پر کمی نہیں آتی۔ وہ ہر اس شخص کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے جو اختلاف کے آداب سے واقف تھا۔ یہ اردو فکشن کی روایت رہی ہے اور وہ اس روایت کے آخری بڑے ادیب تھے۔

انھوں نے خود پچھلی صدی کی آخری دہائیوں میں جدیدیت سے اختلاف کیا۔ وہ نظریاتی طور پر ترقی پسند تھے لیکن ترقی پسندی کی پرستش انھوں نے کبھی نہیں کی۔ ترقی پسندوں کی پارٹی پولیٹکس اور ادب کو نظریے کی تبلیغ کے لیے استعمال کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ اس پر تنقید کرتے تھے۔ ابتدائی دور میں چند افسانوں میں ہیئت کا تجربہ بھی کیا لیکن جب احساس ہوا کہ ادب آدمی، ملک، سماج اور سیاست سے الگ محض ہیئت کا تجربہ نہیں ہے، محض علامت پسندی نہیں ہے، محض باطن کی فسوں کاری نہیں ہے، محض ذات کے کرب کا اظہار نہیں ہے تو جدیدیت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اپنی فن کاری اور انفرادیت کے لیے انھیں جن لوازم کی ضرورت تھی اسے اپنے باطن اور ادب کی روایت میں تلاش کیا۔ پریم چند، منٹو، بیدی، عصمت اور انتظار حسین کی روایت کو آگے بڑھانے پر توجہ مرکوز کی۔ ان کی یہ فکری تبدیلی نہ صرف ان کی افسانہ نگاری کا ایک اہم موڑ ہے بلکہ جدیدیت کے بعد کے افسانے کے لیے سنگِ میل قرار دی جا سکتی ہے۔ بمبئی اور ملک بھر کے جن افسانہ نگاروں نے 1980 کے بعد جس اعتماد کے ساتھ ترقی پسندی کی خامیوں اور جدیدیت کی گمراہیوں کو طشت از بام کیا۔ کہانی، واقعہ، قصہ، بیانیہ اور آدمی کے سماجی و سیاسی سروکار کو غیر ضروری کہنے سے انکار کیا سلام بن رزاق کی شخصیت ان میں اہمیت کی حامل ہے۔ اس ادبی اختلاف کے باوجود، وہ شمس الرحمٰن فاروقی کے قدرداں تھے، علمیت کے قائل تھے۔ ان کا ذکر احترام اور عزت سے کرتے تھے۔ یہ توازن وہ آخری دم تک برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اختلاف کسی ایک خیال یا تصور سے ہوتا ہے، شخص سے نہیں۔ چنانچہ وہ شخصیت پر معترض ہونے کو شخصی عیب تصور کرتے تھے۔

وہ ادب کی فطری آزادی کے حق میں تھے۔ اس سوچ کے باوجود وہ ہر مذہبی شخص اور سیاسی جماعتوں سے وابستہ افراد کا احترام کرتے تھے۔ دوستی رکھتے، ملتے جلتے رہتے۔ وہ لوگوں کی بنیادی آزادی کا احترام کرتے تھے۔ نئے لکھنے والوں کو تلقین کرتے تھے کہ کسی کے مذہب، مسلک اور سیاسی وابستگی پر معترض ہونے کا ہمیں حق نہیں ہے۔

سلام بن رزاق کی زندگی عام آدمی کی زندگی تھی لیکن کسی طور یہ زندگی عام نہیں تھی۔ یہ ایک وسیع القلب، وسیع المطالعہ اور وسیع المشرب آدمی کی بے مثال زندگی ہے۔ انگریزی پر انھیں دسترس نہیں تھی لیکن مراٹھی اور ہندی ادب کی تاریخ، بالخصوص فکشن کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس کا ثبوت ان کے عمدہ اور شستہ تراجم ہیں۔ فکشن کے ساتھ ساتھ وہ ڈراموں اور فلموں سے بھی وابستہ رہے۔ ان کے افسانوں پر بھی کئی ڈرامے اسٹیج ہوئے۔ ان کے مطالعے میں جہاں عربی اور فارسی ادب شامل تھا وہیں پورانک کتھائیں، لوک روایتیں، گوتم بدھ سے منسوب کہانیاں اور زین کہانیاں Zen Stories بھی تھیں۔ قرآن کے ساتھ ساتھ انھوں نے گیتا، بائبل، وید، اپنشد، رامائن، مہابھارت اور دوسری مذہبی و مسلکی کتابوں کا بھی مطالعہ کر رکھا تھا۔ اساطیر سے ان کی محبت نہ صرف گفتگو سے آشکار ہوتی تھی بلکہ ان کی بیشتر کہانیوں میں جس ہنرمندی اور فن کاری سے ہندوستانی اساطیر کا انھوں نے استعمال کیا ہے، اس نے ان کہانیوں کی تہہ داری میں شاندار اضافہ کیا ہے۔

ان کی بیشتر کہانیاں آدمی، سماج اور سیاست کے بطون پر قائم ہیں لیکن فن کی جمالیات کے شعور نے ان کہانیوں کو معنویت عطا کی ہے۔ پہلی نگاہ میں ان کے کردار ہمیں عام محسوس ہوں گے لیکن جب گرہیں کھلتی ہیں تو کہانی ہم پر تنوع کے ساتھ معنویت کا الگ دفتر کھولتی ہے۔ ہم ان کرداروں کی زندگی اور خیالات پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو سمجھنے لگتے ہیں۔ ابہام کی چادر میں وہ معنی کو پوشیدہ رکھنے کے حق میں نہیں تھے۔ یہی ان کا بنیادی اختلاف جدیدیت سے تھا۔ جن خیالات کا اظہار وہ اپنی تقریروں میں کیا کرتے تھے اس کا بہترین نمونہ ان کے افسانے ہیں۔ یہ افسانے قاری کو نہ تھکاتے ہیں، نہ زبان کے گنجلک کھیل سے اکتاہٹ کا شکار کرتے ہیں۔ نہ فارم کی احمقانہ تکلم بازی سے قاری کو ادب سے دور کرتے ہیں۔ بلکہ زبان اور اظہار پر انھیں جو کمال حاصل تھا وہ کہانیوں کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے۔ 'ننگی دوپہر کا سپاہی' سے لے کر 'زندگی افسانہ نہیں' میں جو ساٹھ ستر کہانیاں ہیں، ان میں سے بیشتر کہانیاں قاری کو زندگی سے زیادہ قریب کرتی ہیں۔ اطراف کی محرومیوں، کمیوں، نامساعد حالات، سماجی مجبوریوں، باطن کی کیفیتوں، مرد اور عورت کی نفسیاتی کیفیات کا شعور عطا کرتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ آدمی کی زندگی پر اثر انداز ہونے والے خارجی عوامل اور عناصر کو سمجھنے کی گنجائش پیدا کرتی ہیں۔

سلام بن رزاق کی زندگی میں کئی افسانے ہیں اور اتنے ہی افسانے ان کے افسانوں کے ہیں۔ 'زندگی افسانہ نہیں' شائع ہوا تو ایک حلقہ بہت چراغ پا ہوا تھا۔ ان کی جدیدیت پر تنقید کے سبب ایک حلقہ ہمیشہ ان کے خلاف سرگرم رہا۔ ان کی میانہ روی سے بھی ان کے چند دوست نالاں رہے۔ لیکن وہ مسکراتے اور اپنا موقف بیان کرتے۔ ان کی شخصیت میں صبر و تحمل تھا۔ یہ صبر و تحمل ان کی کہانیوں کی ایک زیریں سطح بھی ہے۔ شخصیت کا یہ زاویہ ان کی فنکاری کی ایک اہم شناخت ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں کہیں بھی واشگاف ترقی پسند کے طور پر سامنے نہیں آتے۔ وہ مذہب، سیاست اور ادبی نظریے کی وکالت نہیں کرتے۔ نعرہ نہیں لگاتے، روتے نہیں ہیں، چیختے نہیں ہیں۔ امپریس کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ کہانی لکھتے رہے، کہانی نہ ہونے کی صورت میں نثر کے جوہر دکھانے کی حماقت کا شکار نہیں ہوئے۔ مجھے ایسا لگتا ہے جتنا کچھ ہم ان کی کہانیوں سے سیکھ سکتے ہیں اس سے زیادہ ہم ان کی زندگی سے سیکھ سکتے ہیں۔ ایک ایسی زندگی جو ایک کامیاب افسانہ قرار دی جا سکتی ہے۔

سلام بن رزاق کی زندگی کا افسانہ سننے اور اس سے سیکھنے کا سلسلہ اب شروع ہو رہا ہے۔ ایک کامیاب ادیب کے مزاج کا توازن، اظہار رائے کی جرأت، اختلاف کا پاس رکھنے کی روایت اور مذہب و مسلک کی آزادی کا احترام ایسی کئی باتیں ہیں جو بلاشبہ ہم سلام بن رزاق کی زندگی سے سیکھ سکتے ہیں۔ ہم انھیں بھول نہیں سکتے۔ کبھی نہیں۔

■

Rahman Abbas
204/A, Poonam Park
Near Haidri Chowk, Meera Road
Thane- 401107 (MS)
Mob.: 9869083296
Email.: rahmanabbas@gmail.com

سلام بن رزاق کی زندگی کا افسانہ سننے اور اس سے سیکھنے کا سلسلہ اب شروع ہو رہا ہے۔ ایک کامیاب ادیب کے مزاج کا توازن، اظہار رائے کی جرأت، اختلاف کا پاس رکھنے کی روایت اور مذہب و مسلک کی آزادی کا احترام ایسی کئی باتیں ہیں جو بلاشبہ ہم سلام بن رزاق کی زندگی سے سیکھ سکتے ہیں۔ہم انہیں بھول نہیں سکتے۔ کبھی نہیں۔

سوشیل کمار

محی الدین قادری زور کی ادبی خدمات

شخصیات

ڈاکٹر زور ایک ممتاز ماہر لسانیات، نقاد، افسانہ نگار، سوانح نگار، تذکرہ نویس، شاعر، معلم و منتظم ہی نہیں تھے بلکہ وہ بلند پایے کے محقق و مدون بھی تھے۔ اس کا ثبوت ان کی تصانیف ہیں۔ دیگر موضوعات کے علاوہ دکنیات ڈاکٹر زور کا ایک دلچسپ موضوع رہا ہے۔ لسانیات و صوتیات، سوانحیات و افسانہ نویسی وغیرہ کے علاوہ تحقیق و تدوین میں بھی دکنیات ان کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ تحقیق و تدوین کے متعلق ڈاکٹر زور کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے جن میں اردو شہ پارے جلد اول، دکنی ادب کی تاریخ، عہد عثمانیہ میں اردو کی ترقی، تاریخ ادب اردو، اردو کے اسالیب بیان، داستان ادب حیدرآباد، جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں کی اردو خدمات، ادبی تحریریں، مثنوی طالب و موہنی، فن انشا پردازی، عبدل کا ابراہیم نامہ، فرخندہ بنیاد حیدرآباد، تذکرہ گلزار ابراہیم، تذکرہ مخطوطات اردو (پانچ جلدیں)، متاع سخن، بادسخن، فیض سخن، رمز سخن، معنی سخن، تذکرہ نوادر ایوان اردو، مکتوبات شاد عظیم آبادی، شاد اقبال، جواہر سخن، معانی سخن، نذر محمد قلی قطب شاہ، مختصر حالات شاہ، اردو شاعری کا انتخاب، کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ہم ڈاکٹر زور کی دیگر تصانیف کا بھی جائزہ لیں تو وہاں بھی ان کی تحقیقی نگارشات بخوبی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ڈاکٹر زور جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن گئے تھے تو وہاں انھوں نے کئی قدیم تاریخی کتب خانوں سے استفادہ کیا، وہاں ان کو اردو ادب کے متعلق ایسا نایاب مواد بھی حاصل ہوا جسے ڈاکٹر زور نے ہندوستان واپس آنے کے بعد کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع کروایا۔ اردو شہ پارے اسی عمل کی ایک کڑی ہے جو انھوں نے 1929 میں شائع کرائی۔

'اردو شہ پارے' جلد اول جس میں اردو ادب کے آغاز سے لے کر ولی کے زمانے تک کے شاعروں اور نثر نگاروں کے شہ پاروں سے اہم اور دلچسپ انتخابات پیش کیے گئے ہیں۔ 396 صفحات پر مشتمل یہ کتاب جس میں ابتدائی کوششوں سے ولی کے زمانے تک کے اردو شہ پاروں کے مصنفین اور ان کے کارناموں پر ایک سرسری تاریخی نظر ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ اس سے ڈاکٹر زور کا مقصد اس دور کی ایک مکمل ادبی تاریخ پیش کرنا نہیں ہے بلکہ اس جلد میں جو شہ پارے پیش کیے گئے ہیں ان کی تخلیق کس زمانے میں، کن کے ہاتھوں سے، کس ماحول میں اور کس طریقے سے عمل میں آئی ان کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر زور نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے ایسے مصنفین کا بھی ذکر کیا ہے جن کا کلام موجود نہیں ہے اور معلومات کی کمی کی وجہ سے اختصار سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس میں شاعروں اور کتابوں کے متعلق جو کچھ حالات لکھے گئے ہیں چند معمولی اور غیر معروف کو چھوڑ کر ڈاکٹر زور کی ذاتی تحقیق و تفتیش اور اصلی ماخذوں کے مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ اس کتاب کی ابواب بندی ڈاکٹر زور نے اس طرح کی ہے:

باب اول: اردو ادب کی ابتدائی کوششیں، باب دوم: اردو ادب بیجاپور میں، باب سوم: اردو ادب گولکنڈہ میں، باب چہارم: اردو ادب مغلوں کی حکومت میں۔ اس کے علاوہ شہ پاروں کی فہرست بہ لحاظ مضامین، اردو شہ پارے نظم و نثر، دور اول کے مصنفین اور ان کے کارنامے، بیجاپوری مصنفین اور ان کے کارنامے، گولکنڈہ کے مصنفین اور ان کے کارنامے، مغلیہ عہد کے مصنفین اور ان کے کارنامے، ایڈنبرا کی بیاض کے مرثیہ نگار، اردو ادب سے متعلق سنیں وغیرہ کا ڈاکٹر زور نے تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی ڈاکٹر زور نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس مجموعے میں بعض ایسی اعلیٰ درجے کی ادبی کتابوں کے انتخاب موجود نہ ہوں جو کسی خانگی کتب خانے میں محفوظ ہیں یا جن کے متعلق عام طور پر معلومات نہیں۔ چونکہ ڈاکٹر زور نے یہ کتاب آج سے 94 برس پہلے لکھی تھی جس میں ڈاکٹر زور نے قلمی کتابوں کے انتخاب بھی شامل کیے ہیں۔

'تاریخ ادب اردو' ڈاکٹر زور کی ایک اہم کتاب ہے۔ ڈاکٹر زور نے اس کتاب کو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد سے 1940 میں شائع کروایا تھا۔ اگرچہ یہ ایک مختصر کتاب ہے جو محض 173 صفحات پر مشتمل ہے۔ چونکہ ادارے میں دیگر زبانوں کی تاریخ پر کتاب شائع کر رہے تھے اس لیے اردو زبان کی مختصر تاریخ کو بھی مرتب کر کے شائع کرایا گیا۔ اردو کی تاریخ پر مختصر مگر جامع کتاب کی ضرورت تھی۔

'دکنی ادب کی تاریخ' ڈاکٹر زور کی ایک تحقیقی تصنیف ہے۔ اس میں ڈاکٹر زور نے اردو زبان کے قدیم مرکزوں گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ، حیدرآباد اور اورنگ آباد کے شاعروں اور ادیبوں کی اردو خدمات پر تفصیلی بحث کی ہے اور 1350 تا 1750 کی ادبی تاریخ کو بیان کیا ہے۔ باب اول میں بہمنی عہد، گلبرگہ اور بیدر یعنی 1350 تا 1525 کا احاطہ کیا ہے۔ باب دوم میں عادل شاہی عہد بیجاپور یعنی 1490 سے 1686 تک ہے۔ باب سوم قطب شاہی عہد، گولکنڈہ اور حیدرآباد، 1508 سے 1686 تک ہے۔ باب چہارم مغل عہد، حیدرآباد اور اورنگ آباد، 1686 تا 1750 پہنچتا ہے۔ باب پنجم میں دکنی ادب کا اثر شمالی ہند کی اردو پر وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں کہ "قدیم دکنی ادب کی تاریخ میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب سے تیس برس قبل جب میں نے 1928 میں 'اردو شہ پارے' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی تھی نہ دکنی ادب کا چرچا تھا اور نہ عام اردو دانوں کو معلوم تھا کہ اردو زبان میں تین چار سو سال قبل اتنی اعلیٰ درجے کی نثر و نظم لکھی گئی ہوگی..... تیس سال کے اس طویل عرصے میں متعدد ادیبوں اور محققوں نے اس کی طرف توجہ کی اور دکنی ادب کے گوناگوں گوشوں کو اجاگر کیا اور کئی نئے شاعر اور ادیب روشناس کیے گئے۔"

(دکنی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر زور، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، 1960، ص 6)

ڈاکٹر زور نے دکنی ادب کی تحقیق اور فروغ میں نہ صرف تن من اور دھن سے کام لیا بلکہ ایسے لوگوں کو بھی متعارف کروایا ہے جنھوں نے دکنی ادب کے فروغ میں اہم حصہ لیا۔ 'عہد عثمانیہ میں اردو کی ترقی' بھی ڈاکٹر زور کی اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب تقریباً 200 صفحات پر مشتمل ہے جو 1934 میں اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر زور نے عہد عثمانیہ کے گزشتہ 25 سال سے حیدرآباد دکن میں اردو زبان و ادب کی نشو و نما کا تذکرہ کیا ہے جو نہایت ہی اہم اور دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر زور لکھتے ہیں: ''سرزمین دکن سے اردو کا آغاز نہ معلوم کون سی مبارک گھڑی میں کیا تھا کہ اس کے سپوت آج تک اس کی خدمت میں سرگرم کار ہیں اور گزشتہ تین چار صدیوں کے طویل عرصے میں کبھی کسی وجہ سے بھی اپنے کام کو ملتوی نہیں کیا۔ شاید ہی کوئی یہاں ایسا گزرا ہو جس میں اردو سے کسی کی بے توجہی کی گئی ہو......''

(ڈاکٹر زور، عہد عثمانیہ میں اردو کی ترقی، اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد، 1934، ص 11)

ڈاکٹر زور ایک جگہ لکھتے ہیں کہ عہد عثمانیہ کا سب سے درخشاں کارنامہ جس نے زبان اردو کی بنیادوں کو ہمیشہ کے لیے مستحکم کر دیا اور اس کے لیے ترقی کی سیکڑوں راہیں پیدا کر دیں وہ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ ڈاکٹر زور نے جامعہ کی دیگر خدمات کے علاوہ اردو زبان و ادب کے متعلق مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور تفصیلاً واضح کیا ہے کہ حیدرآباد میں اردو زبان کی اصلاح و ترقی اور بولنے والوں کے علاوہ اردو کے مختلف مراکز، حیدرآبادی اردو اور شمالی ہند کی اردو کا میل جول، حیدرآباد کی جدید اردو، علمی اور فنی ضرورتوں کی تکمیل، حیدرآباد میں اردو کی عام مقبولیت، جامعہ عثمانیہ میں ہندو طلبہ کی کثرت اور کامیابیاں، اردو تعلیم اور جامعہ عثمانیہ کے قیام کے لیے ہندوؤں کی کوششیں جیسے موضوعات پر ڈاکٹر زور نے مفصل بحث کی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک مکمل اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ 'داستان ادب حیدرآباد' بھی ڈاکٹر زور کی ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں ڈاکٹر زور نے حیدرآباد کے تین سو سالہ اردو، فارسی و عربی ادب و شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر زور نے قطب شاہی اور آصف جاہی عہد کی تاریخ و ادب کو بطور خاص اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ اس لیے مختلف ادوار میں حیدرآباد میں ابھرنے والی علمی و ادبی تحریکوں اور ان کے پس منظر کے پہلو بہ پہلو جملہ ارباب کمال کے مختصر واقعات حیات اور ان کے رشحات قلم کی خصوصیات سے بھی قارئین کو واقف کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر زور نے دور انتشار کے حیدرآباد کے سیاسی، سماجی و دیگر پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کی علمی و ادبی خدمات اور شعرا و مصنفین پر مفصل بحث کی ہے جو نہایت اہم اور دلچسپ ہے۔

'اردو کے اسالیب بیان' ڈاکٹر زور کی مرتبہ تواریخ کی ایک کڑی ہے۔ اس کا شمار اردو نثر کی تواریخ ادب کے زمرے میں ہوتا ہے جس میں ڈاکٹر زور نے اردو زبان میں نثر کے ابتدائی کارنامے، دسویں صدی ہجری کے بعد دکن میں نثر کی نشو و نما، شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی مراحل، فورٹ ولیم کالج کی نثری کوششیں، غدر اور اس کے قریبی زمانے میں نثر کی حالت، سرسید کی کوششوں کا اثر، موجودہ انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسالیب، اردو نثر کے رجحانات اور اردو نثر کا مستقبل وغیرہ موضوعات کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر زور لکھتے ہیں:

''اردو نثر کی ابتدا کے متعلق ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکا۔ بعض محققات نے شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کو قدیم ترین تصنیفات قرار دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خیال بھی غلط ثابت ہو کیونکہ شیخ الدین 706ھ میں پیدا ہوئے تھے اور اب بعض ایسی کتابیں دستیاب ہو رہی ہیں جو 500ھ کے قریب زمانے میں لکھی گئی تھیں......''

(اردو کے اسالیب بیان، ڈاکٹر زور، اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد، دکن، 1940، ص 25)

یہ کتاب اردو نثر کی ابتدا اور ارتقا پر ایک اہم کتاب ہے جس میں ڈاکٹر زور نے اسالیب بیان کے لحاظ سے اردو نثر کی ارتقائی منزلوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

'مطالعہ زور' میں اکبر حیدری لکھتے ہیں کہ 'اردو کے اسالیب بیان' اردو ادب کی بہترین انشا پردازی اور اعلیٰ نثری کارناموں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے جو کچھ بھی اس میں اپنا خیال پیش کیا ہے وہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔ یہ کتاب لکھ کر مصنف نے اس بات کا ثبوت دیا کہ ایک تنقید نگار کو کیسے غیر جانب دار رہنا چاہیے۔ انھوں نے اس کتاب میں کسی بھی انشا پرداز کے بارے میں ذرا بھی تعصب نہیں برتا۔ چنانچہ انھوں نے خود بھی کتاب کے آغاز میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔''

(مطالعہ زور، اکبر حیدری، الماس بک ڈپو، لکھنؤ، 1966، ص 59)

تحقیق و تدوین کے متعلق ڈاکٹر زور نے متعدد تصانیف لکھی ہیں، جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے، جن کی طویل فہرست ہے۔ ان تمام کی وضاحت اور جائزے کے لیے ایک مکمل مقالہ درکار ہے۔ اپنے موضوع و مقصد کے پیش نظر ان کا ذکر اور مرکزی خیال پیش کرنا ہی مناسب ہوگا۔

فن انشا پردازی کے متعلق بھی ڈاکٹر زور کی دلچسپ کتاب ہے۔ اس کے علاوہ 'سخن سیریز' پر ڈاکٹر زور کی کئی تصانیف ہیں 'مرقع سخن' (دو جلدیں) متاع سخن، بادِ سخن، فیض سخن، رمز سخن، معنی سخن، جواہر سخن وغیرہ تصانیف میں ڈاکٹر زور نے دکن کے ایسے گمنام شعرا کی خدمات اور کلام کو اجاگر کیا ہے جو اردو زبان و ادب سے گم ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ تذکرہ گلزار ابراہیم، تذکرہ مخطوطات (پانچ جلدیں)، تذکرہ نوادر ایوان اردو، مکتوبات شاد عظیم آبادی، شاد اقبال، مثنوی طالب و موہنی، عبدل کا ابراہیم نامہ، فرخندہ بنیاد حیدرآباد، نذر محمد قلی قطب شاہ، مختصر حالات شاہ، باغ و بہار، اردو شاعری کا انتخاب، سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب اور کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ڈاکٹر زور کی تحقیق و تدوین پر نہایت ہی اہم تصانیف ہیں جو اردو زبان و ادب میں ایک بہت بڑا اضافہ ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ولی کو پہلا شاعر مانا جاتا تھا لیکن شمس اللہ قادری کے علاوہ ڈاکٹر زور کی تحقیق نے یہ ثابت کیا تھا کہ ولی نہیں بلکہ سلطان محمد قلی قطب اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ڈاکٹر زور نے 'کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ' کو مرتب کر کے اردو ادب کی تاریخ میں تین سو سال کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں ڈاکٹر زور نے قلی قطب شاہ کے احوال و کوائف و دیگر بنیادی چیزوں کو بھی شامل کیا ہے جو تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر زور عملی طور پر بھی یوم قلی قطب شاہ مناتے رہے، جس میں دکن کی تہذیب و تمدن، تاریخ و تعمیری روایات کو دکھایا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہم ڈاکٹر زور کی کسی بھی تصنیف کا مطالعہ کرتے ہیں چاہے وہ جس بھی موضوع سے تعلق رکھتی ہو یعنی کہ ان کی لسانی و صوتی خدمات، سوانحی خدمات، افسانہ نگاری و دیگر تمام تصانیف میں دکنیات کا موضوع ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے اور ہر موضوع پر ان کا تحقیقی عنصر بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ڈاکٹر زور کی تصانیف میں اکثر سن ہجری کا استعمال زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی تصانیف کی اہمیت و افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے برصغیر کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان کی تصانیف نصاب میں شامل ہیں۔ بحیثیت مجموعی ڈاکٹر زور کی تحقیقی و تدوینی تصانیف اردو زبان و ادب میں ایک بہت بڑا اضافہ ہیں۔

■

Dr.Sushil Kumar
352-E/5,Munirka Village
New Delhi-110067
Mob.: 6006920406
Email.: sushiljnu2015@gmail.com

شخصیات

جاں نثار عالم

ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا شاعر

نظیر اکبر آبادی

امیر خسرو کے بعد ہندوستانی مشترکہ تہذیب کے سب سے اہم شاعر نظیر اکبر آبادی ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کے بارے میں بھی محققین میں اختلاف ہے تاہم زیادہ تر محققین کا ماننا ہے کہ نظیر جن کا اصل نام ولی محمد تھا 1735 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد فاروق تھا۔ ان کی والدہ آگرہ کے قلعہ دار نواب سلطان خان کی بیٹی تھیں۔ نظیر کی پیدائش کے بعد ہی دہلی کو مسلسل پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا نادر شاہ نے 1739 میں حملہ کرکے دہلی کو بڑے پیمانے پر لوٹا اور قتل عام کیا۔ دہلی کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور دہلی میں بہت دنوں تک بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بعد احمد شاہ ابدالی نے بھی مسلسل تین بار دہلی پر حملہ کیا۔ اس سے پریشان ہو کر نظیر اپنی والدہ اور دادی کے ساتھ دہلی سے اکبر آباد یعنی آگرہ آگئے اور وہاں تاج گنج کے نوری دروازہ کے مکان میں رہنے لگے۔ نظیر آگرہ میں آباد ہوئے اور 1830 میں یہیں دفن ہوئے۔ وہ آٹھ زبانوں پر دسترس رکھتے تھے جن میں اردو، فارسی، برج بھاشا، مارواڑی، پنجابی، پوربی اور ہندی ہے۔

نظیر نے طویل عمر پائی۔ ان کا عہد میر، سودا اور درد کا عہد تھا۔ وہ مطمئن طبیعت کے خوش مزاج انسان تھے۔ ان کی اقتصادی حیثیت بہت ہی معمولی تھی پھر بھی مال و دولت انھیں کبھی اپنی طرف متوجہ نہ کرسکے۔ نواب سعادت علی خان نے انھیں لکھنؤ بلایا لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح بھرت پور کے نواب نے انھیں بلایا لیکن وہ وہاں بھی نہیں گئے اور اپنے تدریسی کام کے سلسلے میں کچھ دن متھرا میں رہے پھر آگرہ واپس آگئے اور لالہ بلاس رائے کے بیٹوں کو محض 71 روپے ماہانہ تنخواہ پر پڑھانے لگے۔ اس معمولی تنخواہ پر ساری زندگی ہنستے ہنستے گزار دی۔ وہ جانتے تھے کہ کس طرح اطمینان کے ساتھ زندگی سے بھرپور لطف اندوز ہونا ہے۔ وہ کسی قیمت پر آگرہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے وہ کہتے تھے کہ۔

عاشق کہو اسیر کہو آگرے کا ہے
ملا کہو دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو فقیر کہو آگرے کا ہے
شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

نظیر اکبر آبادی کی شخصیت اور ان کی شاعری دونوں ابتدا ہی سے متنازع فیہ مسئلہ رہی ہے۔ جہاں بعض تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے ان کو شعری روایت سے بغاوت کے سبب اپنے تذکروں میں شامل کرنے اور شاعر تسلیم کرنے سے گریز کیا وہیں گزرتے وقت کے ساتھ تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے نہ صرف نظیر کے کلام کی اہمیت و معنویت کو پہچانا بلکہ ادب کے آسمان پر درخشندہ ستارے کی طرح بتایا اور انھیں اہم شعرا میں شمار کیا جانے لگا۔

نظیر اکبر آبادی ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو روسا اور نوابوں کا تھا لیکن انھوں نے اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی شاعری میں جن موضوعات کو منتخب کیا وہ ایک عام آدمی کے حالات ہیں۔ ان کی شاعری کا کینوس بہت وسیع ہے انھوں نے اپنے عہد کی شاعری میں خواص کو شامل کرنے کی روایت کے برعکس عوام کو شامل کیا۔ وہ ایک عوامی شاعر تھے اور ہر طرح کے لوگوں سے ملتے جلتے تھے۔ نظیر کی شاعری میں زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اس دور کے تہذیبی و تمدنی مشاغل کے خوبصورت رنگ بھی نظر آتے ہیں۔ زندگی کی رنگارنگی، مختلف تہوار مثلاً عید، بقرہ عید، ہولی، دیوالی، بسنت سے لے کر چرند پرند میلے ٹھیلے رنگین اور زرق و برق ملبوسات، ترکاریاں و مٹی کے برتن تک ان کی شاعری کے موضوعات میں شامل ہیں۔ ان کی عوامی شاعری کے متعلق کئی بڑے نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے جن میں مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور سے لے کر اختر اورینوی، ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور محمد حسن تک ہیں۔ محمد حسن اپنی کتاب

> نظیر ایک کھلے ذہن اور بڑے دل کے شاعر تھے ہر مذہب کے لوگوں سے ان کا تعلق گہرا تھا اور ہر مذہب کا وہ بہت احترام کرتے تھے اسی لیے انھوں نے ہولی، دیوالی، شب برات، عیدوغیرہ پر خوبصورت نظمیں لکھی ہیں حضرت امیر خسرو کے بعد نظیر اکبر آبادی قومی یکجہتی اور بھائی چارا کی ایک عمدہ مثال ہیں۔

نظیر اکبر آبادی میں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

''نظیر عوامی شاعر ہیں اس نے عوام کی باتیں عوام سے کہیں۔ اس نے نہ تو مذہب کا پرچار کیا اور نہ رہبانیت کا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں عوام کو سمجھنا ہوگا۔''

(ہندستانی ادب کے معمار: نظیر اکبر آبادی، محمد حسن، ص9، ساہتیہ اکادمی، دہلی، 1994)

نظیر ایک کھلے ذہن اور بڑے دل کے شاعر تھے ہر مذہب کے لوگوں سے ان کا تعلق گہرا تھا اور ہر مذہب کا وہ بہت احترام کرتے تھے اسی لیے انھوں نے ہولی، دیوالی، شب برات، عیدوغیرہ پر خوبصورت نظمیں لکھی ہیں حضرت امیر خسرو کے بعد نظیر اکبر آبادی قومی یکجہتی اور بھائی چارا کی ایک عمدہ مثال ہیں۔ آدمی نامہ اسی سلسلے کی ایک مشہور نظم ہے جس میں آدمی کے دکھ درد و دیگر پریشانیوں کے علاوہ اس کی مختلف قسمیں اور صفات کا بیان بڑے ہی دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔

دنیا میں پادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر کی نظموں میں تنوع ہے اس میں ہر قسم کے مضامین پائے جاتے ہیں۔ ان کی نظموں کی حسین رنگارنگی اور تنوع کے متعلق رشید حسن خاں رقمطراز ہیں:

''تنوع اور رنگارنگی کے لحاظ سے، نظیر کا کلام آج بھی بے مثال ہے۔ کوئی شاعر اس باب میں ان کا حریف نہیں۔ زندگی اپنی پوری تفصیل کے ساتھ ان کے کلیات میں جلوہ گر ہے۔ انھوں نے زندگی کے ان خالص مادی پہلوؤں کو اور ان کے اثرات کو بے حد سادگی وصفائی کے ساتھ پیش کیا، جن کے کرشمے ہر طرف نظر آتے تھے، لیکن جن کو شاعر کی نظر اور مصور کی آنکھ نے اپنے مرقعوں میں جگہ نہیں دی تھی۔ توا چولھا، دال روٹی اور راکھ، منقا، موٹھ، مٹر کو بھلا شاعری سے کیا تعلق تھا اور اس زمانے میں یہ کس نے کہا تھا کہ جہاں چولھے کی آنچ ہے، وہیں خالق کی نعمتوں کا ظہور ہے بلکہ اصل میں یہی نور ہے۔ اور اگر پیٹ بھرا ہوا نہ ہو تو چودہ طبق کیا، ایک طبق بھی روشن نظر نہیں آسکتا۔''

(انتخاب نظیر اکبر آبادی، تصحیح وترتیب رشید حسن خاں، ص7، لبرٹی آرٹ پریس، دہلی، 1970)
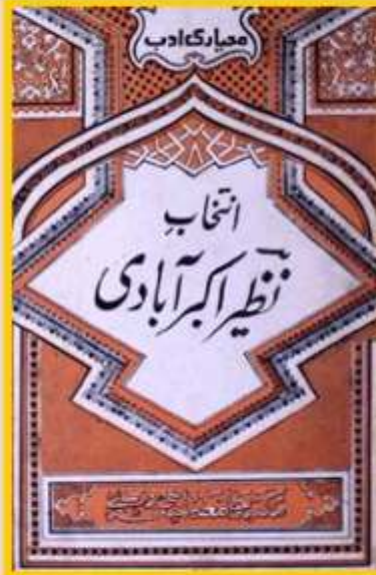
نظیر اکبر آبادی نے دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ اس نظم میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گو میں پلاسر بھارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاویگا جب لاد چلے گا بنجارا

نظیر اکبر آبادی، میر وسودا کے ہم عصر تھے اور جن معاشی و سماجی مسائل سے میر وسودا دوچار رہے، ان سے ملتے جلتے حالات میں نظیر اکبر آبادی بھی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میر وسودا نے دہلی کی غارت گری سے اثر لیا جب کہ نظیر آگرہ میں موجود ہونے کی وجہ سے براہِ راست غارت گری سے محفوظ رہے، البتہ دہلی کے حملوں کے سیاسی وسماجی اور معاشی اثرات سے بالواسطہ متاثر ہوتے رہے۔ شہرآشوب کے شاعر جعفرزٹلی سے سودا تک کے معاصر شعرانے معاشی بدحالی کا ذکر اپنی شاعری کے ذریعے کیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے عام نظموں میں بھی روپے، پیسے اور مادّی وسائل کے انسانی زندگی اور سماج میں انسانی مقام ومرتبے پر اثرات کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی مختلف نظمیں مثلاً کوڑی نامہ، پیسہ، مفلسی، آٹے دال، روٹی نامہ براہِ راست معاشی نظمیں ہیں روٹی نامہ کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے
یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لیے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے
ہم تو نہ چاند سمجھے نہ سورج ہی جانتے
بابا ہمیں تو سب نظر آتی ہیں روٹیاں

انھوں نے اپنی مشہور نظم 'مفلسی' اور 'آٹے دال' میں انسان کی بے بسی کو ظاہر کیا ہے۔ نظم مفلسی میں وہ لکھتے ہیں۔

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی
کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی
بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

نظیر نے اپنے عہد کے پرآشوب ماحول کی عکاسی ان پر دردالفاظ کے ذریعے کی ہے۔

مارے ہیں ہاتھ ہاتھ پہ سب یاں کے دستکار
اور جتنے پیشہ ور ہیں سو روتے ہیں زار زار

> انھیں ہندوستانی ادبیات میں جو عظمت حاصل ہے وہ نظموں ہی کی وجہ سے ہے، کیونکہ اس میں ہندوستانی زندگی اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ جی اٹھی ہے۔ اس کلیات کا ایک حصہ کرشن جی، مہادیو جی، بھیروں جی وغیرہ پر لکھی ہوئی نظموں سے بھرا ہوا ہے۔

> ”
> **نظیر اکبر آبادی ایک عوامی شاعر تھے۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی روح اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے جس کا لب و لہجہ اور مزاج عوامی ہے۔ ان کے یہاں مختلف موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔**
> “

کچھ ایک دو کے کام کو رونا نہیں ہے یار
چھتیس پیشے والوں کے ہیں کاروبار بند

نظیر اکبرآبادی ایک عوامی شاعر تھے۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی روح اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے جس کا لب ولہجہ اور مزاج عوامی ہے۔ ان کے یہاں مختلف موضوعات پر نظمیں ملتی ہیں۔ کچھ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا ذکر ہے بعض میں اخلاق وتصوف کا۔ ان کے جمہوری مزاج کے متعلق پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

”انھیں ہندوستانی ادبیات میں جو عظمت حاصل ہے وہ نظموں ہی کی وجہ سے ہے، کیونکہ اس میں ہندوستانی زندگی اپنی تمام اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ جی اٹھی ہے۔ اس کلیات کا ایک حصہ کرشن جی، مہادیو جی، بھیروں جی وغیرہ پر لکھی ہوئی نظموں سے بھرا ہوا ہے۔ نظیر سے پہلے زیادہ تر شعرا عام موضوعات پر لکھنے اور عوام کی زندگی کی تصویر کشی کرنے میں بچتے تھے مگر نظیر نے اونچے طبقے کے خیالات میں ایک ایسا چور دروازہ بنا دیا جس میں سے ہو کر عوام کا جلوس قصر ادب میں گھس آیا۔ شاعری کی اس عظیم روایت کے ساتھ نظیر اکبرآبادی کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔“

(اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، ص 117، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1999)

نظیر اکبرآبادی کا تجربہ ومطالعہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے انھوں نے مختلف اہم شخصیات پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً شری کرشن، گرونانک وغیرہ۔

کہتے ہیں نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو

گلزارِ نظیر
نظیر اکبرآبادی کا کلام
(اردو)
مرتبہ
سلیم جعفر
ہندستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ
الہ آباد

مقصود مراد امید سبھی بر لاتے ہیں دلخواہ گرو
نت لطف کرم سے کرتے ہیں ہم لوگوں کا نرواہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس جھکا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

ان کی شاعری کا جادوئی آہنگ آگرہ کے گلی کوچوں اور بازاروں میں گونجتا تھا۔ تہواروں اور میلوں میں ان کے گیت لوک گیتوں کی طرح گائے جاتے تھے۔ شری کرشن کی زندگی پر ان کے لکھے گیت کو فقیر مست ہو کر گاتے تھے۔

کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بالپن
ایسا تھا بانسوری کے بجیا کا بالپن
یارو سنو وہ دہی کے لٹیا کا بالپن
اور مدھوپوری نگر کے بسیا کا بالپن

نظیر اکبرآبادی ایک ایسے حقیقت پسند شاعر ہیں جن کی نظموں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانیت کی بقا کے لیے انسان کو جینے کے یکساں وسائل ملنے چاہیے۔ انھوں نے بعض نظمیں بچوں کے لیے بھی لکھی ہیں جیسے ریچھ کا بچہ، بلی کا بچہ وغیرہ۔ ان کے بعض موضوعات تو اتنے دلچسپ اور انوکھے ہیں کہ ان پر آج تک کسی شاعر نے قلم تک نہیں اٹھایا۔ ان کی اس قوت مشاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

”دنیا کو کتاب سے پڑھا اور استاد سے سیکھا بھی جاتا ہے مگر دل زندہ ہو تو اسے آنکھوں سے اور کانوں سے پیا بھی جاسکتا ہے۔“

انھوں نے عام زندگی کے ہر چھوٹے بڑے موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ مثلاً کورا برتن، لکڑی، تل کے لڈو وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی نظموں میں قدرت کے حسین مناظر کو بہت ہی خوبصورتی سے قید کیا ہے ان کی مشہور نظم 'برسات کی بہاریں' قدرتی مناظر کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاوٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

نظیر کی شاعری میں جہاں قدرتی مناظر کا عکس دکھائی دیتا ہے وہیں عرس، میلوں اور تہواروں کے مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں۔ انھوں نے نظم ہولی کے ذریعے ایک ہندوستانی تہوار میں منائی جانے والی خوشیوں کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

آ جھمکے عیش وطرب کیا کیا، جب حسن دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی، یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا، ہر دل کو لبھایا ہولی نے
دف رنگین نقش سنہری کا، جس وقت بجایا ہولی نے
بازار، گلی اور کوچوں میں، غل شور مچایا ہولی کا

نظیر اکبرآبادی اردو نظم کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے عربی، فارسی، پنجابی، اودھی، برج، کھڑی بولی اور سنسکرت کے الفاظ کو بہت خوبصورتی کے ساتھ اپنی شاعری میں شامل کیا۔ ان کی شاعری میں فارسی الفاظ اور تراکیب کی کمی نہیں۔ وہ کفر وایمان، دیر وحرم، سبحہ وزنار کی تراکیب کے علاوہ عاشق، دلبر، دشت اور آہنگ کے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ کھڑی بولی برج اور پنجابی سے آنند، بھیڑ، جنم، تت بھو، سنسار، پچھن، اوتار، سروپ، پرتپال، مدھ مست کے الفاظ ان کی شاعری میں جگہ جگہ پائے جاتے ہیں۔ وہ نہ صرف چولھا، ہانڈی اور تنور کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں بلکہ ایسے اودھی کے الفاظ بھی ان کی شاعری میں جگہ بناتے ہیں جنھیں صرف انھوں نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ مخاطبت کے لیے 'بابا' کے لفظ کا استعمال بھی خالص ہندوستانی مزاج کی نمائندگی کرتا ہے۔

غرض نظیر اکبرآبادی نے اپنی شاعری میں بے شمار ہندوستانی الفاظ استعمال کیے ہیں جنھیں ان سے پہلے کسی شاعر نے استعمال نہیں کیا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

اس طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظیر ہندوستانی مشترکہ تہذیب وثقافت کا بے نظیر شاعر تھا۔

■

Dr. Jan Nisar Alam
Asst Professor, Dept of Urdu
University of Lucknow
Lucknow- (UP)
Cell.:9792453618
jannisaralamlko@gmail.com

میسرہ اختر

مرزا مظہر جانِ جاناں
شخصیت و شاعرانہ عظمت

مرزا مظہر جان جاناں کا اصل نام 'جان جاناں' لقب 'شمس الدین حبیب اللہ' اور 'مظہر' تخلص ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں کی پیدائش 11 رمضان 1111ھ بمطابق 13 مارچ 1699 دہلی میں ہوئی۔ آپ کا سلسلۂ نسب محمد بن حنفیہؒ کی وساطت سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے والد میرزا جان سلطان اورنگزیب عالمگیر کے دربار میں بڑے منصب پر فائز تھے اور سلسلہ قادریہ میں شاہ عبدالرحمٰن قادری سے بیعت تھے۔ آپ کی پیدائش کے بعد وہ دنیا سے کنارہ کش ہو گئے اور باقی عمر فقر و قناعت میں بسر کی۔ ابتدا میں فارسی اور دیگر ابتدائی رسائل اپنے والد ماجد سے پڑھے، کلام اللہ اور تجوید و قرأت قاری عبدالرحیم سے اور علم الحدیث و علم التفسیر حاجی محمد افضل سیالکوٹی شاگرد شیخ المحدثین شیخ عبداللہ بن سالم مکی سے حاصل کی۔ ان علوم کے علاوہ مرزا مظہر کو دیگر فنون میں بھی کافی مہارت حاصل تھی بالخصوص فن سپاہ گری میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ جان جاناں مشہور صوفی سلسلہ نقشبندیہ کے ہندوستان میں مشہور موید مانے جاتے ہیں، یہ سلسلہ شیخ الانوار سمرقند و بخارا بہاؤ الدین نقشبند کا قائم کردہ ہے۔

سات محرم 1195ھ کو چند آدمیوں نے مظہر کے دروازے پر دستک دی۔ خادم نے جا کر عرض کیا کہ کچھ لوگ زیارت کے لیے آئے ہیں۔ آپ کی اجازت سے تین آدمی اندر آئے، ان میں سے ایک ایرانی نژاد مغل بھی تھا۔ آپ خوابگاہ سے نکل کر ان کے برابر کھڑے ہو گئے۔ مغل نے پوچھا کہ مرزا جان جاناں آپ ہیں، پس اس پر بدبخت ایرانی مغل نے طمنچے کی گولی داغ دی جو آپ کے دل کے بائیں طرف لگی۔ آپ ناتوانی اور بڑھاپے کے باعث گر پڑے اور قاتل فرار ہو گیا۔

مرزا مظہر جان جاناں نہایت حسین و جمیل، ظریف، بلند قامت اور نازک مزاج انسان تھے۔ بچپن ہی سے طبیعت میں قلندری تھی اور بزرگان دین سے خاصا لگاؤ رکھتے تھے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ مشکوک کھانا کبھی نہ تناول فرماتے، ہمیشہ زرق حلال کا حد درجہ اہتمام فرمایا کرتے تھے اور امیروں کی جانب سے آئے ہوئے کھانے کو تو کبھی ہاتھ بھی نہ لگاتے تھے اور فرماتے: شرالطعام طعام الاغنیا یعنی بدترین کھانا امیروں کا کھانا ہے۔ عظمت و شان کا یہ عالم تھا کہ معاصرین میں کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی عظیم اسکالر بھی مرزا مظہر جان جاناں کی انفرادیت اور ہمہ جہت شخصیت کے قائل تھے، وہ لکھتے ہیں:

''ہم لوگ ان کو جانتے ہیں وہ کیا چیز ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کے احوال ہم پر پوشیدہ نہیں۔ عرب کے شہروں میں بھی ہم گئے ہیں اور ان لوگوں سے آپ کی ولایت کے پختہ و ٹھوس احوال سنے ہیں۔ کتاب و سنت اور شریعت و طریقت پر احسن طریقے سے مستقیم و استوار ہیں اور طالبین کے درمیان عالیشان عظمت کے مالک ہیں، عمدہ شخصیت ہیں۔ اس زمانے میں ان جیسا انسان ہمارے شہروں میں کوئی نہیں بلکہ ہر زمانے میں ایسے لوگوں کا وجود بہت کم ہوتا ہے۔'' [1]

خودداری اور توکل علی اللہ کا حال یہ تھا کہ بادشاہوں سے کبھی کوئی ہدیہ یا تحفہ قبول نہیں کرتے۔ دنیا اور اہل دنیا سے بالکل مستغنی رہے۔ اکثر مطالعہ کتب میں مصروف رہتے تھے۔ آپ کی جو تصانیف اب تک ملی ہیں، ان میں: دیوان مظہر، خریطہ جواہر، مکاتیب کے مختلف مجموعے، مجموعہ اردو اشعار، متفرق اور مختصر نثری تحریریں و ملفوظات مشہور ہیں۔

مرزا مظہر جان جاناں مبلغ، صوفی اور باکمال شاعر ہیں اور زبان و بیان کے اعتبار سے دیکھیں تو مصلح اعظم بھی۔ مرزا مظہر زبان و ادب کے ارتقائی عہد سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے آپ کا کلام تاریخی ارتقا میں اہم مقام رکھتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف اردو زبان میں نکھار پیدا کیا بلکہ اس میں فارسی کی کچھ نئی ترکیبیں اور نازک خیالات پیدا کیے اور قدیم ایہام گوئی کو ختم کرنے کی اچھی کوشش کی، یہی سبب ہے کہ کم غزلیں کہنے کے باوجود مرزا مظہر جان جاناں کا شاعرانہ قد نہایت بلند ہے۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''مرزا مظہر جان جاناں... نے اردو میں بہت کم غزلیں لکھی ہیں مگر ایک بہت بڑے صوفی اور عالم ہونے کے باعث انھیں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا کچھ حصہ تذکروں میں مل جاتا ہے۔ انھوں نے زبان درست کرنے اور شاعری کو ان صنائع سے بچانے کی سعی کی جو شاعری کو محض الفاظ کا ایک گورکھ دھندا بنا دیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے ایہام گوئی کی مخالفت کی، فارسی کے عالم ہونے کی وجہ سے ان کی زبان میں فارسی تراکیب کا استعمال بہت ملتا ہے۔'' [2]

مرزا مظہر ایک زندہ دل انسان تھے، طبیعت صوفیانہ کیفیات اور عاشقانہ مزاج سے لبریز تھی، شاعرانہ زیر و بم سے آگاہی ان کی سرشت میں شامل تھی، چنانچہ اسی کا اثر تھا کہ مرزا کی شاعری میں شعور و احساس کا ایک بحر بیکراں نظر آتا ہے۔ حالاں کہ شعر کہنا مرزا مظہر کا شوق یا مشغلہ نہیں تھا اور نہ ہی انھوں نے کسی نام و نمود کے لیے شاعری

کی بلکہ جب کبھی وہ عشق حقیقی سے شرابور ہوتے، ان کا مافی الضمیر شعری قالب میں ڈھلتا چلا جاتا۔ مرزا مظہر نے فارسی اور اردو میں شاعری کی ہے۔ کم وبیش فارسی اور اردو شاعری میں خیالات و جذبات ایک ہی جیسے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''اردو شاعری میں مرزا صاحب کو نقاش اول ریختہ اس لیے نہیں کہا گیا کہ انھوں نے شمالی ہند میں پہلی بار اردو میں شعر کہنا شروع کیا بلکہ یہ اعزاز اس لیے ملا ہے کہ انھوں نے ایہام جیسے 'ستم' اور غیر فطری چیز کے خلاف پہلی بار آواز بلند کی اور اپنی اس مخالف آواز کو باقاعدہ تحریک کی صورت دی۔ انھوں نے اردو شاعری کی ان تاریک راہوں کو روشن کیا اور منور کیا جن پر گامزن ہو کر درد، میر، سودا، آتش اور غالب جیسے عظیم شاعروں نے نئی راہیں اور نئے راستے نکالے۔ اسی طرح مرزا صاحب نے فارسی مکتوب نگاری میں بھی سادگی کی بنیاد رکھی اور اس کی اصلاح کی۔ غالب نے اردو مکتوب نگاری میں جو اصلاحیں کی تھیں اور جس سادگی اور بے تکلفی کی طرح ڈالی تھی، اس کی ابتدا 70,80 سال قبل مرزا صاحب ہی نے کی تھی۔''[3]

مرزا چونکہ اپنے آپ کو 'کشتۂ راہ خدا' کہتے تھے، اس لیے ان کی شاعری میں بھی عشق حقیقی کی تڑپ، وارفتگی شوق کی کثرت، واردات قلبی کی بہتات اور پاکیزہ خیالات کی فراوانی پائی جاتی ہے۔ یہی وہ خاصہ ہے کہ مرزا کی شاعری ہر خاص وعام میں مقبول اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور وہ ہر طرح کے قارئین کو اپنا گرویدہ بنائے رکھتی ہے۔ جب بھی کوئی مرزا کے اشعار کو سنتا ہے وہ اپنے دل پر ایک چوٹ سی محسوس کرتا اور کچھ نہ کچھ فیض ضرور پاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
جھکی ہے فوج گل اور عندلیباں کی پکار آئی
ارے ہنستا ہے کیا وہ دیکھ دیوانے بہار آئی

(مرزا مظہر جان جاناں)[4]

مرزا مظہر جان جاناں کے کلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں سیدھے سادے اور عام الفاظ میں زیادہ کلام ملتے ہیں اور اس پر صوفیانہ رنگ اور عشق حقیقی کی آمیزش، ان کے کلام میں مزید لطف، شیرینی، تازگی، رعنائی اور بالیدگی پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ مرزا مظہر کے کلام میں صوفیانہ مضامین کی کثرت کے باوجود رنگِ تغزل کی کمی نظر نہیں آئی اور نہ ہی کہیں کوئی خشکی یا بدمزگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں آنے والے اشعار میں محسوس کی جا سکتی ہیں۔

سحر اس حسن کے خورشید کو جا کر جگا دیکھا
ظہور حق کو دیکھا خوب دیکھا باضیا دیکھا
مرا جلتا ہے دل اس بلبل بے کس کی غربت پر
کہ گل کے آسرے پر جن نے چھوڑا آشیاں اپنا
رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشق بدگماں اپنا
چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

(مرزا مظہر)[5]

مرزا مظہر جان جاناں صوفی باصفا تھے، جنھوں نے مکاتیب اور ملفوظات کے ذریعے رشد و ہدایت کی تعلیم کو عام کیا۔ زندگی گزارنے کا سلیقہ بتایا، چارہ سازی، طمانیت قلب، تزکیۂ نفس کا درس دیا۔ ساتھ ہی شعر و شاعری کے ذریعے بھی انھوں نے دل کو چھیڑا۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کی دھیمی دھیمی آنچ سے سوز و گداز پیدا کیا، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مسلک میں بھی کشش اور جاذبیت پیدا کی۔ غرض کہ حضرت مظہر جان جاناںؒ دنیائے تصوف کے درخشندہ ستارہ ہیں جن کی تابانی سے فارسی اور اردو شاعری دونوں تابندہ ہیں۔ آپ صوفی باعمل تھے اس لیے صرف فنی یا علمی طور پر آپ نے تصوف کا مشاہدہ نہیں کیا بلکہ عملی اعتبار سے بھی اپنے صوفیانہ خیالات کو شعر کے قالب میں ڈھالتے گئے اور اردو شاعری کے ذریعے جہادِ زندگانی کی ترغیب دی۔ آپ کے مسلک اور مشرب دونوں صوفیانہ تھے، چونکہ آپ مسند سجادگی پر جلوہ بار تھے۔ اس لیے رشد و ہدایت اور اخلاص و محبت کا درس دیتے رہے اور اردو شاعری کو تصوف کے ذریعے انھوں نے نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ مرزا مظہر کے اندر جذبۂ عشق موجزن تھا۔ وہ عشق حقیقی سے سرشار تھے۔ ان کا دل عشق الٰہی میں اتنا غرق تھا کہ ان کے اشعار میں بھی وہی کیفیت اور تاثیر نظر آتی ہے۔ مرزا کے کلام میں عشق مجازی کا رنگ بھی ہے اور عشق حقیقی کا آہنگ بھی اور یہی تصوف و معرفت کی جان ہے۔ آپ کے کلام کی روشنی میں اس حقیقت کا تجزیہ دیکھیں۔

تجلی گر تیری پست و بلنداں کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
اتنی فرصت دے کہ رخصت ہو لیں اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

(کلام مرزا مظہر)[6]

دراصل مرزا کا کلام اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہ پاتا، چاہے وہ نظم ہو یا نثر۔ جو بھی مرد حق آگاہ ہوتا ہے وہ ہر تصنع اور ہر تکلف سے پاک ہوتا ہے، وہ جو کچھ کہتا ہے حق ہی کہتا ہے اور حقانیت اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے، چنانچہ مرزا مظہر کا کلام سننے اور پڑھنے کے بعد دل میں شعلہ بھڑکنا تو لازمی امر ہے۔ اُن کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں سنجیدگی، لطافت، سادگی اور عام فہم الفاظ ہوتے ہیں، اور اس طرح کا انداز و اسلوب، عشق ومحبت میں ڈوبے ہوئے کلام کو اور بھی پُر تاثیر بنا دیتا ہے، اسی پر بس نہیں بلکہ فصاحت وبلاغت اور سلاست وروانی کے اعتبار سے بھی مرزا مظہر کی شاعری مثالی نظر آتی ہے۔ مرزا مظہر کے کلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں جو کچھ مضامین باندھے گئے ہیں وہ خیالی نہیں بلکہ اصلی اور حقیقت حال کے بالکل مطابق ہیں۔ مختصر یہ کہ مرزا مظہر کے کلام کی اہم خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس پُر لطف انداز میں 'سردلبری' کو فاش کیا ہے مگر کمال یہ ہے کہ کلام میں صوفیانہ مضامین کی کثرت کے باوجود رنگ تغزل کہیں بھی کم نہیں ہوا اور نہ ہی کہیں کوئی خشکی یا بدمزگی کا احساس ہوا۔ مثلاً

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی
یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

حواشی

1 معمولات مظہری، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، 1907، ص 19-218

2 اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی، 2006، ص 54

3 مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، خلیق انجم، مکتبہ برہان دہلی، 1962، ص 82

4 مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، 2004، ص 115,146

5 مرزا مظہر جان جاناں، شمیم طارق، اردو اکادمی دہلی، 2015، ص 92,101,

56 مونوگراف مرزا مظہر جان جاناں، شمیم طارق، اردو اکادمی دہلی، 2015، ص 93,96

■

Myserah Akhter
Research Scholar, Dept of Urdu
Delhi University
Delhi-110007
Email.: myserahdu@gmail.com

ذہنی صحت اور ذہنی حفظان صحت کا مفہوم

ذہنی صحت کی تعریف بیان کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا جمہوریت کی تعریف کا بیان لیکن اس کی کوئی ایسی تعریف نہیں ہوسکتی جس پر سب لوگ متفق ہوں پھر بھی لوگ اپنے اپنے طور پر اس کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ دراصل اس اصطلاح کے مفہوم پر اظہار خیال کرتے وقت لوگ اس کے بہت سے بنیادی پہلوؤں پر متفق ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ جمہوریت کے مفہوم کا ایک ایسا تصور رکھتے ہیں جو قابل عمل ہو۔ اسی طرح ذہنی صحت کی تعریفوں میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے لیکن الفاظ میں اختلاف ہونے کے باوجود اس کے بنیادی پہلوؤں پر بہت زیادہ اتفاق نظر آتا ہے۔

مندرجہ ذیل تعریف میں اس کی ایک مثال موجود ہے:

ذہنی صحت کی تعریف یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ یہ خود سے اور پوری دنیا کے لوگوں اس مطابقت کا نام ہے جس میں زیادہ سے زیادہ معنویت، تسکین، شادمانی اور سماجی طور پر محتاط عمل کی گنجائش ہو اور زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ اس لیے اعلیٰ ذہنی صحت کی تعریف یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ اس کے تحت ایک فرد اپنی امکانی قوتوں کو بدرجۂ اتم استعمال کرسکے اور جس کے اندر کم سے کم تناؤ اور انتشار پایا جائے تاکہ وہ خود سے اور سماجی نظام سے بغیر کسی انتشار کے زیادہ سے زیادہ آسودہ خاطر ہوسکے۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک ایسی اچھی حالت پیدا ہوجائے جس میں فرد اپنے انتشار کو دور کرلے اور ایسے کام کرے جو سماج کے لیے نامناسب اور قابل اعتراض نہ ہوں۔ وہ کسی بھی ماحول میں رہے کیسے ہی حالات سے دوچار ہو اس میں ذہنی اور جذباتی ٹھہراؤ باقی رہے۔

ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ذہنی صحت ایسی صلاحیت کا نام ہے جس میں زندگی کے کھچاؤ سے ایک کامیاب مطابقت پیدا ہوجائے اور ذہنی حفظان صحت وہ ذریعہ ہے جو مطابقت پیدا کرنے میں مدد کرے۔

'ایک پختہ کار صحت مند شخص' کون ہے، یہ بتانا مشکل ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ فی الوقت ایک واضح اور مکمل تعریف ممکن بھی نہیں۔ بس اتنا ہی کہنا کافی ہوگا کہ پختہ کار صحت مند انسان وہ ہے جو اپنے آپ سے اور اپنے ہمسایوں سے پرامن رہ سکے، کامیابی کے ساتھ صحت مند بچوں کی پرداخت کرسکے اور ان تمام فرائض کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دینے کے بعد بھی اس میں اتنی توانائی باقی رہے کہ وہ جس معاشرے میں رہتا ہے اس کو کچھ اور بہتر بناسکے۔

مندرجہ بالا تعریفوں سے ذہنی صحت کے مفہوم کا کچھ اندازہ ہوتا ہے اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ذہنی صحت کسی جامد حالت کا نام نہیں بلکہ اس کے اندر مطابقت کا ایک مسلسل عمل جاری رہتا ہے۔ ذہنی صحت ایک ایسی صلاحیت ہے جس کے ذریعے فرد موجودہ حالات اور آئندہ کے حالات سے مطابقت کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر تعریف میں مطابقت کی صلاحیت اور 'استعداد' کا ذکر موجود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ذہنی صحت میں ذہنی پہلو سے زیادہ پہلو شامل ہیں۔ اس کے اندر مطابقتی عمل کے یعنی جسمانی، ذہنی اور جذباتی پہلو بھی شامل ہوتے ہیں اس میں مخصوص حالات اور مسائل کی جانب کام کی عادتیں اور رجحانات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذہنی صحت وہ نظریہ ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے وقت انسان اپناتا ہے، تیسری طرف ذہنی صحت کے تصور کا ایک سماجی پہلو بھی ہوتا ہے اس لیے جب اس کی تعریف بیان کی جاتی ہے تو اس میں 'سماجی طور پر محتاط کردار' سماجی معاشرے سے تسکین براری 'صحت مند بچوں کی پرورش' اور 'سماجی افادیت' جیسے فقرے بھی شامل کرلیے جاتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ مکمل ذہنی صحت کسی ایسی حالت کا نام نہیں جو سہل الحصول ہو بلکہ اس کو زندگی کا ایک مقصد قرار دیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذہنی صحت ایک ترقی پسند مقصد ہے۔ درحقیقت اور سماجی نشوونما کے لیے ایک چیلنج بھی ہے۔ اس لیے ذہنی صحت کی نرالی نوعیت کو مکمل طور سے محسوس کرنا چاہیے ورنہ ہمارا مقصد بہت محدود ہوسکتا ہے اور اس کے حصول کے بعد ایک تعطل اور اطمینان کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے جو مستقبل میں مطابقت کے لیے ایک رکاوٹ بن جائے گی۔ دراصل کامل ذہنی صحت کسی ایسی مکمل اور قطعی حالت کا نام نہیں جس کو پورے طور پر حاصل کیا جاسکے۔ بلکہ یہ ایسی چیز ہے جس کے لیے کوشش کرتے رہنا چاہیے یہ اور بات ہے کہ حصول علم کے بعد بھی شاید کمال کبھی نہیں حاصل ہوسکے گا۔

اساتذہ کے لیے ذہنی صحت ایک ایسی حالت کا نام ہے جس کے تحت وہ اپنے کام میں موثر ثابت ہوں، اس سے تسکین اور فخر حاصل کریں، ادائیگی فرض میں خوشی کا اظہار کریں اور اپنے طلبا اور ہم پیشہ کارکنوں کی طرف انسانی رویے کا اظہار کریں۔ یہ ایک مشکل کام ہے، شاید بہت مشکل لیکن ذہنی صحت کی نرالی نوعیت کے باعث بچت کی بھی گنجائش ہے۔ ذہنی صحت کا مرکباتی تصور اور اس کا ثبوت بس یہ ہے کہ اس کو بہتر بنانے اور بہتری حاصل

کرنے کی کوشش کی جائے۔

درجے کے اندر بھی ذہنی صحت کے موضوع پر انھیں الفاظ میں زیادہ زور دیا جاسکتا ہے اس کام میں ایسے طالب علموں کو شامل کیا جاسکتا ہے، جو درجے کے مشاغل میں موثر اور کامیاب ثابت ہوں۔ ذہنی طور پر صحت مند طالب علم وہ ہے جو اپنی کامیابی پر مطمئن نظر آتا ہے۔ آسودہ خاطر ہوتا ہے اور اپنے کام اور رفقائے کار سے خوش رہتا ہے یعنی ذہنی طور پر صحت مند طالب علم وہ ہے جو دوسروں کے لیے اور دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ وہ تنہائی پسند نہیں ہوتا اور نہ 'گرگ تنہا' کے مصداق ہوتا ہے۔ بلکہ اتحاد باہمی کے ذریعے کام نہ کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے اور ان خصوصیات کی وجہ سے وہ اپنے اندر

ذہنی حفظانِ صحت کا تعلق جس قدر صحت مند انسان سے ہے اسی قدر بیمار سے بھی یعنی ذہنی حفظان صحت کا تعلق سبھی لوگوں سے ہے۔ وسیع معنوں میں ذہنی حفظان صحت کا مقصد ان افراد کی مدد کرنا ہے جو ایک زیادہ مکمل، شادماں، ہم آہنگ اور موثر زندگی کے حصول کے لیے کوشاں ہوں۔

ایسی عادتیں اور ایسے رجحانات پیدا کرلیتا ہے جو مستقبل کے حالات سے ہم آہنگ ہوں اور اپنے اندر ایسی خوداعتمادی حاصل کرلیتا ہے کہ پیش افتادہ مسائل کا مردانہ وار مقابلہ کرسکے۔

ذہنی حفظان صحت کا نظریہ

ذہنی حفظان صحت کی تعریف، ذہنی صحت کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے بیان کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ ذہنی حفظان صحت صرف ان ذریعوں کا نام ہے جن سے ذہنی صحت کا حصول کیا جاتا ہے۔ یہ بیان سطحی ہے اس سے ذرا ہٹ کر دیکھیں تو اس کی تشریح بہت مشکل ہو جاتی ہے کیونکہ ذہنی حفظانِ صحت ایک طرز زندگی کا نام ہے اس میں وہ سب باتیں آجاتی ہیں جو انسان کے محسوسات اقوال اور اعمال پر اثر انداز ہوتی ہیں اس کے اندر منصوبے اغراض و مقاصد، طریق کار ساز وسامان، طبعی حالات اور بذات خود استاد بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سب مل کر جماعت کا ماحول پیدا کرتے ہیں:

''ذہنی عمل کا علم اور مطابقت کے کارآمد طریق کار آسانی سے سیکھے جاسکتے ہیں اور ہر جگہ عمل میں لائے جاسکتے ہیں۔ ذہنی حفظانِ صحت کی تدریس گھر سے شروع ہوتی ہے اس لیے اس کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کا کام زندگی بھر جاری رہنا چاہیے، بدقسمتی سے ہمارے اسکول اور کالجوں میں ان اصولوں اور طریقوں کی تدریس ابھی ابھی شروع ہوئی ہے، لیکن یہ توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں ذہنی حفظان صحت کو عام طور سے باضابطہ نصاب میں شامل کرلیا جائے گا۔''

(ولیم بی ٹرہون (ایڈ)، لیونگ وائزلی اینڈ ویل، نیویارک، ای پی لپول اینڈ کمپنی انگ 1949، ص14 ایڈیٹر کی اجازت سے)

ذہنی حفظانِ صحت کے مفہوم کی یہ ہمہ گیری ایل ایف شیفر L.F. Shaffer کی پیش کردہ تعریف میں نظر آتا ہے:

''ذہنی حفظانِ صحت کا تعلق جس قدر صحت مند انسان سے ہے اسی قدر بیمار سے بھی یعنی ذہنی حفظان صحت کا تعلق سبھی لوگوں سے ہے۔ وسیع معنوں میں ذہنی حفظان صحت کا مقصد ان افراد کی مدد کرنا ہے جو ایک زیادہ مکمل، شادماں، ہم آہنگ اور موثر زندگی کے حصول کے لیے کوشاں ہوں۔''

(ایل ایف شیفر، دی سائکولوجی آف ایڈجسمنٹ، بوسٹن، ہاؤٹن، مفن کمپنی 1936، ص435، ناشر کی اجازت سے)

ذہنی حفظان صحت کے نظریے سے جہاں تک اساتذہ کا تعلق ہے اس کو ڈبلو کارسن ریان W. Carson Reyan نے بہت اچھی طرح اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے:

''ذہنی حفظان صحت کا تعلق بنیادی طور پر زیادہ صحت مند انسانی تعلقات سے ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان کے کردار سے متعلق جو کچھ بھی علم حاصل کیا گیا ہے اس کو روزانہ زندگی میں برتا جائے منفی اعتبار سے اس کا تعلق ذہنی مریضوں کی ہمدردانہ اور دانشمندانہ دیکھ ریکھ اور علاج سے ہے۔ یقیناً اس کا مطلب ہے کہ ذہنی اور جذباتی دشواریوں کا جلدی پتہ چلایا جائے۔ شدید بیماری اور انتشار کی روک تھام جتنی جلدی ممکن ہو جائے اور جدید سماج کے زیادہ سے زیادہ افراد کے لیے صحت مند زندگی گزارنے کا اہتمام کیا جائے۔ استادوں، سماجی کارکنوں اور دیگر افراد کے لیے جو اپنے روزانہ کے مشاغل میں بچوں، نوجوانوں اور دوسرے انسانوں کے ساتھ زیادہ سروکار رکھتے ہیں۔ ذہنی حفظان صحت کا مطلب ہے کہ وہ نہ صرف اپنے رفقائے کار کی بالیدگی اور نشو ونما کی تفہیم پیدا کریں بلکہ کارکنوں کی شخصیت سے بھی واقفیت پیدا کریں اور دیکھیں کہ خاندان، رفقائے کار، اسکول اور برادری کے ساتھ اس کے اپنے تعلقات کیسے ہیں۔''

(ڈبلو کارسن، ریان ان سی ای اسکنڈ (ایڈ) ایلیمنٹری ایجوکیشنل سائکولوجی نیویارک پرنٹس ہال انگ 1945، ص 378، ناشر کی اجازت سے)

مذکورہ بالا تعریف سے ذہنی حفظانِ صحت کے مضمون کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، اس میں اولین حیثیت ایک سچ اور صحت مند انسانی رشتے کو دی گئی ہے اس کے بعد بالیدگی کے محرکات پر زور دیا گیا ہے پھر جذباتی استقامت کو جو شخصیت کی ایک ذہنی کارکردگی ہے، امتیازی مقصد قرار دیا گیا ہے۔ ذہنی حفظان صحت میں خودفہمی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی تفہیم بھی شامل ہے جن سے بالواسطہ یا براہ راست سابقہ پڑتا ہے۔ یہ صرف عام سمجھ بوجھ اور سائنسی معلومات کے روزمرہ استعمال کا نام نہیں بلکہ یہ ایک رجحان ہے اور زندگی کو دیکھنے کا طریقہ، ذہنی حفظان صحت کا ایک پہلو جسمانی صحت سے تعلق رکھتا ہے جس کو براہ راست نہیں بیان کیا گیا ہے بلکہ مذکورہ بالا بیان میں اس کا حوالہ موجود ہے۔ جسم اور دماغ دو مختلف نام ہونے کے باوجود ایک ہی عضویاتی نظام کا حصہ ہیں۔ جسمانی صحت کا ذہنی صحت پر گہرا اثر پڑتا ہے اس لیے ذہنی صحت میں وہ تمام امکانی علم شامل کرلینا چاہیے جو عمدہ ترین صحت حاصل کرنے اور بیماری سے بچنے کے لیے ضروری ہو۔

عام طور پر مدرسوں میں ذہنی حفظان صحت کے دو پروگرام ہونے چاہئیں:

(1) ذہنی صحت حاصل کرنے میں جتنی بھی رکاوٹیں ہوں انھیں دور کرنا اگر ان کی بیخ کنی ممکن نہ ہو تو انھیں کم کرنا۔

(2) ذہنی حفظان صحت کے پروگرام میں جہاں تک ممکن ہو طالب علموں کے اندر پختگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ ذہنی حفظان صحت کے مسائل کو دور کرنے کے لیے ایک مناسب رویہ پیدا کرسکیں اور زندگی کی ناخوشگواریوں کے سبب پیدا ہونے والے تناؤ کو برداشت کرسکیں جس کو فی الحال دور کرنا ممکن نہ ہو۔ مختصراً اس کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہر طالب علم اسکول کے مختلف تجربات کے حصول میں انتکمال نفس پیدا کرسکے۔

■

ماخذ: درجے کے اساتذہ کے لیے ذہنی حفظانِ صحت، **مصنف:** ہیرالڈ، ڈبلو، برنارڈ، **مترجم:** معین الدین، **ناشر:** ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

دو دوست

مصنف: گی دَموپاساں
مترجم: محمد ریحان

محصور پیرس شدید قحط کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ گھروں کی منڈیر پر پرندے اور نالیوں میں چوہے ناپید ہوتے جا رہے تھے۔ لوگوں کو جو کچھ مل جاتا، وہ کھا رہے تھے۔

موریسو، پیشے سے گھڑی ساز مگر عزلت پسند، بھوکے پیٹ اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے جنوری کی ایک روشن صبح میں چہرے پر اداسی سجائے پیرس کی گلیوں میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کی نظر اچانک اس کے دوست، سوویج، پر پڑی جس سے اس کی شناسائی ساحلِ دریا پر ہوئی تھی۔

جنگ شروع ہونے سے قبل، موریسو ہر اتوار کو علی الصباح اپنے ہاتھ میں بنسی اور پشت پر ٹین کا ڈبہ لیے گھر سے نکل جاتا۔ وہ آرجونٹی سے ریل گاڑی پر سوار ہوتا اور کولومب کے مقام پر اتر جاتا۔ وہاں سے مارونت کے جزیرے تک وہ پیدل ہی سفر کرتا۔ اپنے خوابوں کے اس مقام پر پہنچ کر وہ مچھلیاں پکڑنا شروع کرتا اور دیر گئے شام تک مچھلیوں کا شکار کرتا رہتا۔

ہر اتوار کو وہاں ایک پست قامت، تونگر اور خوش مزاج انسان، سوویج، سے اس کی ملاقات ہوتی۔ وہ 'نوتر دام دَلوریت' میں ایک خردہ فروش تھا اور ساتھ ہی ساتھ ایک جنونی ماہی گیر بھی۔ وہ دونوں اکثر دن کا نصف حصہ ساتھ ساتھ گزارتے۔ ان کے ہاتھوں میں بنسی ہوتی اور پاؤں پانی کے اندر جھولتے رہتے۔ وہاں ساتھ بیٹھے بیٹھے دونوں میں کافی گہری چھننے لگی تھی۔

کبھی کبھی وہ کچھ بھی بات نہیں کرتے اور کسی دن خوب گپ شپ لگاتے۔ وہ الفاظ کی مدد کے بغیر بھی ایک دوسرے کو بخوبی سمجھ لیتے تھے کیونکہ ان کے ذوق و شوق اور احساسات و جذبات میں بڑی یکسانیت تھی۔

موسمِ بہار میں، صبح دس بجے کے قریب، جب تازہ دم سورج اس آبی دھند کو شانت دریا کی سطح پر تیرنے پر مجبور کرتا، جو پانی کے ساتھ ہی بہتی ہے، اور پر جوش ماہی گیروں کی پشت پر گرمی کی آمد کا احساس دلاتا تو موریسو کبھی کبھی اس سے کہتا:

''واہ! کتنا خوش گوار موسم ہے''

اس کے جواب میں سوویج کہتا:

''میں اس سے بہتر کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتا۔''

بس یہی چند الفاظ ایک دوسرے کو سمجھنے اور جاننے کے لیے کافی تھے۔

موسمِ خزاں میں شام کے وقت جب آسمان، ڈوبتے سورج سے، لہولہان ہو جاتا، سرخی مائل بادلوں کا عکس پورے دریا کو سرخ کر دیتا، افق پر جیسے آگ لگ جاتی، دونوں دوستوں کے چہرے آگ کی طرح لال ہو جاتے اور پہلے سے جھلسے ہوئے درختوں پر رونق اتر آتی، جن کے پتے سردیوں کی پہلی ٹھنڈی لمس سے جھڑے ہوتے تھے۔ اس وقت سوویج موریسو کو دیکھ کر مسکراتا اور کہتا:

''کتنا شاندار نظارہ ہے''

اور موریسو اپنی بنسی سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیتا:

''یہ پیرس کی گلیوں سے بہت بہتر ہے!''

جیسے ہی ان دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا، انھوں نے پرجوش انداز میں مصافحہ کیا۔ خود کو ایسے مختلف حالات میں پا کر دونوں ہی بہت جذباتی ہو گئے۔ سوویج نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا:

''حالات بڑے ہی ناسازگار ہیں''

موریسو بھی اداس تھا، اس نے کراہتے ہوئے کہا:

''اور یہ موسم کتنا پیارا ہے! آج سال کا پہلا خوبصورت دن ہے۔''

واقعی میں آسمان بادلوں سے خالی، نیلا اور روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ وہ شانہ بشانہ، متفکر اور اداس، چلتے رہے۔ موریسو اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولا:

''اور ماہی گیری؟ آہ اس کی کتنی اچھی یادگاریں ہیں!''

سوویج نے دریافت کیا:

''ہم کب دوبارہ مچھلی کے شکار پر نکلیں گے؟''

وہ ایک چھوٹے سے کیفے میں داخل ہوئے اور ایک ساتھ ہی ابسنت کے مزے لیے۔ پھر وہ فٹ پاتھ پر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ موریسو چلتے چلتے اچانک رکا اور بولا:

''کیا ہم ایک ایک اور ابسنت لے سکتے ہیں؟''

سوویج نے حامی بھرتے ہوئے کہا:

''جیسی آپ کی مرضی۔''

وہ دونوں ایک شراب کی دکان میں داخل ہوئے۔ جب باہر نکلے، ان کے پیر ڈگمگا رہے تھے۔ وہ پریشان تھے، خالی پیٹ اس انسان کی طرح جس کے معدے میں صرف شراب ہی بھری ہو۔ موسم سہانا تھا۔ ہوا کے نرم جھونکے ان کے چہروں پر گدگدی لگا رہے تھے۔ تازہ ہوا نے شراب کے اثر کو جلد ہی زائل کر دیا۔ سوویج رک کر پوچھا:

''اگر ہم وہاں گئے تو''

''کہاں؟''

''مچھلی پکڑنے''

''لیکن کس جگہ؟''

''وہی اپنے جزیرے پر۔ فرانسیسی چوکیاں کولومب سے قریب ہیں۔ میں کرنل دیوملاں کو جانتا ہوں، ہمیں آسانی سے وہاں سے گزرنے کی اجازت مل جائے گی۔''

موریسو کے بدن میں شدت خواہش سے لرزش پیدا ہوگئی۔

''بہت خوب۔ پھر میں تیار ہوں۔''

مچھلی پکڑنے کے آلات اکٹھا کرنے کے لیے وہ الگ ہوئے پھر ایک گھنٹے بعد وہ دونوں شاہ راہ پر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں وہ کرنل کے زیر قبضہ کوٹھی تک پہنچ گئے۔ کرنل ان کی فرمائش پر مسکرایا اور ان کی خواہش پر اپنی رضامندی کی مہر ثبت کر دی۔ وہ اجازت نامہ لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔

جلد ہی وہ چوکیوں سے دور نکل گئے۔ ویران کولومب سے گزرتے ہوئے انگور کے ان چھوٹے باغوں کے قریب پہنچے جو سین ندی سے متصل ہیں۔ اس وقت تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔

سامنے ہی آرجنتی گاؤں تھا جو سنسان نظر آ رہا تھا۔ 'آرجموں' اور 'سانوا' کی بلندیوں کا پورے علاقے پر دبدبہ تھا۔ نانتیر تک پھیلا ہوا عظیم میدان بالکل خالی اور بنجر تھا، جس کی مٹی سرمئی اور وہاں چیری کے درخت بے برگ وبار تھے۔

سووتج نے اپنی انگلیوں سے چوٹیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''وہاں پروشین ہیں!''

اس ویران منظر کے نظارے سے دونوں دوستوں پر ایک انجان اور مبہم فکر کا حملہ ہوا۔

پروشین! ان دونوں نے انھیں کبھی دیکھا نہیں تھا، لیکن گزشتہ کئی مہینوں سے پیرس کے قرب و جوار میں ان کی موجودگی کو ضرور محسوس کیا تھا، فرانس کو برباد کرتے ہوئے، وہاں لوٹ مار مچاتے ہوئے، قتل عام کرتے ہوئے، لوگوں کو بھوکے مرنے پر مجبور کرتے ہوئے۔ یہ نظر تو نہ آتے تھے مگر بڑے طاقت ور تھے۔ ایک قسم کی توہم پرستانہ دہشت اس نفرت کے ساتھ گھل مل گئی جو وہ پہلے ہی اس نامعلوم، فاتح لوگوں کے لیے محسوس کر رہے تھے۔

موریسو نے کہا:

''اگر ان میں سے کسی سے ہماری ملاقات ہوتی تو؟

سووتج نے پیریسین کے اسی خاص لہجے میں جواب دیا جس کو کوئی بھی چیز ختم نہیں کر سکتی:

''ہم اسے کچھ سوکھی مچھلیاں پیش کرتے۔''

ان کے اردگرد جس طرح کی خاموشی کا پہرہ تھا اس سے خوف زدہ ہو کر وہ دیہی علاقوں میں جانے سے گریز کر رہے تھے۔ آخر میں سووتج نے جانے کا فیصلہ کیا:

''چلو چلتے ہیں، لیکن احتیاط کے ساتھ۔''

وہ انگور کے کھیت میں اترے اور جھک کر رینگنے لگے۔ جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر آگے بڑھے۔ ان کی آنکھیں پریشان تھیں اور کان کھڑے ہوئے تھے۔

دریا کے کنارے تک پہنچنے کے لیے خالی زمین کے ایک حصے کو عبور کرنا باقی تھا۔ وہ کچھ دیر بعد دوڑنے لگے اور جیسے ہی ساحل دریا تک پہنچے، سوکھے سرکنڈوں میں چھپ گئے۔

موریسو نے اپنا گال زمین پر رکھا تا کہ وہ آس پاس کسی کے چلنے کی آہٹ کو سن سکے۔ اسے کچھ سنائی نہیں دیا۔ وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ دونوں بہت اکیلے تھے، بالکل اکیلے۔ انھوں نے خود کو تسلی دی اور مچھلی پکڑنے لگے۔ سامنے سنسان ماروِنت کا جزیرہ تھا جس نے انہیں دوسرے کنارے سے پوشیدہ کر رکھا تھا۔ وہاں ایک چھوٹا ریستوراں بھی تھا جو بند تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سالوں سے ویران پڑا ہو۔ سب سے پہلے سووتج کی بنسی میں گڈجن (مچھلی کی ایک قسم) پھنسی پھر موریسو نے دوسری مچھلی پکڑی۔ اس کے بعد رہ رہ کر وہ اپنی بنسیاں اوپر اٹھاتے اور ان میں سفید رنگ کی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پھنسی ہوتیں۔ وہ ماہی گیری کا بھرپور لطف اٹھا رہے تھے۔

وہ مچھلیوں کو بڑے احتیاط سے مضبوطی سے بنے ہوئے ایک جالی نما تھیلے میں رکھ رہے تھے، جو ان کے پیروں کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ اس عمل میں وہ ایک طرح کی لذت آمیز خوشی محسوس کر رہے تھے۔ اس طرح کی خوشی اس وقت محسوس ہوتی ہے جب آپ اس مسرت کو دوبارہ دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس سے آپ طویل عرصے سے محروم رہے ہوتے ہیں۔

اس بیچ سورج ان کے شانوں کے درمیان سے اپنی گرمی کی نمائش کر رہا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سن رہے تھے۔ وہ کسی کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچ رہے تھے۔ انہوں نے ہر چیز کو نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ وہ مچھلی کا شکار کر رہے تھے۔

لیکن اچانک زمین ایک زوردار دھماکے سے ہل گئی۔ یہ آواز زمین کے بھیتر سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ توپیں پھر سے برسنے لگی تھیں۔

موریسو نے ساحل کے پرے مڑ کر دیکھا، ادھر بائیں جانب عظیم القامت پہاڑ ''موں والیریاں'' کی پیشانی سے سفید دھوئیں کے بگولے اٹھ رہے تھے۔ اس کی چوٹی سے دھوئیں کا دوسرا جھونکا نکلا، چند لمحے میں ایک دوسرا دھماکہ۔ پھر پے در پے کئی دھماکے ہوئے۔ لحہ بہ لحہ پہاڑ موت کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اجلے دھوئیں، جو آہستہ آہستہ شانت آسمان کی طرف اٹھ رہے تھے، وہ پہاڑ کے سر پر بادل بن کر تیرنے لگے۔ سووتج نے کندھا اچکاتے ہوئے کہا:

''تو انھوں نے پھر سے شروع کر دیا!''

موریسو، جو بے چینی سے اپنے فلوٹ کے پروں کو بار بار ڈوبتے دیکھ رہا تھا، جنگ کر رہے پاگلوں کے خلاف اچانک ایک پرامن آدمی کی طرح غصے کا اظہار کرتے ہوئے بڑبڑایا:

''خود کو اس طرح مارنے کے لیے بے وقوف ہونا ضروری ہے۔''

سووتج نے جواب دیا:

''یہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔''

اور موریسو، جس نے ابھی ایک نقرئی مچھلی پکڑی تھی، بولا:

''اور جب تک حکومتیں ہیں ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔''

سووتج نے موریسو کو ٹوکتے ہوئے کہا:

''جمہوریت میں جنگ مسلط نہیں کی جاتی۔''

موریسو نے کہا:

''بادشاہت میں جنگ باہری ملک سے ہوتی ہے اور جمہوریت میں اندرون ملک جنگ جاری رہتی ہے۔''

وہ بڑے اطمینان سے آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ کھلا ذہن رکھنے والے اور تنگ نظر انسان کے ٹھوس دلائل کی بنیاد پر اہم سیاسی مسائل کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے اس بات پر متفق ہو گئے کہ انھیں کبھی آزادی نہیں ملے گی۔ موں والیریاں مسلسل لرزتا رہا۔ فرانسیسی گھروں پر توپوں سے گولے برستے رہے، زندگیاں برباد ہوتی رہیں، لوگ جاں بحق ہوتے رہے، وہاں اور دوسرے ممالک میں عورتوں، نوخیز لڑکیوں اور ماؤں کے انگنت خواب، طویل انتظار کی خوشیاں اور امیدیں ٹوٹتی رہیں۔ یہ سب ان مصائب کی وجہ سے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔

سووتج نے کہا:

''اسی کا نام زندگی ہے۔''

''نہیں، بلکہ یہ کہو کہ اسی کو موت کہتے ہیں۔''

موریسو نے ہنستے ہوئے کہا۔

ان کو اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی، وہ خوف سے کپکپانے لگے۔ جب انھوں نے نظریں پیچھے کی طرف گھمائیں تو دیکھا کہ چار آدمی ان کے کاندھے سے لگے کھڑے ہیں، چار لمبے تڑنگے اور مسلح، نوکروں کی طرح ملبوس، چپٹی ٹوپیاں پہنے اور اپنی بندوق کا نشانہ ان کی طرف کیے ہوئے۔

ان کے ہاتھوں سے بنسیاں چھوٹ کر دریا میں گرنے لگیں۔

چند ہی لمحوں میں انہیں گرفتار کرکے ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ انھیں گھسیٹتے ہوئے ایک کشتی تک لایا گیا اور پھر ایک جزیرے پر پھینک دیا گیا۔ وہاں ایک مکان نظر آیا جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ وہ لاکمیں ہوگا، اس میں تقریباً بیس جرمن فوجی موجود تھے۔

بڑے بالوں والے ایک دیو ہیکل آدمی نے، جو کرسی پر ٹیک لگائے چینی مٹی کے برتن سے بنا ایک بڑا پائپ پی رہا تھا، شستہ فرانسیسی میں ان سے سوال کیا:

''اچھا جناب! کیا مچھلی شکار کرنے کا تجربہ ٹھیک رہا؟''

ایک سپاہی نے مچھلیوں سے بھرا جالی نما تھیلا، جسے وہ خود اپنے ساتھ لایا تھا، افسر کے قدموں میں ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر دیو ہیکل پروشین مسکرایا اور بولا:

''ہے ہے ہے! میں دیکھ سکتا ہوں، اتنے برے نہیں ہیں۔ تاہم، بات کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔ میری بات سنو اور پریشان مت ہو۔''

''میری نظر میں تم دونوں کی حیثیت جاسوس کی ہے۔ میں جانتا ہوں، مجھ پر نظر رکھنے کے لیے تمھیں بھیجا گیا تھا۔ میں تمھیں گرفتار کر چکا ہوں اور اب گولی بھی مار دوں گا۔ تم نے اپنے منصوبے کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر ماہی گیری کا اچھا ڈرامہ کیا ہے۔ لیکن دیکھو، تم میرے ہاتھوں پکڑے گئے، تمہارا نصیب ہی برا ہے۔ کیا کر سکتے ہو، یہ جنگ ہے۔''

''البتہ جب تم چیک پوسٹ سے ہو کر آئے ہو تو تمہارے پاس واپس جانے کا اجازت نامہ ضرور ہوگا۔ تم مجھے وہ پاس دے دو تو میں تمھیں معاف کر دوں گا۔''

دونوں دوست ایک دوسرے کے پہلو میں خاموش کھڑے تھے۔ خوف و دہشت سے ان کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور ان کے ہاتھ گھبراہٹ سے کانپ رہے تھے۔

افسر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے آگے کہا:

''کسی کو بھی اس بات کا علم نہیں ہوگا، تم آرام سے اپنے گھر واپس چلے جاؤ گے۔ یہ راز تمھارے جانے کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن اگر تم نے انکار کیا تو اس کی سزا موت ہے اور وہ بھی فی الفور۔ اب فیصلہ تمھارے ہاتھ میں ہے۔''

وہ چپ چاپ، ساکت و جامد کھڑے رہے۔

پروشین، جو ابھی بھی پرسکون نظر آ رہا تھا، دریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''دیکھو، پانچ منٹ میں تم اس پانی کی تہہ میں ہوگے۔ صرف پانچ منٹ میں! کیا تمہارے والدین ہیں؟''

موں والیریاں توپوں کے حملے سے اب بھی گرج رہا تھا۔

دونوں ماہی گیر خاموش کھڑے رہے۔ جرمن افسر نے اپنی مادری زبان میں کچھ احکامات دیے۔ پھر قیدیوں سے تھوڑی دوری بناتے ہوئے اس نے اپنی کرسی کی جگہ تبدیل کی۔ بارہ آدمی بیس قدم کے فاصلے پر اپنے پیروں پر رائفلیں ٹکائے کھڑے ہو گئے۔

جرمن افسر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

''میں تمھیں ایک منٹ دیتا ہوں، اس کے بعد مزید دو سیکنڈ کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔''

پھر وہ اچانک کھڑا ہوا اور دونوں فرانسیسی قیدیوں کے قریب گیا۔ موریسو کا بازو پکڑ کر کھینچتا ہوا کچھ دوری پر لے گیا اور اس سے دھیمی آواز میں کہا:

جلدی دکھاؤ، کہاں ہے وہ اجازت نامہ؟ تمہارے ساتھی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا، میں ایسے دکھوں گا جیسے میں نرم دل ہوں۔''

موریسو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے بعد وہ افسر سوویج کو بھی ایک گوشے میں لے گیا اور اس سے بھی وہی سوال کیا۔ لیکن سوویج نے بھی اپنی زبان نہیں کھولی۔

وہ دونوں دوست ایک دوسرے کے پہلو میں ہی کھڑے رہے۔

افسر نے حکم دینا شروع کیا۔ سپاہیوں نے ہتھیار اٹھا لیے۔ موریسو کی نظر اتفاق سے مچھلیوں سے بھرے اس جال پر پڑی جو اس سے چند قدموں کے فاصلے پر فرش پر رکھا ہوا تھا۔

سورج کی روشنی نے مچھلیوں کے ڈھیر کو، جو ابھی تک بے چین تھیں، چمک دار بنا دیا تھا۔ موریسو پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ اس نے پوری کوشش کی کہ اس پر کوئی اثر نہ ہو لیکن اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر بتر ہو گئیں۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا:

''الوداع، سوویج۔''

سوویج نے جواباً عرض کیا:

''خدا حافظ، موریسو۔''

دونوں نے مصافحہ کیا، وہ ناقابل تسخیر کپکپاہٹ سے سر سے پاؤں تک لرز گئے۔

افسر نے چیختے ہوئے کہا:

''گولی چلاؤ''

بارہ کی بارہ بندوقیں ایک ساتھ چلنے لگیں۔

سوویج منہ کے بل زمین پر گر گیا۔ طویل القامت موریسو ڈگمگایا اور چکراتے ہوئے اپنے دوست کے بدن پر سو رہا۔ اس کا چہرہ آسمان کی طرف تھا۔ خون کے فوارے اس کی شرٹ سے نکل رہے تھے جو سینے کے پاس چھلنی ہو گئی تھی۔

جرمن افسر نئے احکامات دینے لگا۔ اس کے سپاہی منتشر ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ سب رسیوں اور پتھروں کے ساتھ واپس آئے۔ انھوں نے دونوں مردہ دوستوں کے پیروں سے پتھر باندھے اور دریا کے کنارے لے گئے۔

موں والیریاں، جواب دھوئیں کے پہاڑ میں تبدیل ہو گیا تھا، سے مسلسل دھماکے کی آوازیں اٹھتی رہیں۔

دو فوجیوں نے مل کر موریسو کو اٹھایا، ایک نے سر اور دوسرے نے ٹانگیں پکڑیں۔ دوسرے سپاہیوں نے بھی سوویج کو اسی طرح زمین سے اٹھایا۔ کچھ دیر پوری طاقت سے ہوا میں جھلاتے رہے اور پھر ان لاشوں کو پانی میں دور پھینک دیا۔ لاشیں پہلے ٹیڑھی ہوئیں اور پھر سیدھی ہو کر پانی میں ڈوبنے لگیں۔ پتھروں نے پہلے ان کے پیر کھینچنا شروع کیے۔

پانی میں چھپاکے کی آواز ابھری، بلبلے اٹھے، لرزش پیدا ہوئی، پھر وہ پرسکون ہو گیا۔ چھوٹی چھوٹی کچھ لہریں بنیں جو سفر کرتی ہوئی آئیں اور ساحل سے ٹکرا گئیں۔ پانی کی سطح پر ادھر ادھر کچھ خون کے ذرات تیر رہے تھے۔

جرمن افسر نے، جواب بھی پرسکون تھا، دھیمی آواز میں کہا:

''اب مچھلیوں کی باری ہے۔''

اتنا بول کر وہ واپس مکان کی طرف نکل گیا۔ اچانک اس کی نظر اس جال پر پڑی جس میں مچھلیاں تھیں۔ اس نے اسے اٹھایا، اس کا جائزہ لیا، مسکرایا اور زور سے چلایا ''ولیم''

سفید پیش بند پہنے ایک سپاہی دوڑتا ہوا آیا۔ جرمن افسر نے اس کی طرف دو مردہ دوستوں کی پکڑی ہوئی مچھلیاں پھینکتے ہوئے حکم دیا:

''ان چھوٹے جانوروں کو میرے لیے فرائی کرو، اس سے پہلے کہ یہ مر جائیں۔ یہ کھانے میں مزیدار ہوں گے۔''

پھر وہ سگار پینے میں مصروف ہو گیا۔

■

Mohd Raihan
Department of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi- 110025
Mob.:7366083119
mdraihanjmi@gmail.com

مصنف: شیاما چرن دوبے
مترجم: ڈاکٹر محمد عبدالقادر عمادی

خاندانی تعلقات کا تانا بانا

ہندوستان کی دیہی کمیونٹی کے سماجی ڈھانچے میں خاندان کو سب سے اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی محض یہ اہمیت نہیں ہے کہ اس کے خاص معاشی فرائض ہیں اور سماجیت اور سماجی کنٹرول کی ایجنسی کے طور پر اس کا نمایاں رول ہے بلکہ اس کو عام ہندوؤں میں بہت ہی مخصوص رسوماتی اہمیت بھی حاصل ہے۔

کلاسیکی ہندومت میں زندگی کے چار مدارج بتائے گئے ہیں:

(1) کنواری یا تجرد کی زندگی Brahmcharya ، (2) خاندانی زندگی (Grahast Ashram) ، (3) تارکانہ زندگی (Vana Prastha) اور (4) ترک دنیا (Sanayas) پہلی منزل میں احساسات اور خواہشات پر قابو پا کر یکسوئی حاصل کی جاتی ہے تاکہ تحصیل علم کے لیے خود کو وقف کیا جاسکے۔ یہ زندگی کا تعمیری دور ہوتا ہے اور کسی شخص سے یہ امید کی جاتی ہے کہ اس دوران وہ صحیح طریقے پر سماجی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے تیار ہوجائے گا۔ دوسری منزل پر وہ زندگی کے دور میں داخل ہوجاتا ہے اور سماجی ذمے داریوں میں حصہ لینا شروع کرتا ہے۔ اب اسے شادی کرنا ہے اور صاحب اولاد ہونا ہے۔ یہ تخلیقی زمانہ ہوتا ہے اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی میں صرف ہوتا ہے۔ آخری دو غور و فکر کی منزلیں ہیں۔ یہ دنیاوی ساز و سامان اور دنیاوی تعلقات کو بالآخر ترک کردینے کی تیاری کا دور ہوتا ہے اور اس شخص کو چاہیے کہ اپنے میں دنیا سے بے تعلقی کا رجحان پیدا کرے اور فکر کے لیے اپنے آپ کو وقف کرے۔ جب یہ حاصل ہوجائے تو اس کے لیے ایسا وقت آجائے گا کہ وہ اپنی تمام ملکیت اور تعلقات سے قطع تعلق کرسکے گا۔ موجودہ دور کے ہندوستانی دیہاتوں میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اس سماجی فلسفے کو جو آشرموں Ashrams یا منزل حیات کے طرز عمل کا پس منظر ہے، سمجھ سکتے ہوں یا بیان کرسکتے ہوں، لیکن اس کا نچوڑ ان تک پشتہا پشت سے زبانی روایات اور مختلف مذہبی کویوں کی تعلیمات کے ذریعے پہنچا ہے اور اس طرح ان کے طرز فکر اور اقدار و کردار میں جاگزیں ہوچکا ہے۔ ہندوستان کے دیہاتی علاقوں میں لڑکوں کی بے راہ روی سماجی طور پر نامناسب سمجھی جاتی ہے۔ شادی کو عام طور پر فطری اور ضروری خیال کیا جاتا ہے۔ صرف معذور اور اپاہج ہی غیر شادی شدہ رہتے ہیں۔ گو لوگ بڑھاپے میں اپنے گھربار سے شاذ ہی دست بردار ہوتے ہیں لیکن بوڑھے مرد یا عورت جو دنیاوی ساز و سامان سے بے حد لگاؤ رکھتے ہیں ان پر بڑی لعن طعن ہوتی ہے اور اکثر ان پر جملے کسے جاتے ہیں ''کیا مرنے کے بعد یہ لوگ اپنی دولت اس دوسری دنیا کو لے جائیں گے۔'' اسی زمانے میں انھیں مذہب کا خیال آتا ہے اور وہ سوچنے لگتے ہیں کہ آئندہ زندگی میں روح کا کیا حشر ہوگا۔ اسی لیے اس زمانے میں وہ عام طور پر مقامات مقدسہ کی زیارت کرتے ہیں۔ ایک معنی میں 'آشرموں' کے فلسفے کی اساس یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ گاؤں کے ہندوؤں کی زندگی اور خیالات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ گاؤں کے مسلمان اپنے ہندو پڑوسیوں کے ساتھ ان سماجی رجحانات میں شریک ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے ساتھ انھوں نے اپنا مذہبی عقیدہ بدل دیا ہے لیکن زندگی کے سماجی اور ثقافتی دائرے میں وہ اب بھی ہندوؤں ہی جیسے بنیادی رجحانات رکھتے ہیں۔ اپنے گھریلو اخلاقیات اور تصورات میں یہ دونوں گروہ کافی یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

گاؤں کے لوگوں کے لیے شادی اور خاندان دونوں کی ضرورت از خود واضح ہے۔ یہ ضروری ہے کہ خاندان کا سلسلہ آگے چلتا رہے۔ ایک نرینہ وارث ہونا چاہیے۔ ایک غیر شادی شدہ شخص جو عمر کی زیادتی کے باعث شادی کے قابل بھی نہ رہا ہو قابل رحم ہوتا ہے۔ ایسے میاں بیوی جن کے لڑکا نہ ہو خوش نہیں رہتے۔ بے اولاد ہونے اور کسی عورت میں اولاد نرینہ پیدا کرنے کی نااہلی کے باعث گھرانے میں کثیر الازدواجی زندگی ناگزیر ہوجاتی ہے۔ گاؤں کی تمام ذاتوں اور سماجی گروہوں میں شادی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ 2494 افراد کی کمیونٹی میں آبادیاتی سروے سے پتہ چلا کہ صرف دو اشخاص ایسے تھے جو غیر شادی شدہ تھے اور وہ دونوں عورتیں تھیں۔ ان میں سے ایک گونگی، بہری اور دوسری مرگی کی بچپن سے مریضہ تھی۔ اس کے علاوہ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بلاشبہ چور ہے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے خاندان کا سلسلہ جاری رہنا ایک اور وجہ سے بھی ضروری ہے۔ اپنے متوفی والدین اور اجداد کی روحوں کے لیے پانی دینے کی تقریب صرف لڑکا ہی انجام دے سکتا ہے جس کے بغیر ان کی روحوں کو سکون نہیں مل سکتا۔ اچھوت ذاتیں نیز نیم قبائلی گروہوں میں بھی کسی قدر تبدیلی کے ساتھ یہ رسم جاری ہے۔ مسلمان نہ تو اس پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان کے پاس اس قبیل کی کوئی رسم ہے لیکن لاولدی کی صورت میں انھیں احساسات کے ساتھ وہ ہندوؤں کے شریک ہیں۔

خاندانی ڈھانچہ

'پدر نسبی' اور 'پدر مقامی' مختصر یہ مشترک خاندان ہی قاعدے کے مطابق گھر ان کی وہ اکائی ہے جو دیہی ہندوستان کے اس حصے میں پائی جاتی ہے۔ جب ایک داماد اپنی بیوی کے ماں باپ کے ساتھ رہنے لگتا ہے تو ہمیں کبھی کبھی 'مادر مقامی' طرز کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا ہے اور زیادہ تر ان چند یتیموں اور لڑکوں تک محدود ہے جن کے والدین بڑے غریب ہوتے ہیں اور اس لیے ان کے لڑکے بیوی حاصل کرنے کے

لیے لڑکی کے گھر میں بہ وجہ منسوبیت نوکری کرتے ہیں اور بعد کو خسر کے ساتھ رہنے لگتے ہیں۔ مشترک خاندان کو سماجی روایات کی حمایت حاصل ہوتی ہے۔

مندرجہ ذیل تختہ ایک مثالی مشترک خاندان کا خاکہ پیش کرتا ہے:

آبائی والدین اجداد

بھائی اور ان کی بیویاں	خود: بیوی	غیر شادی شدہ بہنیں
بھتیجے اور بھتیجیاں	لڑکے اور ان کی بیویاں	غیر شادی شدہ لڑکیاں
	پوتے پوتیاں	

کسی ایسے خاندان کی اکائی کا پتہ لگانا واقعی دشوار ہے جہاں ایک ہی چھت کے نیچے پانچ نسلیں مل جل کر رہتی ہوں۔ آندھرا پردیش کے مواضع بالخصوص تلنگانہ میں کسی ایسے خاندان کا ملنا دشوار ہے جس میں وحدانی خاندانوں کی تین نسلیں ایک ہی مکان میں رہتی ہیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں چھوٹے قصبے اور شہروں کے اندر ایسے بڑے مشترک خاندان اب بھی ملتے ہیں لیکن گاؤں میں یہ اکثر دکھائی نہیں دیتے۔ حقیقی طور پر ملک کے اس حصے میں مشترک خاندان کی نسبتاً چھوٹی اکائیاں ہیں اور بیشتر ان میں والدین، ان کے شادی شدہ لڑکے، ان کی بیویاں اور بچے یا بھائی۔ ان کی بیویاں اور

خاندان کے ملاپ کے لیے ایسی رسوم جن کا تعلق زندگی کے اہم مراحل سے ہوتا ہے۔ اچھے مواقع پیدا کرتی ہیں۔ خاص طور پر موت کے سانحہ پر پرانے جھگڑے اور غلط فہمیاں عام طور پر بھلا دی جاتی ہیں اور تمام قریبی رشتے دار آخری رسوم کی ادائی کے لیے جمع ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد جو رسومات ہوتی ہیں ان میں خاندان کی جملہ شاخوں کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی اور اس موقع پر کسی کی بھی غیر حاضری کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ یہ چیز غیر موجود رہنے والوں میں اور خاندان کے دیگر افراد میں ہمیشہ کے لیے قطع تعلقات کا باعث بن سکتی ہے۔

بچے شامل ہوتے ہیں۔ اگر چہ مشترک خاندان کو مثالی خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ بات عام ہے کہ لڑکے شادی کے چند ہی سال کے اندر اپنے والدین سے علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ اس علیحدگی کا نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ وہ ایک اور مختصر خاندان شروع کرتے ہیں جس میں ابتدا میں صرف میاں بیوی ہوتے ہیں۔ جیسے جیسے لڑکوں کی تعداد بڑھتی ہے ابتدائی خاندان وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جب لڑکے بڑے ہوجاتے ہیں، شادیاں کر لیتے ہیں اور اپنی بیویوں کے ساتھ والدین کے گھر میں رہتے ہیں تو اس گھر کی اکائی کو پھر ایک مرتبہ مشترک خاندان کے زمرے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں 120 خاندانوں کی سوانحی تفصیلات کا مطالعہ کیا گیا۔ 34 فیصد ایسی صورتیں تھیں جن میں شادی سے دو سال کے اندر لڑکوں نے اپنے والدین سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ 36 فیصد شادی سے دو اور تین سال کے اندر الگ ہوگئے تھے۔ شادی سے تین سال بعد مگر پانچ سال کے اندر 28 فیصد نے علیحدگی اختیار کی تھی۔ صرف 22 فیصد لڑکے ایسے تھے جو شادی کے پانچ سال بعد بھی اپنے والدین کے ساتھ رہ رہے تھے۔ چونکہ اکثر شادیاں بالغوں میں ہوتی ہیں اس لیے واقعی طور پر ازدواجی زندگی شادی کی تقریب مکمل ہونے کے بعد ہی یا زیادہ سے زیادہ اندرون شش ماہ شروع ہوجاتی ہے۔ مندرجہ بالا تجزیے کے لیے حقیقی ازدواجی زندگی کی ابتدا سے شادی کا سال شمار کیا گیا۔

اس کے علاوہ ان کے تاریخی تجزیے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ بیشتر صورتوں میں ترقی کا طریقہ یکساں رہا ہے۔ شادی کے بعد ایک سال کے لگ بھگ لڑکا اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہے۔ اور اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ رہتی ہے۔ اس دوران گھریلو جھگڑے اور نااتفاقیاں شروع ہوجاتی ہیں اور وہ علیحدہ ہوجانے کی بابت سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ بعض صورتوں میں ایسا دوسرے سال کے دوران ہوتا ہے اور دیگر صورتوں میں تین تا پانچ سال لگ سکتے ہیں جو لوگ معاملات پانچ سال تک سنبھال سکتے ہیں وہ آرام سے ایک ہی چھت کے نیچے اور بھی زیادہ مدت تک رہتے ہیں۔ بہر حال بعض صورتوں میں علیحدگی دس پندرہ سال ساتھ رہنے کے بعد بھی ہوئی ہے۔

کوئی نوجوان شادی شدہ اپنے والدین یا بھائیوں سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی عام طور پر اپنے خاندان یا خاندانوں سے قریبی تعلقات باقی رکھتا ہے۔ تاہم چونکہ علیحدگی کی فوری وجہ اکثر جھگڑا یا رائے میں سخت اختلافات ہوتے ہیں اس لیے کچھ زمانے تک علیحدہ ہونے والے خاندانوں میں تعلقات میں کشیدگی برقرار رہتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان میں بات چیت بھی نہ رہے۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ جھگڑے کی تلخی کم ہوتی جاتی ہے اور اسی لیے بڑے خاندانوں کی مختلف شاخوں میں میل ملاپ پھر پیدا ہوجاتا۔ جب اصل خاندان اور اس کے ملحقہ خاندان میں تعلقات پھر برقرار ہوجاتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کے معاملات اور مسائل میں دلچسپی لینا شروع کرتے ہیں۔ رسومات، دعوتیں اور تہوار ان سب کو اکٹھا کر دیتے ہیں۔ خاندان کے ملاپ کے لیے ایسی رسوم جن کا تعلق زندگی کے اہم مراحل سے ہوتا ہے۔ اچھے مواقع پیدا کرتی ہیں۔ خاص طور پر موت کے سانحہ پر پرانے جھگڑے اور غلط فہمیاں عام طور پر بھلا دی جاتی ہیں اور تمام قریبی رشتے دار آخری رسوم کی ادائی کے لیے جمع ہوجاتے ہیں۔ اس کے بعد جو رسومات ہوتی ہیں ان میں خاندان کی جملہ شاخوں کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی اور اس موقع پر کسی کی بھی غیر حاضری کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ یہ چیز غیر موجود رہنے والوں میں اور خاندان کے دیگر افراد میں ہمیشہ کے لیے قطع تعلقات کا باعث بن سکتی ہے۔

اس ضمن میں اس طرف اشارہ کیا جانا ضروری ہے کہ کمیونٹی میں خاندان کی اصطلاح کے مترادف ایک تصور پایا جاتا ہے جس میں تین مختلف سماجی اکائیوں کا مفہوم مضمر ہوتا ہے جو کسی حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں (1) ابتدائی خاندان یا گھر (2) توسیع خاندانی اکائی (3) اس سے وسیع تر گروہ جس میں پدری قریبی رشتے دار شامل ہوں۔ مختلف صورتوں میں خاندان کی ساخت مختلف ہوتی ہے۔ بہت سی صورتوں میں اس میں صرف میاں بیوی ان کے لڑکے اور غیر شادی شدہ بیٹیاں شامل ہوتی ہیں۔ دوسری صورتوں میں ایک یا دونوں والدین، غیر شادی شدہ بھائی اور غیر شادی شدہ بہنیں اس میں شامل ہوتے ہیں، شادی کے بعد بھائی اور لڑکے اکثر اپنا علیحدہ گھر بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح والدین جو اپنے بیٹے سے دس یا بیس سال پیشتر علیحدہ ہوگئے تھے، اس کے ساتھ پھر رہ سکتے ہیں۔

■

ماخذ: ہندوستانی گاؤں، مصنف: شیاما چرن دوبے، مترجم: ڈاکٹر محمد عبدالقادر عمادی، دوسرا ایڈیشن: 1989، ناشر: ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

اقتصادیات کا نظریۂ قدر

سید اطہر رضا بلگرامی

اصول معاشیات کی تمام مروجہ مستند کتابوں کا پہلا حصہ جہاں صارفین کے طرز عمل (Consumer Behaviour) کی تشریحات ملتی ہیں، ان میں سب سے دلکش تشریح نظریہ قدر (Utility) کی ہے جو معاشیات کے روایتی خشک وغیر دلچسپ انداز بیان و تشخیص سے ہٹ کر انسانی احساسات و مشاہدات کے قریب لگتی ہے۔ اکنامکس کی پرپیچ غیر مانوس ومختلف النوع اصطلاحات سے لبریز اصولوں کی وضاحتوں کے درمیان نظریہ قدر کی تفصیلات اور اس سے وابستہ نظریوں کو پڑھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اچانک اس میں کہیں سے کوئی فرحت بخش ہوا کا جھونکا آ گیا۔ بے آب وگیاہ صحرا میں نخلستان نظر آ گیا۔ چلیے آج اس کی تشریح پڑھیے اور محسوس کیجیے کہ معاشیات کا یہ نظریہ آپ کی زندگی سے کیسا مانوس ہے۔

معاشیات کی کتابوں میں نظریہ قدر کی تشریح بیانیہ انداز میں بھی ہے اور ریاضی والجبرے کے فارمولے اور جیومیٹری کی خاکے نما تصویروں کی مدد سے بھی ہے۔ میں تکنیکی زبان اپنانے سے قبل بیانیہ انداز اپنا رہا ہوں تا کہ نظریہ قدر معاشیات کے دائرے میں رہتے ہوئے آپ کے قریب رہے اور پھر پڑھتے پڑھتے جب آپ کی فکر میں بالیدگی پیدا ہونے لگے تو پھر ریاضی والجبرے کی تکنیکی زبان اپنا کر پرپیچ لکیروں میں مقید ہو کر انھیں تشریحات کو زیادہ گمبھیر بنا لیجیے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کسی شے میں کوئی کشش کیوں محسوس کرتے ہیں؟ کیوں کسی شے کو دیکھتے ہی اس کے کارآمد ہونے کا احساس کرتے ہیں؟ یا اس کے برعکس کسی شے میں آپ کوئی کشش محسوس نہیں کرتے؟ دیکھتے ہی اس کے بے مصرف ہونے کا احساس کرتے ہیں، کیوں؟ معاشیات میں اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے میں انسان کی کسی نہ کسی ضرورت کی ہر تسکین کی قوت پوشیدہ ہے اور اسی باطنی قوت کا احساس انسان میں اس شے کے لیے قدر پیدا کرتا ہے۔ وہ شے باعث کشش بن جاتی ہے۔ جب تک انسان اس شے کی اس صفت یا قوت سے بے خبر رہتا ہے، اس کے لیے کوئی کشش نہیں پاتا۔ وہ شے اس کے لیے بے قدر و قیمت ہی رہتی ہے۔ معاشیات میں قدر (Utility) کو محسوس کرنے کی پہلی و بنیادی شرط یہی ہے کہ کسی شے میں انسان کی کسی نہ کسی ضرورت کی تسکین کی قوت ہو اور انسان کو اس کا علم بھی ہو۔

معاشیات کے دائرے میں قدر کی دوسری اہم شرطِ شناخت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کمیابی میں ابھرتی ہے۔ افراط میں نہیں۔ ہوا، پانی، سورج کی روشنی و اس کی تمازت سب خدا کے عطیات ہیں اور یہ اتنے قیمتی ہیں کہ ان پر بنی نوع انسان ہی نہیں، حیوانات، نباتات سبھی کی بقا ٹکی ہوئی ہے۔ اس کی قدر وافادیت کا تعین مشکل ہے۔ یہ سب اتنی افراط میں ہیں کہ انسان کو ان کی قدر کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ ذرا ان کے دائرۂ دستیابی کو محدود کر دیجیے تو پورے طور پر قدر ابھر آتی ہے۔ انتہائی حبس و اس میں ایک ہلکے سے فرحت بخش ہوا کے جھونکے کی قدر بتلائیے کتنی ہوتی ہے؟ بے آب وگیاہ صحرا میں بھٹکتے ہوئے مسافر کو کہیں دور نظر آنے والا تھوڑا سا پانی کا ذخیرہ اس کی کتنی قدر و منزلت کو بڑھا دیتا ہے، محسوس کیجیے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں آکسیجن نہیں ہوتی۔ غوطہ خور کی پشت پر لگا ہوا آکسیجن کا سلنڈر کتنا قیمتی و اہم بن جاتا ہے۔ غور کیجیے۔ وہ غوطہ خور اپنی نارمل زندگی میں کبھی دھیان بھی نہیں دیتا کہ سانس کی آمد و شد میں آکسیجن کی کیا اہمیت ہے، کیونکہ افراط اس کا احساس ہی نہیں ہونے دیتی۔ ہاں جہاں آکسیجن کی شدید کمی ہو، وہاں سلنڈر میں بند اس کی محدود و مقدار کی قدر کا احساس کیجیے جو غوطہ خور کی زندگی کی ضمانت ہے۔ یہی صورت اسپتال میں کسی مریض کے سرہانے لگے آکسیجن سلنڈر کی بھی ہے، جہاں محدود و مقدار اس کی زندگی کو قائم رکھنے میں معاون ہو رہی ہے۔ یہاں اس سے اور اس کے تیمارداروں سے اس سلنڈر کی قدر و قیمت پوچھیے۔ یہ مثالیں تو مخصوص ہیں۔ آپ تو معمولاتِ زندگی میں دیکھیے کہ جس وقت گھریلو اشیائے صرف کی تعداد میں افراط ہو جائے، ان کی قدر گھٹ جاتی ہے اور جب یہی تعداد بہ وجہ استعمال گھٹنے لگے تو بتدریج قدر و منزلت بڑھنے لگتی ہے۔ خرچ میں سلیقہ و تنظیم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ احتیاط بھی برتی جانے لگتی ہے اور یہ سارے افعال قدر و منزلت کا ہی عکس ہوتے ہیں۔ مریض کی نازک حالت میں بروقت ڈاکٹر کی دستیابی اس کی قدر کو کتنا بڑھا دیتی ہے، سوچیے۔

معاشیات میں قدر کا اہم رشتہ قیمت سے ہے۔ کسی شے کو حاصل کرنے کے لیے جو ہم قیمت ادا کرتے ہیں، وہ دراصل اس شے کی قدر کا پیمانہ ہوتی ہے۔ نایاب ہیرے یا کسی تاریخی نادر و نایاب اشیا کی انتہائی بلند قیمت اس کے نادر و نایاب ہونے کی قیمت ہے اور صاحب حیثیت اس کو حاصل کر کے گویا ایک منفرد عظمت و حشمت کے احساس کی تسکین کرتا ہے۔ قیمت کی ادائیگی کی استعداد، جس کو ہم قوتِ خرید کہتے ہیں اور جس کو آمدنی کی سطح سے ناپا جاتا ہے مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے قدر کی نوعیتیں بھی جداگانہ ہوتی ہیں، لیکن جداگانہ ہونے کے باوجود مطمئن ہونے کی سطح (Level of Satisfaction) مساوی رہتا ہے۔ اگر ایک صاحب حیثیت کے لیے قیمتی کار اس کو کسی قدر و قیمت کی سطح کا احساس کرا کر مطمئن کرتی ہے، تو کسی دوسرے کم صاحب حیثیت شخص کو اسی قدر و قیمت کا احساس موٹر سائیکل یا محض سائیکل کرا سکتی ہے۔ یہاں قوت خرید کے فرق کے باوجود قدر کی سطح اور نتیجتاً مطمئن ہونے کی سطح مساوی ہوگی۔ ایک کروڑپتی کے لیے ادنیٰ کرنسی نوٹ، کوئی قدر و قیمت نہ رکھتا ہو، اس کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کوئی جھماکا نہ ہو، آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہ ہو لیکن کسی فقیر، نادار و غریب سے پوچھیے کہ وہ اس کی کیا قدر و قیمت آنکتا ہے۔ ایک وقت پیٹ کی آگ بجھ جانے کا یقین اس نوٹ کی قدر و قیمت کو اس کی نگاہ میں کن اونچائیوں پر پہنچا دیتی ہے، ذرا سوچیے اس کے لیے اس نوٹ کی قوتِ خرید کی عظمت کا احساس کیجیے۔ قیمت سے منسلک قدر و قیمت کی باقاعدہ تشریح بعد

میں دوں گا۔ ابھی تو محض معاشیات کے دائرے میں قدر کا تعارف پڑھیے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت اور کرتا چلوں کہ قیمت جو قوتِ خرید کا مظہر ہے، قدر کا پیمانہ بنتی ہے، لیکن بلند قیمت ہونے پر کمزور یا پست قوتِ خرید والے اگر اس شے کو حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ ان کو اس شے کی قدر کا احساس نہیں ہے۔ یہ شخص اس شے کے افادہ سے بخوبی واقف ہے لیکن فی الوقت اس کی نگاہ میں اس شے کی قدر اس لیے نہیں ہے کہ اس کو خرید کر اپنے مصرف میں لانے کا اہل نہیں ہے۔

مدتِ وقت (زمانہ) اور فاصلے بھی قدر اور اس کے معیار کا تعین کرتے ہیں۔ شراب کہنہ کی بڑی قدر ہے، بڑی اونچی قیمت ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ کمیاب ہے۔ دیگر شرابوں کی دستیابی کے مقابلے محدود ہے بلکہ اس لیے بھی اس کی تیاری میں دوسری شرابوں کے مقابل، زیادہ وقت لگا ہے۔ اب جتنا وقت زیادہ لگے گا (جتنی کہنہ ہوگی) اتنی ہی قیمتی ہوگی، اتنی ہی زیادہ اس کی قدر ہوگی۔ چاول کے کچھ اقسام بھی قیمت و مدت کے لحاظ سے اپنی قدر و قیمت بڑھاتے ہیں۔ یہی صورت فاصلے کی ہے۔ گنگا کے کنارے رہنے والوں کو گنگا کی پاکیزگی کا وہ احساس نہیں جتنا ان کو جو اس سے بہت فاصلے پر رہتے ہیں۔ حرم شریف سے متصل رہنے والوں کے دلوں میں وہ عقیدت نہیں ہوگی جو اس سے ہزاروں میل دور دراز ملکوں میں رہنے والوں کے دلوں میں ہوگی۔

انسانی شعور کی بالیدگی بھی قدر کی سطح کو طے کرتی ہے۔ نوجوانوں میں ہوسکتا ہے کہ بہت سی اشیائے خدمات کی فی الوقت کوئی قدر نہ ہو لیکن طویل عمر کا تجربہ رکھنے والے بزرگ، عمر کے نشیب و فراز کو جھیل کر دوربینی پیدا کرنے والے معمر حضرات واقف ہیں کہ آئندہ آنے والے زمانے میں ان کی کیا قدر ہوگی۔ انسان میں پس اندازہ کرنے کا جذبہ اسی پختہ شعور سے پرورش پاتا ہے اور بیشتر وہی حضرات زیادہ مطمئن نظر آتے ہیں جو حال کے ساتھ ساتھ مستقبل پر بھی نگاہ رکھتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے جو مستقبل کی قدر و قیمت کو حال میں طے کرتے ہیں۔

یوں تو قدر کی کثیر الجہتی سمتیں ہیں لیکن معاشیات نے اس کو ایسی صفت یا قوت سے آنکا ہے جو انسان کی کسی ضرورت کی تسکین کا وسیلہ بن جائے۔ قیمت کی ادائیگی اسی سے منسلک ہے اس لیے قدر کو قیمت کے توسط سے بھی متعارف کرایا جاتا ہے۔ اب میں خالص معاشیات کے دائرے میں رہ کر قانونِ قدر کی وضاحت کروں گا۔

اقتصادیات کی کتابوں میں بتلایا گیا کہ اگر دیگر باتیں یکساں رہیں تو صرف کی پہلی اکائی (یونٹ) سب سے بلند قدر دے گی اور جیسے جیسے صرف کی یہ اکائیاں بڑھتی جائیں گی۔ ہر اگلی اکائی پر قدر کی سطح گھٹتی جائے گی۔ صرف کی ایک سطح وہ ہوگی جہاں قدر صفر ہوجائے گی اور یہی سطح اطمینان کل 'Maximum/ Optimum Satisfaction' کی ہوگی۔ اس سطح کے بعد اگر مزید صرف کی اکائیوں کو بڑھایا جاتا ہے تو قدر بجائے مثبت ہونے کے منفی ہوجائے گی یعنی غیر مطمئن (Dis-satisfaction) ہونے کی کیفیت پیدا ہوجائے گی۔ اب اس کی وضاحت چند روزمرہ کے امور سے کیجیے اور دیکھیے کہ یہ قانون کہاں تک صحیح ہے۔ آپ کو جس وقت شدید پیاس لگی ہو تو پانی سے بھرے گلاس کا پہلا گھونٹ جو فرحت و آسودگی کا احساس کرائے گا، دوسرا گھونٹ اس سے کم اور آخری گھونٹ سب سے کم کرائے گا۔ اب یہ بات دیگر ہے کہ پیاس ایک گلاس پانی سے بجھتی ہے یا دو گلاس پانی سے۔ اگر دوسرے گلاس کی بھی ضرورت محسوس ہورہی ہے تو اس کا آخری گھونٹ سب سے کم آسودگی کا احساس کرائے گا۔ یہی بات بھوک میں کھانے پر بھی صادق آتی ہے۔ بھوک میں کھانے کا پہلا نوالہ جو آسودگی کا احساس کرائے گا، دوسرا تیسرا نہیں۔ ہر نوالے پر آسودگی بتدریج گھٹتی جائے گی اور یہاں تک کہ آخری روٹی یا نوالہ سب سے کم آسودگی دے گا۔

پیاس میں پانی کے ہر گھونٹ کے ساتھ اور بھوک میں ہر نوالے کے ساتھ احساس تسکین بڑھتا جائے گا۔ اس لیے ہر اگلے گھونٹ یا ہر اگلی روٹی یا اگلے نوالے میں سے قوت تسکین گرتی جائے گی۔ ہر شے کے استعمال پر یہ قانون صادق آتا ہے۔ آپ ملبوسات کی تعداد لے لیجیے۔ کار، سائیکل کی تعداد لے لیجیے۔ مکان لے لیجیے۔ جس کی آپ کو ضرورت ہے اس کی پہلی اکائی سب سے زیادہ تسکین کا ذریعہ بنتی ہے اور جیسے جیسے اس کی تعداد میں اضافہ کرتے جاتے ہیں، ہر اگلا اضافہ سابقہ اکائی کے مقابل تسکین کا احساس کم کراتا ہے۔ اس قانون کے لیے بھی شرائط ہیں جن کو سمیٹ کر ہم 'اگر دیگر باتیں یکساں رہیں' کے جملے میں بیان کرتے ہیں۔ اس قانون کے صحیح طور پر نافذ ہونے کے لیے پہلی شرط یہی ہے کہ انسان معقول فکر و ذہن کا ہو۔ کنجوس اور ہوس والے انسان کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ Rational Human Being جب کسی چیز کا استعمال کرتا ہے تو اس شے کی پہلی اکائی میں سب سے زیادہ تسکین کا احساس کرتا ہے اور ایک سطح وہ آتی ہے جب وہ اس شے کی آخری اکائی سے سب سے کم تسکین پاتا ہے یعنی اس کی ضرورت مکمل طور پر پوری ہوگئی اور وہ پورے طور پر مطمئن ہوگیا۔ یہ صفت کنجوس اور ہوس والے انسانوں میں نہیں پائی جاتی۔ اس لیے اس قانون کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ استعمال کے اوقات اور کوالٹی واقسام میں تبدیلی نہ ہو۔ اگر آپ پیاس میں وقفہ دے کر پانی پیتے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ ہر وقفہ کے بعد پہلا گھونٹ مساوی تسکین دے یا اگر پہلا گھونٹ سادہ پانی کا پیا اور دوسرا گھونٹ ٹھنڈے پانی کا پیا تو دوسرا گھونٹ پہلے کی بہ نسبت زیادہ تسکین دے۔ یہی صورت بھوک میں کھانے کی ہے۔ اگر پہلا نوالہ باسی روٹی کا لیا اور دوسرا تازہ و گرم روٹی کا تو دوسرا نوالہ زیادہ تسکین دے گا یا کھانے کے درمیان کوئی اچھی اور زیادہ ذائقہ دار چیز سامنے آگئی تو اس کا نوالہ سابقہ نوالوں کی بہ نسبت زیادہ تسکین کا احساس کرائے گا۔ یہی صورت وقت کے بدلنے میں پیدا ہوسکتی ہے۔ بھوک کا اپنا ایک وقت ہے۔ اگر وہ ٹل گیا اور بے وقت کھانا کھایا تو وہ تسکین حاصل نہیں ہوگی یا معینہ وقت سے بہت پہلے، یعنی بھوک سے قبل، کھالیا تو بھی وہ تسکین حاصل نہیں ہوگی۔

تیسری شرط انسان کی آمدنی، مقام اور ذہنی سطح کی ہے۔ ان سب میں بھی تبدیلیاں و تغیر نہیں ہونا چاہیے۔ کسی ذہنی انتشار میں یہ قانون منطبق نہیں ہوتا۔ یہی حال آمدنی کے تغیر اور مقامات کی تبدیلیوں کا ہے۔ آمدنی کے اتار چڑھاؤ سے ترجیحات بدلتی ہیں اور اسی کے ساتھ مطمئن ہونے کی سطح بدلتی ہے۔ گندی بستیوں سے نکل کر صاف ستھرے ماحول میں آکر رہنے، گاؤں قصبوں سے نکل کر بڑے شہروں میں آکر بسنے، انتہائی گرم موسم سے گھبرا کر کسی ٹھنڈے اور فرحت بخش مقام پر چلے جانے سے بھی ہمارے مطمئن ہونے کا معیار تبدیل ہوجاتا ہے اور قانونِ قدر منطبق نہیں ہوتا۔ یہی صورت اچانک خوشی یا اچانک غم و صدمے کی بھی ہے۔ ان دونوں ہی صورتوں میں یہ قانون فعال نہیں رہتا۔

گویا قانون قدر ایک نارمل صورت حال میں فعال رہتا ہے۔ یعنی کوئی غیر معمولی کیفیت اس کے عمل میں مانع نہ ہو۔ اب اگر ان تمام بیانیہ تفصیلات کو سمیٹ کر ہندسوں اور شکلوں میں منتقل کر دیا جائے تو شاید قانون اپنی 'عملی شکل' میں واضح ہوجائے گا۔ میں ایک چھوٹی سی مثال کو ہندسوں اور شکل میں منتقل کر رہا ہوں۔ تصور کیجیے آپ کو

شدید پیاس لگی ہے۔ قانون یہ بتلاتا ہے کہ پیاس کی شدت میں پانی سے بھرے گلاس کا پہلا گھونٹ سب سے زیادہ تسکین کا باعث ہوگا۔ یعنی اس کی قدر سب سے بلند ہوگی۔ اب اگر یہ بلندی 80 مان لی جائے تو پہلے گھونٹ کی قدر 80 کی سطح کو مس کرے گی۔ اب پانی کا دوسرا گھونٹ بھی یقیناً بہت تسکین دے گا لیکن یہاں تسکین کا احساس سابقہ پہلے گھونٹ کے مقابل تھوڑا کم ہوگا۔ یہاں مان لیجیے یہ سطح 70 رہتی ہے۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ آپ گھونٹ گھونٹ پانی پیتے رہیں گے، پیاس دھیرے دھیرے بجھتی رہے گی اور ایک سطح وہ آئے گی جب آپ کو مزید پانی کی کوئی خواہش نہیں ہوگی۔ یہ کامل تسکین کی سطح ہے جہاں پانی کی قدر صفر ہو جائے گی۔ اب اس کے بعد کسی کے اصرار پر بہ لحاظ تہذیب، آپ نے مزید پانی پی بھی لیا تو معاشیات کے دائرے میں اس کی قدر منفی ہوگی، یعنی بجائے تسکین کے بے لطفی کا احساس پیدا کرے گی۔ یہی صورت بھوک میں کھانے کی ہے۔ پوری بھوک میں پہلی روٹی یا پہلا نوالہ سب سے بلند قدر کا احساس کرائے گا اور جیسے جیسے نوالوں کی تعداد بڑھتی جائے گی، چونکہ بھوک مٹتی جائے گی اس لیے ہر اگلا نوالہ سابقہ نوالے کے مقابلے میں کم قدر کا احساس کرائے گا۔ یہاں تک کہ جب پیٹ بھر جائے گا تو روٹی یا نوالے کی قدر صفر ہو جائے گی۔ اب اس کامل تسکین کے بعد اگر کچھ کھایا تو بجائے تسکین کے تکلیف کا احساس ہوگا، یعنی قدر منفی ہو جائے گی۔ اس کی وضاحت ذیل کے نقشہ میں دیکھیے۔

یہاں صرف پانی کی مثال لی گئی ہے جہاں ہر گھونٹ کی افادیت (قدر) بہ تدریج گھٹتی جائے گی۔ یہاں تک کہ آٹھویں گھونٹ پر پیاس بجھ جاتی ہے۔ یہ مکمل تسکین کی سطح ہے جہاں قدر صفر ہو جاتی ہے۔ اب اس کے بعد مزید پانی کے گھونٹ کوئی افادیت کا احساس نہیں کراتے بلکہ منفی قدر کا احساس کراتے ہیں۔ اسی کیفیت کو ذیل کی شکل میں گرتے ہوئے خط کے ذریعے دکھلایا گیا ہے۔ اس قانون کی وضاحت کے لیے یہ انتہائی آسان سی مثال لی گئی ہے لیکن دراصل صرف کا عمل پیچیدہ ہے۔ آپ بھوک میں اگر کھانے کی مثال ہی لیں تو آپ کے سامنے تین طرح کے مختلف ذائقے کی ڈشیں عموماً ہوتی ہی ہیں اور بھوک میں ہر ایک سے افادہ کا احساس ہوتا ہی ہے۔ کسی ڈش میں بہت زیادہ اور کسی میں کم۔ یہی حال دیگر مصرف میں آنے والی اشیا کا ہے۔ اس پیچیدگی کا حل یہ نکالا گیا کہ ہم افادہ (قدر) کو مجموعی (یعنی کل) اور حاشیائی یعنی اضافی افادہ میں تقسیم کر کے اس قانون کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں کل افادہ بڑھ رہا ہے۔ لیکن بڑھنے کا انداز مسلسل گھٹنے کا انداز اختیار کیے ہوگا یعنی حاشیائی یا اضافی افادہ (قدر) تسلسل سے گھٹ رہا ہے جو قانون قدر کو واضح کر رہا ہے۔ مثلاً ذیل کے ٹیبل کو غور سے دیکھیے:

اشیا کی مقدار

مقدار صرف	مجموعی قدر	حاشیائی قدر	کیفیت
0	0	0	0
1	8	8-0 =0	8
2	14	14-8=6	6
3	18	18-14=4	4
4	20	20-18=2	2
5	20	20-20=0	0
6	18	20-18- 2	-2
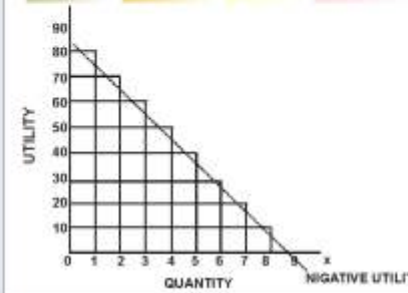
اب ان تفصیلات کو اور سمیٹیے اور مختصراً حروف تہجی کی مدد سے یوں واضح کیجیے۔ اگر یہ وضاحتیں ذہن میں ہیں تو ریاضی والجبرے کے چھوٹے فارمولوں کے ذریعے یہی بات مختصر طور پر اور زیادہ جامع انداز میں کہی جاسکتی ہے۔

ہم کل افادہ یعنی مجموعی قدر کو کسی شے x کی مقدار صرف کا عمل کہہ سکتے ہیں۔ اسی بات کو آپ Tu=f(x) کی طرف کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ ٹیبل میں دیکھیں تو قدر کی بلند ترین سطح 20 ہے۔ حاشیائی قدر کا کل میزان بھی 20 ہے۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بجے TU=E MU یعنی کل مجموعی قدر حاشیائی قدر کا مجموعہ ہے۔ یہاں "بجے" نشان مجموعہ کو بتلاتا ہے۔

حاشیائی یا اضافی قدر کو بھی اس طرح سمیٹ کر ایک فارمولے کی شکل میں واضح کیا جاسکتا ہے۔ حاشیائی قدر سابقہ قدر کے اضافہ کا ہی نام ہے۔ اس لیے کسی سطح پر جو قدر کی سطح ہے اس کو سابقہ قدر کی سطح سے گھٹا دیا جائے تو جو اضافہ ہوگا، وہی اضافہ قدر ہوگی۔ مثلاً ہمارے ٹیبل میں مقدار صرف 2 پر جو قدر کی سطح ہے، وہ 14 ہے۔ اس سے قبل کی سطح 8 تھی۔ اس لیے اگر 14 میں سے 8 کو گھٹا دیا جائے تو اضافی قدر 6 ہوگی۔ اسی طرح صرف کی سطح 3 پر قدر 18 ہے۔ جب کہ سابقہ قدر 14 ہے تو اس طرح سطح 3 پر حاشیائی قدر 14-18 یعنی 4 ہوئی۔ اب اسی کو فارمولے کے ذریعے ہم یوں کہیں گے: MUnth=Tu nth-TU یعنی حاشیائی قدر، کل قدر منفی سابقہ کل قدر ہوگی۔ اب ٹیبل میں حاشیائی قدر کی نوعیت کو دیکھیے تو وہ متواتر گھٹتی نظر آئے گی۔ جس سطح کو لیں گے اس سے سابقہ بلند یا بڑی ہوگی یعنی 2 سے بلند 4 اور 4 سے بلند 6 وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح MU 1 بڑی ہے MU2 سے اور MU2 بڑی ہے MU3 سے۔

یہ قانون اتنا معتبر ہے کہ آپ بالعموم ہر طرح کے صرف پر اس کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ ہاں کچھ مخصوص اشیا ایسی ضرور ہیں جن پر اس قانون کو منطبق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ قیمتی پتھر، تاریخی نوادرات، قیمتی مصوری کے شاہکار، ڈاک ٹکٹ وغیرہ، لیکن چونکہ ان کا استعمال یا ان کی طلب سماج کے مخصوص طبقے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے یہ اشیا خصوصی ضمن میں آتی ہے۔ ورنہ بالعموم عوام کا جو عموی صرف کا انداز ہے، وہاں یہ قانون قدر پوری طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ خصوصی ضمن کی اشیا میں ان کی حاشیائی قدر بجائے گھٹنے کے ہر اکائی کے بڑھانے پر بڑھتی رہتی ہے۔

معاشیات کا نظریۂ قدر آپ کے صرف کے عمل سے خاموشی کے ساتھ لپٹا ہوا ہے۔ آپ کے ذہن، طبیعت و مزاج اور سوچ و فکر کے ساتھ وابستہ ہے۔ اب یہ بات اور ہے کہ اہل معاشیات نے اس پر خصوصیت سے توجہ کی اور ایک نظریہ و قانون کی شکل دے کر صارفین کے طرز عمل (Consumer Behaviour) کے تحت اس کو متعارف کرایا اور زیادہ سے زیادہ سائنٹفک بنانے کی خاطر مختلف النوع ریاضی والجبرے اور جیومیٹری کی پر پیچ شکلوں کے ذریعے اس کی تشریحات پیش کیں۔ ان تمام مشقتوں میں مرکزی کردار تو صارف اور اس کے طرز عمل کا ہی ہے جس کو پورے طور پر مقید نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں موٹے طور پر اس کے طرز عمل کی جو شناختیں، معقولیت کے دائرے واضح ہیں ان کی عکاسی یہ قانون ضرور کرتا ہے۔ اس نظریے کو مزید بہتر طور پر خط بے نیازی (Indifference Curve) کی صورت واضح کیا گیا جس کو آئندہ بیان کروں گا۔

■

ماخذ: اقتصادیات برائے عوام، **مصنف:** سید اطہر رضا بلگرامی، **سنہ اشاعت:** 2014، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

آرٹیفیشیل انٹیلی جنس (Artificial Intelligence) جسے ہم مصنوعی ذہانت بھی کہتے ہیں۔ دراصل کمپیوٹر سائنس کی وہ ترقی یافتہ اور ایڈوانسڈ شاخ ہے جس کا مقصد اور کام مشینوں کے اندر انسانی دماغ کی طرح سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو فروغ دینا ہے۔ انسانی دماغ جس طرح کسی مسئلے کو حل کرتے وقت اس کے مختلف پہلوؤں پر غور وفکر کرتا ہے اور پھر دلیل کی بنیاد پر کسی فیصلے تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح مصنوعی ذہانت کے ذریعے مشینوں کے اندر بھی ایسی ذہانت اور شعور کو فروغ دیا گیا ہے جو ہو بہو انسانوں کی طرح سوچ سکتے ہیں۔

مصنوعی طور پر فروغ دیے گئے عقل وشعور اور ذہانت کو استعمال کرنے کے لیے کمپیوٹر پروگرام اور صلاحیت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی بے مثال صلاحیت اور عمل کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ تمام کام جو ماضی میں ایک مشین کے لیے روایتی طور پر ناممکن تصور کیے جاتے تھے آج مصنوعی ذہانت نے ان سبھی کاموں کو سچ کر دکھایا ہے۔ اس طرح انسان اور مشین کے درمیان جن نکات کی بنیاد پر عموماً فرق کیا جاتا ہے اسے وسیع پیمانے پر کم کرنے میں مصنوعی ذہانت کا بہت بڑا رول ہے۔

مصنوعی ذہانت کا استعمال آج تعلیم، معاشیات، دفاع اور زراعت سے لے کر صحت کے مختلف شعبوں میں کیا جا رہا ہے۔ دنیا کی ایڈوانسڈ ہیلتھ آرگنائزیشن، ریسرچ، ٹیسٹ، علاج و معالجے اور نگرانی (مانیٹرنگ) کے لیے اس کا استعمال کر رہی ہیں۔ ان کے ذریعے ٹشو سیمپل (Tissue Sample) کا نہ صرف تجزیہ کیا جاسکتا ہے بلکہ کہیں زیادہ درست اور بہتر علاج بھی فراہم کیا جا سکتا ہے۔ صحت سے متعلق بہت ساری کمپنیاں لاتعداد کیمیکل کمپاونڈ کا تجزیہ کرنے میں مصنوعی ذہانت سے مدد لے رہی ہیں۔ جس سے کہ طبی دریافت میں تیزی لائی جا سکے اور ادویہ جاتی ٹیسٹوں کے اندر مفید اور سودمند عناصر کی پہچان آسانی سے کی جاسکے۔ خطرناک بیماریاں جیسے کینسر، اسٹروک وغیرہ کے علاج میں بھی مصنوعی ذہانت کا کامیاب استعمال ہو رہا ہے۔

تعلیم کے شعبے میں بھی مصنوعی ذہانت کے نئے نئے استعمالات لگاتار سامنے آرہے ہیں۔ یہ طالب علموں کی ذاتی ضرورتوں اور ترجیحات کے مطابق تعلیمی مواد تیار کرسکتا ہے۔ اس طرح مصنوعی ذہانت کے ذریعے تیز رفتار تعلیمی نظام نہ صرف طالب علموں کی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہوسکتا ہے بلکہ ضرورت کے مطابق گریڈنگ (درجہ بندی) ایویلیوشن (جانچ پرکھ) میں بھی مزید تعاون فراہم کرسکتا ہے۔ دہرانے (تکرار) والے کاموں کو مصنوعی ذہانت کے ذریعے انجام دیے جانے کے نتیجے میں اساتذہ کو طالب علموں کے باہمی صلاح ومشورے کے لیے اضافی وقت مل سکے گا۔ ساتھ ہی ساتھ مصنوعی ذہانت اور روبوٹکس (Robotics) سے ورچوئل انسٹرکٹر (Virtual Instructor) کا بھی کام لیا جاسکتا ہے تاکہ سیکھنے کے تجربے کو اور بہتر بنایا جاسکے۔

چونکہ مصنوعی ذہانت یعنی آرٹیفیشیل انٹیلی جنس کا استعمال دنیا بھر میں بہت تیزی سے ہو رہا ہے، ایسے میں سکیورٹی، رازداری، اور شفافیت سے متعلق تفکرات کا ابھرنا ایک فطری عمل ہے۔ اگرچہ ان تفکرات کے کئی درجات اور سطحیں ہیں۔ لہٰذا نفسیاتی اور معاشرتی سطح پر ابھرتے ہوئے مسائل کے اوپر خصوصی طور پر دھیان دینے اور توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔ 'جائے عمل' (Work Place) پر نگرانی کی خاطر مصنوعی ذہانت اور انسان نما 'روبوٹ' کے استعمال سے ملازمین کے اندر لگاتار اپنے آپ کو ثابت کرنے کی مسابقت اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان کی دماغی صحت کے اوپر مضر اثرات مرتب کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ مصنوعی ذہانت کی تکنیکی کارکردگی اور اعلیٰ عملی صلاحیت کے سامنے ٹکے رہنے اور خود کو مسلسل متعلق رکھ پانے کا چیلنج بھی لگاتار بنا رہتا ہے، آج کل 'ڈیپ فیک' (Deep-Fake) ویڈیوز سے لے کر 'آن لائن بیٹوس' (Online Betose) تک کا رواج ہے جو کسی بھی انسان کی شخصی عزت ووقار کی کھلے عام خلاف ورزی کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی لوگوں کے درمیان عمومی اتفاق و حمایت کا مظاہرہ کرکے ان کے افکار ونظریات کو بھی متاثر کرسکتا ہے۔ فرضی خبروں، اور ویڈیوز وغیرہ کی برق رفتار نشر واشاعت سے سماجی ومعاشرتی عدم استحکام اور بدامنی کا خطرہ برابر برقرار رہتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خوف وہراس کی وہ تمام شکلیں جو کبھی محض تصور وخیال تک محدود تھیں اب مصنوعی ذہانت کے ذریعے حقیقت میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ مصنوعی

ذہانت کے تکنیکی وجود نے ایک ایسا سنگین منظر نامہ تشکیل کر دیا ہے جس کے اندر اصلی یعنی حقیقی اور مصنوعی (Artificial) کے درمیان فرق کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مصنوعی ذہانت کی بنا پر انسانی حقوق سے وابستہ مختلف چیلنجوں کے ابھرنے کے امکانات بہت قوی ہوگئے ہیں۔ مصنوعی ذہانت کی بنا پر تیزی سے بدلتے منظر نامے میں ڈاٹا (اعداد و شمار) کا تحفظ، ذاتی رازداری، انسانی تحفظ و سکیورٹی، عزت و وقار، روزگار، مساوات و برابری، اور'رازداری' وغیرہ بہت سارے ایسے امور و مسائل ہیں جن کے اوپر منڈلاتے خطرات کے تناظر میں قبل از وقت متنبہ اور خبردار ہو جانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس بات پر خصوصاً دھیان دینا ہوگا کہ جیسے جیسے مصنوعی ذہانت سے متعلق تکنولوجیاں فروغ پاتی جائیں گی ویسے ویسے انسانی حقوق سے وابستہ معاملوں پر پڑنے والے ان کے منفی اثرات کا تجزیہ کرنے اور ان کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت بھی شدید ہوتی جائے گی۔

چاہے تعلیم، مینجمنٹ اور تکنیک کا شعبہ ہو یا کوئی اور شعبہ، جائے عمل (Work Place) ان کے اوپر مصنوعی ذہانت اور روبوٹکس کے روز افزاں اثرات عالمی پیمانے پر شدید تشویش کا موضوع بنتے جارہے ہیں۔ تکنیکی مہارت، تجزیہ کرنے کی بے مثال صلاحیت اور دوہرا یعنی مکرر طور پر انجام دیے جانے والے کاموں میں مصنوعی ذہانت کے کام کرنے کی صلاحیت کی بنا پر مستقبل میں ملازمین کی مانگ میں خاطر خواہ کمی دیکھنے کو مل سکتی ہے۔ انھیں عدم مساوات یعنی نابرابری سے متعلق مسائل اور مشکلات سے بھی نبرد آزما ہونا پڑسکتا ہے۔ لہٰذا مصنوعی ذہانت کے ذریعے کاموں کی انجام دہی کی بنا پر انسانی قوت اور محنت و مشقت کی ضرورت بتدریج کم ہوتی چلی جائے گی۔

ماہرین کے ذریعے علاج معالجہ، قانون، مارکیٹنگ اور اکاونٹنگ وغیرہ کے شعبوں کے سب سے زیادہ متاثر ہونے کے امکانات ظاہر کیے جارہے ہیں۔ ایسے حالات میں انسانی قوت محنت و مشقت کے اوپر منڈراتے ہوئے خطرات کو کم کرنے کے مقاصد کے مدنظر مناسب لائحہ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہوگی۔ ملازمین کی ٹریننگ کو لگاتار اپڈیٹ کرنا ہوگا۔ جدت و اختراع کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کرنی ہوگی۔ اگر مصنوعی ذہانت مرکوز منظر نامے میں اپنا مقام و مرتبہ محفوظ کرنی ہے تو خود اپنی ذات کے اندر تکنیکی صلاحیت و مہارت کو فروغ دینے پر توجہ مبذول کرنی ہوگی۔ سوفٹ اسکل (تکنیکی شعور) کو فروغ دینا سودمند ثابت ہوسکتا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مصنوعی ذہانت، ابھی بھی، شعور، ادراک اور تخلیقیت سے کوسوں دور ہے۔ لہٰذا بدلتی ہوئی صورت حال کے اندر تیزی کے ساتھ ہم آہنگی قائم کرکے خصوصی مہارت (Specific Skills) اور علوم (سائنس) کو فروغ دینا انسانی معاشرے کے لیے اہم اور سودمند ہوسکتا ہے۔

انسان کی تخلیقیت اس کے ذاتی تجربات، تخیلات اور خارجی دنیائے حیات سے حاصل شدہ علم میں تپ کر تخلیقی اظہاریت کی مکمل شکل اور صورت اختیار کرتی ہے مگر مصنوعی ذہانت پوری طرح (ڈاٹا) اعداد و شمار کے تجزیے اور ایک طے شدہ پیٹرن پر مبنی اور منحصر ہے، یہ

بلاشبہ مصنوعی ذہانت نے موجودہ معاشرہ انسانی کے اندر محیر العقول تکنیکی انقلاب برپا کردیا ہے۔ جس سے روزانہ نت نئی ایجادات اور انکشافات منصۂ شہود پر نمایاں اور آشکارہ ہورہے ہیں جس کو ماننے پر نہ صرف دنیائے بشریت مجبور ہے بلکہ اس کا بروقت اور مناسب استعمال کرکے گھنٹوں کا کام منٹوں میں انجام دے رہی ہے جیسے چیٹ جی۔ پی۔ ٹی کے ذریعے کسی بھی موضوع پر متوقع مواد اور میٹریل فراہم کیا جاسکتا ہے۔

انسانی جذبات و احساسات کے مطابق برتاؤ نہیں کرسکتا، اس کے اندر جذباتی شدت و گہرائی، معقول نقطہ نظر اور سیاق و سباق یعنی گرد و پیش سے پیدا شدہ صورت حال کے تئیں وسیع سوچ اور سمجھ کا فقدان ہے۔ ابھی بھی، ترحم و ہمدردی، تصور و تخیل، شعور و ادراک اور تخلیقیت جیسی خصوصیات انسان کی میراث ہیں۔ مصنوعی ذہانت ان سے مکمل طور پر خالی ہے۔ ایسی صورت حال میں اس تشویش کا اظہار کرنا لایعنی ہے کہ مصنوعی ذہانت انسانی تخلیقیت کو پوری طرح نیست و نابود اور برباد کردے گی۔

انسانی زندگی کے اندر مصنوعی ذہانت کا بہت زیادہ عمل و دخل باعث تشویش ضرور ہوسکتا ہے، مگر اس بات کو لے کر مطمئن بھی ہوا جاسکتا ہے کہ مصنوعی ذہانت کبھی بھی پوری طرح انسان کی جگہ نہیں لے سکے گی۔ بالآخر انسان ہی حقیقت و واقعیت (Originality) اور جدت و اختراع Innovation کا آخری منبع اور سرچشمہ بنا رہے گا، اس کے لیے ہم انسانوں کو اپنی سطح پر بھی مزید کوششیں کرنی ہوں گی، ہمیں نہ صرف اپنی بیداری بڑھانی ہوگی بلکہ اس کے محفوظ اور سودمند استعمال کے سلسلے میں خود کو تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کرنے کی بھی ضرورت ہوگی۔

مصنوعی ذہانت نے انسانی زندگی کو قدرے سہل اور آسان بنادیا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر اس کے اندر لامحدود امکانات پائے جاتے ہیں تو اس سے پیدا ہونے والے چیلنجوں اور خطرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ آج مصنوعی ذہانت زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو چکی ہے، مواصلات، سکیورٹی، صحت اور زراعت وغیرہ کے مختلف شعبوں میں مصنوعی ذہانت کے استعمال سے مستقبل میں انقلابی تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ ہمارے ملک بھارت میں بھی مصنوعی ذہانت کو لے کر شروع سے ہی مثبت ماحول رہا ہے۔ حالانکہ موجودہ زمانے میں اپنے اپلی کیشنز (استعمالات) کے ذریعے انسانی، سماج اور معاشرے کے لیے سودمند ہی ثابت ہورہی ہے مگر معاشرتی (سماجی) سیاسی، نفسیاتی اور اخلاقی بنیاد پر مصنوعی ذہانت سے متعلق اور وابستہ بہت سارے سوالات معاشرے میں پیدا ہورہے ہیں جو اس کے ممکنہ خطرات کی جانب لازمی طور پر اشارہ کر رہے ہیں۔

یقیناً مصنوعی ذہانت انسان کے سیاسی حقوق و اختیارات کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔ اس کے اندر تعصب اور امتیازات بھی پائے جاسکتے ہیں۔ یہ بھی خدشہ ہے کہ استدلالی صلاحیتوں سے بھرپور مشینیں مستقبل میں کبھی انسانی معاشرے کو ہی اپنا دشمن سمجھ بیٹھیں تو ذہانت سچائی اور حقیقت کو کنٹرول کرسکتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ امریکہ اور دیگر یورپی ممالک نے مصنوعی ذہانت کی سنگینی کو بھانپ کر اس کے خلاف نہ صرف اپنے خدشات کا اظہار کیا ہے بلکہ اس سے متعلق سخت قوانین وضع کرنے کی بھی تائید کی ہے۔

بلاشبہ مصنوعی ذہانت نے موجودہ معاشرہ انسانی کے اندر محیر العقول تکنیکی انقلاب برپا کردیا ہے۔ جس سے روزانہ نت نئی ایجادات اور انکشافات منصۂ شہود پر نمایاں اور آشکارہ ہورہے ہیں جس کو ماننے پر نہ صرف دنیائے بشریت مجبور ہے بلکہ اس کا بروقت اور مناسب

مصنوعی ذہانت نے انسانی زندگی کو قدرے سہل اور آسان بنا دیا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر اس کے اندر لامحدود امکانات پائے جاتے ہیں تو اس سے پیدا ہونے والے چیلنجوں اور خطرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

استعمال کر کے گھنٹوں کا کام منٹوں میں انجام دے رہی ہے جیسے چیٹ جی۔ پی۔ ٹی کے ذریعے کسی بھی موضوع پر متوقع مواد اور میٹریل فراہم کیا جاسکتا ہے۔ مقالہ تیار کیا جاسکتا ہے اور دنیا کی تقریباً تمام مروجہ زبانوں سے اپنی من پسند زبانوں میں ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ نیز وہ اعداد و شمار جس کی تیاری میں ذہن انسانی کو روایتی طور پر گھنٹوں بلکہ مہینوں کی محنت شاقہ درکار ہوتی تھی اسے بغیر کسی رکاوٹ اور تھکاوٹ کے گھنٹوں اور منٹوں میں تیار کیا جاسکتا ہے۔ نیز کارخانوں اور فیکٹریوں کے اندر جن کاموں کو انجام دینے کے لیے انسانوں کی جماعت اور مزدوروں کے منظم گروہ کو اپنے ذہن و دماغ اور دست و بازو کو بروئے کار لاتے ہوئے ہفتے اور مہینے درکار ہوتے تھے اسے ایک مخصوص پیٹرن پر بغیر کسی تھکاوٹ اور رکاوٹ کے چند ساعتوں اور دنوں میں انجام دیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح محاذ جنگ پر اب تک دشمن کو روایتی طور پر مرعوب اور زیر کرنے کے لیے جہاں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں انسانی افواج کی ضرورت ہوا کرتی تھی ان کی جگہ ایسی روبوٹک آرمی (Robotic Army) یعنی انسان نما فوجی مشینیں لے لیں گی، جو بٹن دباتے ہی منٹوں اور سیکنڈوں میں سیکڑوں راؤنڈ گولیاں دشمن کی جانب داغ سکتی ہیں۔ یا ایسے ڈرونز (Drons) (بغیر پائلٹ کے ہوائی جہازوں) کا چلن عام ہو جائے گا جو دشمن ملک کی سرحدوں میں داخل ہو کر منٹوں میں لاتعداد بم برسا سکتے ہیں۔ نیز ایسی آٹومیٹک کاریں بھی وجود میں آگئی ہیں جو بغیر کسی ڈرائیور کے محض مصنوعی ذہانت یعنی (Artificial Intellegence) سے گائیڈیڈ ہوتی ہیں اور اپنی منزل مقصود تک برق رفتاری کے ساتھ پہنچنے کی صلاحیت رکھتی ہیں تاہم یہ ابھی تجرباتی مرحلے میں ہی ہے۔ اس کے علاوہ انسانی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہوگا جو مستقبل قریب میں مصنوعی ذہانت کی رسائی اور دست ہنرمندی کی کارستانی سے محفوظ رہ سکے۔

مصنوعی ذہانت ایک ایسی سائنسی ایجاد و انکشاف ہے، جس کی کارستانی اور دستبرد کا مستقل قریب میں انسانی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں نہ صرف عمل دخل ہوگا بلکہ اس سے استفادے اور اس کے استعمال پر ابن آدم طوعاً و کرہاً مجبور و لاچار ہوگا۔ چنانچہ مصنوعی ذہانت جہاں عالم انسانیت کے سامنے امکانات و توقعات کا ایک وسیع دروا کر دے گی وہیں وہ خطرات اور چیلنجوں کے ایک ایسے سیل رواں سے دوچار ہوگی جو اسے خس و خاشاک کی مانند اپنے ساتھ بہا لے جائے گی۔ یعنی جس کی بنا پر انسانی دنیا کے وجود پر ہی خطرات کے بادل منڈلانے لگیں گے۔ مثلاً جائے عمل یعنی (Work Place) پر (Work Force) یعنی قوت عمل (مزدوروں، کرمچاریوں) کے اندر تقریباً چالیس سے پچاس فیصد کی کمی آجائے گی جس سے انسانی معاشرہ لاعلمی اور بے روزگاری کا شکار ہو جائے گا جس کے نتیجے میں نت نئے اقتصادی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوں گے۔ چونکہ مصنوعی ذہانت کمپیوٹر جنریٹیڈ (Computer Generated) خود کار مشینوں اور آلوں کے ذریعے کام انجام دیتی ہے اور اس کے اندر انسانی ذہن و دماغ کی مانند سوچنے سمجھنے اور مفوضہ احوال و ظروف (Given Situation) کے مطابق بروقت فیصلہ لینے کی صلاحیت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک بے جان مشین ہوتی ہے جو آلات اور Tools سے گائیڈیڈ ہوتی ہے جس کے اندر بگاڑ اور خرابی کے امکانات ہمہ وقت موجود ہوتے ہیں چنانچہ اگر غلط وقت پر کوئی غلط بٹن دب گیا تو اس سے ناقابل تصور تباہی اور نقصانات ہو سکتے ہیں جیسا کہ پچھلے دنوں ایک خبر نشر ہوئی تھی کہ ایک روبوٹ نے لیباریٹری کے اندر اپنے (مالک) یعنی موجد اور بنانے والے کا ہی گلا دبا کر قتل کر دیا۔
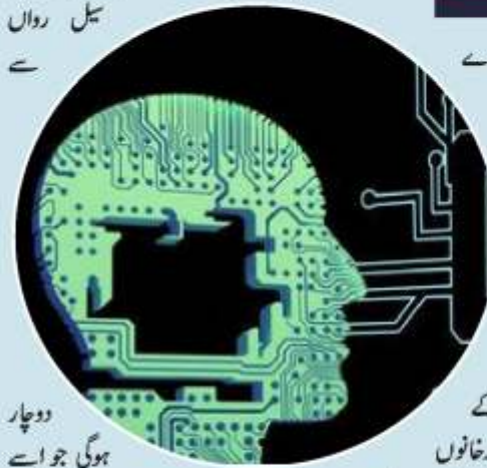
چنانچہ رابرٹ نکولاس ولیم (1953-1979) پہلا آدمی ہے جس کو روبوٹ نے امریکہ کی ایک مشہور زمانہ فورڈ موٹر کمپنی کی مشین کاسٹنگ سینٹر میں قتل کر دیا۔ یا یہ کہ روبوٹ نے گذشتہ سال جنوبی کوریا کے اندر اس ملازم کو کچل دیا جو اس کے ساتھ معاونت کر رہا تھا کیونکہ وہ روبوٹ اس ملازم اور ان ڈبوں کے درمیان فرق نہیں کر سکا جن ڈبوں کی پیکیجنگ کا فریضہ وہ روبوٹ انجام دے رہا تھا۔

چونکہ مصنوعی ذہانت کا فروغ و استعمال میدان حرب و ضرب میں بتدریج عام ہوتا جا رہا ہے اور مستقبل کی جنگیں بلاشبہ مصنوعی ذہانت پر مبنی اور مرکوز ہوں گی لہٰذا اس بات کا غالب امکان ہے کہ حقیقی ذہانت یعنی (انسان) اپنی مصنوعی ذہانت یعنی (مشین) کا استعمال غلط مقاصد کی تکمیل کے لیے نہ کر سکے خصوصاً اگر اس کا استعمال عام تباہی کے ہتھیاروں (WMD) کے لیے کیا گیا تو اس روئے زمین پر انسانی وجود و بقا کو جو خطرات لاحق ہوں گے اس کے تصور سے ہی ہر ذی شعور انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے مشہور سائنس دانوں نے اس کی مخالفت کی اور اس سلسلے میں اپنے ذاتی تحفظات اور تعصبات کا اظہار کیا ہے جو کہ یقیناً موجودہ معاشرۂ انسانی کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

مصنوعی ذہانت ایک ایسی سائنسی ایجاد و انکشاف ہے جس کی کارستانی اور دستبرد کا مستقل قریب میں انسانی زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں نہ صرف عمل دخل ہوگا بلکہ اس سے استفادے اور اس کے استعمال پر ابن آدم طوعاً و کرہاً مجبور و لاچار ہوگا۔

■

Prof. M J Warsi
Chairman, Department of Linguistics
Aligarh Muslim University
Aligarh- 202002 (UP)
Mob.:9068771999
Email.: warsimj@gmail.com

عادل ناگپوری
فن و شخصیت

محمد اسداللہ

وسط ہند کا شہر ناگپور ادب کے مشہور مراکز مثلاً دہلی، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد وغیرہ کی طرح ابتدا ہی سے علمی و ادبی سرگرمیوں کی آماجگاہ نہیں تھا لیکن ان تہذیبی مراکز کی دھڑکنوں سے بیگانہ بھی نہیں رہا۔ اس دعوے کے ثبوت میں شہر ناگپور کی ادبی روایات اور تخلیق کاروں کے رشحاتِ قلم کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک اہم نام عادل ناگپوری (1823-1894) کا بھی ہے۔ جہاں عادل ناگپوری، ناگپور کے ایک اہم قدیم شاعر کے طور پر معروف ہیں وہیں ان کی انتظامی خدمات بھی ان کی شخصیت کو قد آوری عطا کرتی ہے۔ وہ ناگپور کے فرمانرواں رگھوجی بھوسلہ ثالث کے عہد میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔

حالاتِ زندگی

عادل ناگپوری فارسی اور اردو کے قادر الکلام شاعر تھے، مختلف زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ عادل کا نام سید محمد عبدالعلی، کنیت ابوالکاظم اور تخلص عادل تھا۔ وہ 1823 میں ناگپور میں پیدا ہوئے تھے۔۔ ٹیپو سلطان کی شہادت 1799 کے بعد عادل ناگپوری کا خاندان ریاست میسور سے ناگپور میں منتقل ہوا تھا۔ عادل ناگپوری نے دینیات کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی تھی۔ اس میں قرآن مجید حفظ کیا اور قرأت اور تجوید کے بنیادی اصول سیکھے۔ اس کے بعد وہ ناگپور کے سب سے بڑے مدرسے رسولہ میں داخل کیے گئے۔ عادل ناگپوری رگھوجی بھوسلہ ثانوی کے عہد میں حکومت کی انتظامیہ میں شامل ہوئے اور رگھوجی بھوسلہ ثالث کے دور میں پہلے جمعدار اور پھر رسالدار کے منصب پر فائز ہوئے تھے۔ عادل کو دینی علوم اور تصوف سے خصوصی شغف تھا۔ آخر عمر میں وہ کئی عوارض کے سبب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ 1894 میں ان کا انتقال ہوا۔

یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ مشہور محقق اور ادیب و شاعر ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل نے عادل ناگپوری کو ان کی تمام تر ادبی خدمات کے ساتھ اردو دنیا سے متعارف کروایا اور اس عظیم شاعر کے متعلق تحقیقی کاموں کے لیے راستے ہموار کیے۔ انھوں نے کلیاتِ عادل کو مرتب کرنے کے علاوہ عادل ناگپوری شخص، شاعر، نثر نگار (مطبوعہ 2011) جیسی کتاب لکھ کر عادل ناگپوری کے حالاتِ زندگی اور ان کے فکر و فن کا احاطہ کیا۔ اس کے علاوہ ماہنامہ قرطاس کا عادل ناگپوری نمبر بھی ان کی رہنمائی میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر ساحل نے نہ صرف عادل ناگپوری کے اردو اور فارسی کلام کو محفوظ کیا بلکہ اس پر تحقیق کا حق بھی ادا کیا۔ وہ عادل ناگپوری کے حالاتِ زندگی کے متعلق لکھتے ہیں:

عادل جب سنِ شعور کو پہنچے تو رگھوجی ثالث کی انتظامیہ سے وابستہ ہوئے اور ترقی کر کے نائب رسالدار کے منصب پر فائز ہوئے تھے کہ 11 دسمبر 1853 کو راجہ کا انتقال ہو گیا اور اسی کے ساتھ بھوسلہ حکومت کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ انگریزوں کا دورِ حکومت شروع ہوا تو انتظامِ حکومت کی نئی پالیسی وضع ہوئی۔ مراٹھی اور فارسی کی جگہ انگریزی زبان نے لے لی اس سیاسی انقلاب کے باعث عادل کی نوکری جاتی رہی اب وہ خاندانی جاگیر اور کھیتی باڑی کی آمدنی پر گزر بسر کرنے لگے ان کے لیے 1862 میں برٹش گورنمنٹ نے کچھ رقم بھی وظیفے کے طور پر مقرر کی تھی... عادل بھونسلہ راجہ کے خاندان اور انگریز افسران کے بے انتہا وفادار تھے اس لیے 1857 کے تاریخی انقلاب کے بعد ان کی جاگیر محفوظ رہی۔ اس انقلاب کے بعد بیشتر مسلم خاندان تلاشِ معاش میں دوسرے شہروں میں منتقل ہو گئے لیکن عادل ناگپور ہی میں مقیم رہے۔

(ڈاکٹر شرف الدین ساحل، عادل ناگپوری، شخص، شاعر، نثر نگار، 2011، ص 27)

عادل ناگپوری غالب، مومن اور ذوق کے ہم عصر تھے اور غالب گمان ہے کہ یہ شعرا ان کے کسبِ نور کا منبع رہے ہوں۔ ان میں لکھنؤ کے شعرا ناسخ، آتش، انیس، دبیر کے کلام کا اثر عادل کے یہاں نمایاں ہے۔ عادل نے جن شعرا کی زمینوں میں طبع آزمائی کی ان میں غالب، میر، سودا، آتش، ناسخ اور ممنون، بھی شامل ہیں البتہ ان کے کلام کا سرسری مطالعہ بھی اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ انھوں نے لکھنؤ کے طرزِ فکر اور اندازِ سخن کو قبول کیا اور اپنی شاعری کو ان ہی خطوط پر آگے بڑھایا تھا۔ ان کے کلام میں خارجیت، مضمون آفرینی، معنی آفرینی، قادر الکلامی زبان و بیان کی رنگینی اور لطافت، صنائع بدائع کا بڑے پیمانے پر استعمال ثابت کرتا ہے کہ وہ لکھنوی طرزِ شاعری کے دلدادہ تھے۔ یہی وہ رنگ ہے جس کی توضیح ہمیں آتش کے اس شعر میں دکھائی دیتی ہے۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں　　　شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

عادل ناگپوری کے یہاں عاشقانہ متصوفانہ اور رندانہ مضامین ملتے ہیں۔ عادل کی شعریت اور تغزل فارسی و عربی الفاظ کی مدد سے خیال آفرینی کی بہار دکھاتی ہے۔ یہ خوبیاں لکھنوی طرزِ سخن کا طرۂ امتیاز ہے البتہ معروف ناقد سلیم شہزاد ان کے کلام کے عمیق مطالعے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ عادل ان تمام شعرا کے مقابلے میں مرزا غالب سے زیادہ متاثر تھے۔ وہ عادل کے متعلق لکھتے ہیں:

ان کا اردو کلام بآوازِ بلند اعلان کر رہا ہے کہ میں اپنے پیش روؤں کے علاوہ سب سے زیادہ نجم الدولہ، دبیر الملک، مرزا اسد اللہ خان غالب سے متاثر ہوں۔ غالب کی طرح عادل بھی کثیر الاطراف اظہار کے فنکار تھے۔ فارسی نظم و نثر، مکتوب نگاری، تفسیر و فقہ، تصوف و تاریخ اور لغت نگاری جیسے لسانی تعملات ان کے حیطۂ اظہار میں شامل تھے۔ ان کی اردو شاعری کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ آنجناب کے غزلیہ اظہار پر بھی غالبیت کا غلبہ ہے۔ عربی فارسی الفاظ و تراکیب، خیالات اور شعری نحو میں غالب کی سی لسانی پیچیدگی عادل کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

(سلیم شہزاد، رزم کی زبان، مطبوعہ عادل ناگپوری، مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل 2011، ص 13)

غزل گوئی

عادل ناگپوری کا اردو کلام ان کی قادر الکلامی استادانہ مہارت، صنائع بدائع کے بھرپور استعمال کی قدرت اور سخت و مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی صلاحیت کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے طویل غزلیں کہیں، ان کے کلام میں دو غزلہ، سہ غزلہ، پنج غزلہ اور بعض قافیوں میں کئی اشعار کہنے کی مثالیں موجود ہیں۔ عادل ناگپوری نے قوافی اور ردیفوں کے استعمال میں یہ کمال دکھایا کہ معنی آفرینی کے جس قدر امکانات ان الفاظ میں موجود تھے انھیں اپنے تخلیقی

جوہر سے چمکایا۔ اپنی مشکل پسندی کے باوصف وہ محبوب کے سراپے کو معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کے ساتھ رعایتِ لفظی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

عیاں زلفوں میں ایسا نور ہے رُوئے درخشاں کا — کہ جیسے سنبلستاں میں ہو جلوہ ماہِ کنعاں کا

آنکھ اس کی نرگسِ مخمور سے کچھ کم نہیں — لب مذاقِ بادۂ انگور سے کچھ کم نہیں

اس مستِ ناز کے لبِ میگوں کے سامنے — ہوتی ہے فرطِ شرم سے خُم میں شراب آب

گر الٹ دے رخِ پرنور سے اپنے وہ نقاب — ہو شبِ ماہ سے روشن شبِ تار آپ سے آپ

عادل کی شاعری میں درد وغم، اضطراب اور سوز وگداز کا اظہار بھی پر اثر انداز میں ہوا ہے۔ چمن سے ماخوذ وہ پیکر اور نور ونکہت کے تصورات جو عادل کی شاعری میں محبوب کا سراپا بیان کرتے ہیں، حسبِ ضرورت زندگی کے دکھ درد کے استعارے بھی بن جاتے ہیں۔

ہنستا ہے گل تو روتی ہے شبنم تمام رات — خالی غم وطرب سے جہاں کا چمن نہیں

تصور ہے دمِ گریہ یہ کس کے روئے تاباں کا — کہ ہر قطرے میں عالم ہوگیا برقِ درخشاں کا

دمِ تحریرِ حالِ سوزشِ داغِ دلِ مضطر — قلم میں دفعتاً عالم ہوا سروِ چراغاں کا

بوئے پیراہن مرے یوسف کی لائی تب صبا — صورتِ یعقوب زائل جب بصر اپنا ہوا

سدا رہتا ہے دل مشغولِ ماتم — مرا سینہ ہے یا بزمِ عزا ہے

تجھ کو پہلے ہی قدم میں آبلہ پائی ہوئی — منزلِ غم کا ہنوز اے دل بیاباں دور ہے

قصیدہ نگاری

عادل ناگپوری نے اردو اور فارسی میں قصائد قلم بند کیے ہیں۔ اردو میں ان کے چار قصائد کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں (1) قصیدہ (در) مسند نشیں رگھوجی بھونسلہ چہارم (2) قصیدہ ختنہ (کذا) اعظم شاہ بہادر راجہ قلعہ ناگپور (3) قصیدہ در مدح شیو شنکر لال (4) ایضاً

مشہور محقق ڈاکٹر نور السعید اختر ان کے متعلق لکھتے ہیں:

عادل نے غزلوں سے زیادہ قصائد میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ فارسی میں ان کے کل قصائد کی تعداد 18 ہے۔ فارسی شاعری اور انشا پردازی میں جو کارنامے اپنے پیچھے چھوڑے ہیں میں یہ بات مکمل وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ پورے مہاراشٹر میں اتنا زبردست کارنامہ کسی شاعر نے انجام نہیں دیا ہے۔ فکری ومعنوی لحاظ سے بھی عادل کے کارنامے منفرد ہیں۔ اس تبحر علمی اور فنی لیاقت کے باعث انھوں نے تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں اردو اور فارسی میں تصنیف وتالیف کیں۔ ان میں زیادہ تر کتابیں فارسی میں ہیں۔ دیوانِ فارسی، دیوانِ قصائد، دیوانِ تاریخات، مثنوی سحرِ بابل اور مثنوی ریاض المعارب وغیرہ اس کا بیّن ثبوت ہیں۔

(ڈاکٹر نور السعید اختر، عادل فارسی کا ایک قادر الکلام شاعر، ماہنامہ قرطاس، اگست 2010، ص 39)

ڈاکٹر غلام السیدین ربانی کا خیال ہے کہ "عادل ناگپوری کی تخلیقی قوتیں، ان کی تشبیہات اور استعاروں میں پوری آب وتاب کے ساتھ جھلکتی ہیں عادل کے ہنر کے غماز ان کے قوافی بھی ہیں۔ عادل نے اپنے زمانے کے اہم واقعات سے متاثر ہوکر متعدد تاریخیں کہی ہیں۔ ان تاریخی قطعات میں زبردست علمیت اور استادانہ مہارت کا مظاہر کیا ہے۔"

(ڈاکٹر غلام السیدین ربانی، عادل کی قصیدہ نگاری، ماہنامہ قرطاس، اگست 2010، ص 132)

مرثیہ نگاری

عادل ناگپور نے مرثیہ نگاری میں بھی اپنے جوہر نمایاں کیے ہیں۔ امام حسین کی شہادت سے متعلق ان کے تین مرثیے ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ یہ ان فنی خوبیوں سے آراستہ ہیں جو انیس ودبیر کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں صنائع بدائع کا استعمال اور احساسات وجذبات کی عکاسی پر اثر انداز میں کی گئی ہے۔

دیدہ دمِ تحریر مرا اشک فشاں ہے — آنسو کے عوض آنکھ سے خونِ ناب رواں ہے

چشم ابر کی مانند سدا گریہ کناں ہے — بلبل کی صفت سینے میں دل نعرہ زناں ہے

پیدا سر ہر موئے بدن گرچہ زباں ہو — یہ وہ ہے الم جس کا زباں سے نہ بیاں ہو

مثنوی نگاری

عادل ناگپور نے مثنوی نگاری میں بھی اپنی قادر الکلامی کے نقوش ثبت کیے ہیں۔ انھوں نے فارسی میں سحرِ بابل، ریاض المعارب اور نور الہدیٰ نامی مثنویاں تحریر کی ہیں۔ مجموعی طور پر ان تینوں مثنویوں کے اشعار کی تعداد پانچ ہزار سات سو بیس (5720) ہو جاتی ہے۔ البتہ اردو میں ان کی دو ہی مثنویاں ہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد 290 ہے۔ پہلی مثنوی میں محبوب سے خط نہ ملنے کی شکایت ہے اور دوسری مثنوی ایک منفرد موضوع کا احاطہ کرتی ہے جس میں ایک ماں کے دکھ کو بیان کیا گیا ہے جو اپنی بیٹی کے شوہر کی بے اعتنائی سے اس قدر غم زدہ ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی کا پہلا نکاح فسخ ہو جائے اور وہ کسی دوسرے نوجوان سے شادی کرلے۔ یہ مثنوی شاعر کی عصری حسیت اور سماجی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے۔

چاہتی ہوں میں اپنی دختر کو — یعنی برجِ حیا کے اختر کو

نامزد کوئی اور سے کروں — پہلے شوہر سے فسخ عقد کروں

عادل نے دو کتابوں کے دیباچے بھی مثنوی کی طرز پر لکھے ہیں۔ پہلی کتاب راجہ جانوجی بھوسلے کی تصنیف ہے۔ یہ منظوم دیباچہ 101 اشعار پر مشتمل ہے۔

اگر یوں ہی منظور ہے سیرِ گلشن — ہے مطلوب سمعِ صفیرِ نوازن

ذرا چل کے اب دیکھ دربار اس کا — کہ کیسا ہے محفل میں گلزار اس کا

جسے دیکھ کر پیرِ فلک با قدم خم — ادب سے کھڑا بہرِ مجرا دمادم

دوسرا منظوم دیباچہ اپنے اردو کے پہلے مجموعے خزائن الاشعار (1854-55) کے لیے تحریر کیا تھا۔ جس میں 156 اشعار موجود ہیں۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

خیر جو کچھ کہے گئے اشعار — کیجیے جمع ان کو بے تکرار

دل میں اس طور جب خیال آیا — نام تاریخی فکر نے چاہا

کہا عادل نے ناگہاں اک بار — نام اس کا خزائن الاشعار

تصانیف

عادل ناگپوری کی تصانیف میں کلیاتِ عادل 192 صفحات پر مشتمل ہے جو 2006 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں دیوانِ اردو، خزائن الاشعار، جیش المضامین، دیوانِ قصائد اور دیوانِ تاریخات شامل ہیں۔ اسے مختلف مخطوطات کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ شرح کریما سعدی شیرازی کی مشہور فارسی نظم ہے عادل نے اس کا منظوم اردو ترجمہ 1837 میں اس وقت کیا تھا جب ان کی عمر صرف 14 سال تھی۔

عادل ناگپوری کو تاریخ گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی، انھوں نے ایک مکمل دیوان دیوانِ تاریخات کے نام سے ترتیب دیا تھا جس میں 190 قطعاتِ تاریخ اردو اور فارسی میں موجود تھے۔

خزائن الاشعار، عادل کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ 1854 میں مرتب کیا تھا۔

جیش المضامین، عادل کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو 1868 میں مرتب کیا گیا تھا۔

دیوانِ اردو، 48 صفحات پر اور دیوانِ فارسی 32 صفحات پر مشتمل ہے۔

دیوانِ قصائد میں فارسی کے 18 قصائد اور اردو کے دو قصائد شامل ہیں۔

ان تصانیف کے علاوہ، سحرِ بابل ریاض المعارب نور الہدیٰ، چہل حدیث مترجم، نثر اُلتین فقہ اکبر، مفتاح الفتوح، حقیقتِ خواب، نصاب گونڈی اور شرح علوم ان کی کتابیں ہیں۔

غرض عادل ناگپوری نے مختلف شعری ونثری اصناف میں اپنے تخلیقی جوہر کو نمایاں کرکے ادب کو نئی فنی جہات سے آشنا کیا اور فکری ومعنوی اعتبار سے ادبی روایت کو توانائی عطا کی ہے

■

Mohammad Asadullah
30, Gulsitan Colony, Nagpur- 440013 (MS)
Mob.: 9579591149, zarnigar2006@gmail.com

مہاراشٹر میں اردو تحقیق

محمد زبیر

ہندوستان کے دیگر صوبوں اور خطوں کی طرح صوبۂ مہاراشٹر بھی اردو زبان وادب کے لیے سازگار رہا ہے۔ یہاں متعدد تحقیقی اداروں میں اردو زبان وادب پر تحقیقات ہوئی ہیں۔ ان اداروں میں اولین نام 'انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی' کا ہے۔ اس ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام (فروری 1947) میں سیف طیب جی کا رول سب سے اہم ہے۔ سید نجیب اشرف ندوی اس انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ناظم بنائے گئے۔ انھی کی نگرانی میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا سہ ماہی رسالہ 'نوائے ادب' جنوری 1950 سے نکلنا شروع ہوا۔ اپنے علمی، ادبی اور تحقیقی معیار کے سبب اس رسالے نے ادبی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کرنے کے ساتھ بہت جلد مقبولیت بھی حاصل کرلی۔ ان کی محنت اور کوششوں سے انجمن اسلام کی کریمی لائبریری تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ایک کارآمد لائبریری کا عمدہ نمونہ بنی اور متعدد تحقیقی کام معرضِ وجود میں آئے۔ انھی میں سے ایک تحقیقی مقالہ 'دبستانِ دیر' ہے جسے ذاکر حسین فاروقی نے نجیب اشرف ندوی کی نگرانی میں 1963 میں مکمل کیا۔ ظہیرالدین مدنی، شیخ فرید اور نظام الدین ایس گوریکر کی نگرانی میں بہت سے مقالے سپردِ قلم کیے گئے جن میں 'دارالمصنفین کی ادبی خدمات' 1976 (خورشید مظہر الحق نعمانی)، 'سید سلیمان ندوی: حیات اور خدمات' 1983 (شیخ عبداللہ غلام)، 'مولانا محمد علی جوہر: سیاسی فکر وفن' 1983 (سید شبیر علی)، 'حسن وعشق کا تصور اردو شاعری میں' 1983 (سید محمد حسن)، 'اردو میں طنز ومزاح' 1983 (خواجہ عبدالغفور)، 'جگن ناتھ آزاد اور ان کا فن' 1989 (شیخ نجم الہدیٰ)، 'مغربی خاندیش کی شعری خدمات' 1989 (محمد سلیم انصاری)، 'اردو میں تعلیمات کا استعمال سماجی' 1995 (سید شاہ) وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

مہاراشٹر کے محققین میں نجیب اشرف ندوی کا نام سرفہرست ہے۔ 'لغاتِ گجری' 1962 ان کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کوئی لفظ زائد یا بھرتی کے داخل نہیں کیے گئے۔ اسے نجیب اشرف ندوی نے اپنی برسوں کی ریاضت اور مطالعے کے بعد مرتب کیا ہے۔ 'لغاتِ گجری' پر نجیب اشرف ندوی کا فاضلانہ مقدمہ ان کی تحقیق وتدوین سے دلچسپی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ لسانیات پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے ولی دکنی پر ایک کتاب 'ولی گجراتی' 1950 میں شائع کیا تھا۔ اس کے مصنف ظہیرالدین مدنی ہیں۔ اس میں 'ولی کا زمانہ' تا 'ولی کی صوفیانہ شاعری' نو مضامین شامل ہیں۔ ولی کا وطن محققین میں موضوع بحث رہا ہے۔ میر تقی میر نے اسے اورنگ آبادی لکھا ہے، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے ولی کی وطنیت پر محققانہ مقالہ پیش کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ولی دراصل گجرات کا باشندہ تھا۔ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی نے ولی کو بغائرِ نظر تحقیق کیا، ان کی وطنیت پر کئی اہم ثبوت فراہم کیے اور اطمینان بخش حد تک یہ ثابت کیا کہ ولی کا وطن گجرات ہے۔

ادبی وتحقیقی سرگرمیوں کے حوالے سے عبدالرزاق قریشی کا نام خاصا اہم ہے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر کئی اہم تحقیقی کام سرانجام دیا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کا اردو کلام کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم کیا۔ اس کتاب میں مرزا مظہر کے حالاتِ زندگی، ان کی روحانی ودانی خدمات، اردو وفارسی شاعری اور اردو زبان کے متعلق ان کی مساعی کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ دیوانِ عزلت کی ترتیب وتدوین (1962) اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ دونوں کتابیں تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ 'مبادیاتِ تحقیق' عبدالرزاق قریشی کی تحقیق کے فن پر اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ اصولِ تحقیق سے متعلق اس کتاب کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے وابستگی اور طلبہ کی رہنمائی کے دوران اردو میں فنِ تحقیق پر کوئی ایسی منضبط تصنیف نہیں تھی جس میں تحقیق کے طریق کار سے بحث کی گئی ہو۔ چنانچہ عبدالرزاق قریشی نے اسی مقصد کے حصول کے پیشِ نظر اپنا مبسوط مقالہ 'مبادیاتِ تحقیق' سپردِ قلم کیا۔

ڈاکٹر حامداللہ ندوی مہاراشٹر کے محققین میں سے ہیں۔ انھیں عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر اچھی دسترس ہے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بحیثیت لائبریرین ایک عرصے تک اپنی خدمات انجام دی ہیں اور فیلو کی حیثیت سے تحقیقی کام بھی کیا۔ ان کی مرتب کردہ کتاب 'کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات' اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس میں ایک سو اٹھاسی مخطوطات کا تفصیلی تعارف ہے۔ یہ تمام مخطوطے بہ ذاتِ خود اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان میں دو مخطوطے تاریخی اور ادبی اعتبار

سے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ایک 'سندر سنگار' جو شاہجہاں کے عہد کے ایک نامور سیاستداں اور شاعر پنڈت سندر داس کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے اور دوسرا 'سیہ پوش' جو اورنگ آباد کے مشہور بزرگ شاہ رحمٰن کی ایک دکھنی مثنوی ہے۔

عبدالستار دلوی کا شمار مہاراشٹر کے اردو محققین میں ہوتا ہے۔'اردو میں لسانیاتی تحقیق' (1971) لسانیات پر ان کی مرتبہ کتاب ہے۔اس میں نامور ماہرین لسانیات کے 29 تحقیقی مقالات کو جگہ دی گئی ہے۔لسانیات پر تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی سے وابستگی کے دوران عبدالستار دلوی کی کتاب 'ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریق کار' 1984 میں منظر عام پر آئی۔اس میں اردو کے پندرہ نامور محققین کے تحقیقی مقالات جمع کردیے گئے ہیں اور عبدالستار دلوی کے دو مضامین 'ادبی اور لسانی تحقیق اصول اور طریق کار' اور 'اردو میں لسانی تحقیق کی اہمیت' شامل ہیں۔عبدالستار دلوی کی تصنیف کردہ تحقیقی کتابوں میں 'دو زبانیں دو ادب' اور 'ادبی و لسانی تحقیق اور تقابلی ادب' لسانیاتی تحقیق میں حوالہ جات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

'دو زبانیں دو ادب' گیان چند جین کی کتاب 'ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب' کے جواب اور رد میں لکھی گئی ہے۔ کھڑی بولی کو ہندی کے ساتھ جوڑنے، ہریانی، برج، اودھی اور بھوجپوری کو ہندی کی وسیع تر برادری کا فرد گرداننے کی کوشش کی ہے۔ اسے عبدالستار دلوی نے دلائل کے ساتھ رد کیا ہے:

''ان کا یہ کہنا کہ 'کھڑی بولی ہندی (اندازاً 1000ء تا 1500ء) محض ایک واحد زبان نہیں بلکہ شمالی ہند کی مختلف زبانوں اور بولیوں کا وفاق ہے' وغیرہ محلِ نظر ہے۔سب سے پہلے تو 'کھڑی بولی ہندی' کا فقرہ ہی غلط ہے۔یہ تو صرف کھڑی بولی ہے، جس سے بہت بعد میں ہندی کا ارتقا ہوا۔ 1000 تا 1500 کھڑی بولی ہندی تھی ہی نہیں۔ یہ تو ایک زبان کا تشکیلی دور تھا۔جین صاحب کا یہاں انداز علمی نہیں بلکہ سیاسی ہے ورنہ علمی طور پر، ہریانوی، برج، اودھی، بھوجپوری وغیرہ ہندی کی وسیع تر برادری کی زبانیں نہیں بلکہ آزاد زبانیں اور آزاد ادب ہیں۔ ان زبانوں کے بولنے والوں سے کب کسی نے پوچھا کہ ان کی رائے کیا ہے۔کیا وہ آزادانہ شناخت چاہتے ہیں یا ہندی میں ضم ہونا چاہتے ہیں؟ یہ تو یکطرفہ فیصلہ ہے جو ہندی سامراجیت کی مثال ہے۔'' (دو زبانیں دو ادب،ص 34-33)

ہمارے تحقیقی ادب میں غالب ابتدا ہی سے ایک اہم موضوع رہا ہے۔جس پر بے شمار مضامین، مقالات اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ شمیم طارق کی کتاب 'غالب اور ہماری تحریک آزادی' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو غالبیات میں بحث کے نئے در وا کرتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ پر ان کی نگاہ بڑی گہری ہے، انہوں نے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں غالب اور عہدِ غالب کی چلتی پھرتی جاذب نظر تصویریں دیکھی جاسکتی ہیں جو غالب شناسی میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔تصوف کے موضوع پر شمیم طارق کی تصنیف 'تصوف اور بھکتی تنقیدی اور تقابلی مطالعہ' ایک جامع کتاب ہے۔اس میں تصوف اور بھکتی کا مذہبی پس منظر اور مفہوم کو اجاگر کرنے میں جس سعی بلیغ سے کام لیا ہے، وہ صرف انھیں کا حصہ ہے۔

میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اردو زبان نے بمبئی کی سرزمین پر جنم لیا ہے تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں مذکورہ بالا صوبوں اور شہروں میں اردو زبان و ادب اپنی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے، اسی زمانے میں بمبئی میں بھی اس زبان و ادب کے لیے کام ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر مقالے میں، میں نے یہی کوشش کی ہے کہ بمبئی میں اردو کے سلسلے میں جو کچھ علمی و ادبی کام ہوا ہے اسے یکجا طور پر پیش کرسکوں۔

اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی، مہاراشٹر کے تحقیقی اداروں میں سے ہے۔ یہاں اردو میں متعدد تحقیقی مقالات لکھے گئے۔جن میں 'گجرات کے اردو شعرا' 1948 (سید ظہیرالدین مدنی)، 'امین گجراتی مثنوی یوسف و زلیخا' 1948 (محمد عبدالحمید فاروقی)، 'اردو تھیٹر' 1953 (عبد العلیم نامی)، 'اکبرالہ آبادی: حیات اور کارنامے' 1957 (عقیلہ نذیر احمد خان)، 'میاں خوب محمد چشتی: مثنوی خوب ترنگ' 1959 (علی نقوی جعفری)، 'بمبئی میں اردو' 1961 (میمونہ دلوی)، 'محمد حسین آزاد: حیات اور کارنامے' 1962 (عبدالستار دلوی)، 'آرزو لکھنوی: حیات اور کارنامے' 1971 (سید مجاہد حسین حسینی) وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اسمٰعیل یوسف کالج سے شائع ہونے والی کتاب 'اردو غزل ولی تک' سید ظہیرالدین مدنی کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔اس میں دکن کے قدیم اردو غزل گو شعرا پر سیر حاصل بحث ہے اور ان کے نمونہ کلام بھی درج ہیں۔ اس کتاب میں امیر خسرو کے دور سے زمانہ ولی تک کے ریختہ اور غزل کا تاریخی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے ریختہ کے ارتقائی سفر کا جائزہ لینے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ آخر میں ولی اور غزل کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمانہ ولی، غزل کا نقطۂ آغاز ہے۔

'میاں داد خاں سیاح اور ان کا کلام' (1957) سید ظہیرالدین مدنی کی ایک جامع اور مستند کتاب ہے۔ میاں داد خاں سیاح، مرزا غالب کے شاگردوں اور دوستوں میں سے تھے۔ظہیرالدین مدنی نے سیاح کے حالات زندگی اور کارنامے کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاح کا وطن اورنگ آباد تھا اور عنفوان شباب میں سورت میں قیام پذیر ہوگئے تھے۔ ظہیرالدین مدنی کے تحقیقی کارناموں میں سب سے مہتم بالشان کارنامہ 'سخنوران گجرات' کی تصنیف و تالیف ہے، جس پر بمبئی یونیورسٹی نے 1948 میں ظہیرالدین مدنی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ اس میں محقق کی علمی، ادبی اور تحقیقی صلاحیتیں ابھر کر سامنے آگئی ہیں۔ 'سخنوران گجرات' میں گجرات کے بیشتر شعرا کو جگہ دی گئی ہے اور نمونہ کلام بھی پیش کردیے گئے ہیں اس لحاظ سے اسے شعرائے گجرات کا تذکرہ کہنا بجا ہے۔

میمونہ دلوی شعبۂ اردو اسماعیل یوسف کالج بمبئی میں درس و تدریس سے وابستہ تھیں۔انھوں نے تین کتابیں تالیف کی ہیں۔اول 'بمبئی میں اردو 1914 تک' سید ظہیرالدین مدنی کی نگرانی میں لکھا گیا تحقیقی مقالہ ہے۔ 1970 میں یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔ملک کے مختلف خطوں میں علاقائی سطح پر 'دکن میں اردو' (1924)، 'پنجاب میں اردو' (1928) اور 'بہار میں اردو' جیسی اہم کتابیں لکھی گئیں۔ انہی کتابوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے میمونہ دلوی نے 'بمبئی میں اردو' کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا۔ ان سے قبل بمبئی میں اردو ادب کی مختلف اصناف میں جو کچھ کام ہوا تھا اسے انھوں نے یکجا کرنے کا کام کیا ہے۔ اس ضمن میں اپنی کتاب 'بمبئی میں اردو' کے پیش لفظ میں

رقم طراز ہیں:

''میرا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ اردو زبان نے بمبئی کی سرزمین پر جنم لیا ہے تاہم اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ جس زمانے میں مذکورہ بالا صوبوں اور شہروں میں اردو زبان وادب اپنی ارتقائی منزلیں طے کررہے تھے۔ اسی زمانے میں بمبئی میں بھی اس زبان وادب کے لیے کام ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر مقالے میں، میں نے یہی کوشش کی ہے کہ بمبئی میں اردو کے سلسلے میں جو کچھ علمی وادبی کام ہوا ہے اسے یکجا طور پر پیش کرسکوں۔'' (پیش لفظ بمبئی میں اردو، ص 4)

بمبئی میں اردو سے متعلق تحقیق کرنے والے اسکالرز کے لیے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ ڈھکڑے اردو کی ایک غیر معروف صنف سخن ہے۔ میمونہ دلوی نے بمبئی یونیورسٹی کی لائبریری اور کتب خانہ محمدیہ جامع مسجد بمبئی سے ڈھکڑے اور چند نامہ کے چند مخطوطات کو 'ڈھکڑے' (1979) کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ ان کی تیسری کتاب 'کوکن اور ممبئی کے اردو لوک گیت' (2001) ہے۔ اس کتاب میں کوکن کے حوالے سے خصوصاً گفتگو کی گئی ہے اور اردو لوک گیت کو یکجا کردیا گیا ہے۔

سینٹ زیویرس کالج بمبئی کے ابتدائی تعلیمی اداروں میں سے ہے۔ پروفیسر عبدالحی رضا کی نگرانی میں شعبۂ اردو قائم (1922) ہوا۔ اس شعبے میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے نظام الدین گوریکر نے تحقیق کے میدان میں اردو زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی نگرانی میں اردو زبان میں کئی اہم موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ جن میں 'مرزا رسوا: حیات اور ناول نویسی' 1962 (آدم غلام حسین شیخ)، 'نظیر اکبرآبادی: حیات اور شاعری' 1963 (ضمیر احمد خان)، 'قائم چاند پوری: حیات اور فن' 1965 (سید عبدالحی رضا)، 'وجہی کی تاج الحقائق' 1969 (نورالسعید اختر)، 'نوح ناروی: حیات اور شاعری' 1972 (ظفرالاسلام ظفر)، 'سردار جعفری: حیات اور شاعری' 1973 (داؤد کشمیری) اور 'جلیل مانک پوری: حیات اور فن' 1977 (عبدالخالق انصاری) وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

نظام الدین ایس گوریکر کی تحقیقی کتابوں میں 'طوطیانِ ہند' اور 'فکر ونظر' کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ 'طوطیانِ ہند' فارسی کے تین مشہور شاعر امیر خسرو دہلوی، حکیم ابوالفیض فیضی اور مرزا اسداللہ خاں غالب کی حیات وفن پر مختصر اور جامع کتاب ہے۔ فیضی کی تصانیف میں قرآن شریف کی بے نقط تفسیر 'سواطع الالہام' اور 'نل ودمن' بہت مشہور ہیں جس کا انتخاب نظام الدین گوریکر نے اپنی کتاب 'طوطیانِ ہند' میں 'داستانِ نل ودمن' کے نام سے کیا ہے۔ علاوہ ازیں گوریکر کی کتاب 'فکر ونظر' مختلف مضامین اور مقالات کا مجموعہ ہے جو ان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کا غماز ہے۔

مہاراشٹر کے محققین میں محمد ابراہیم ڈار، صفدر آہ سیتاپوری، عصمت جاوید، عالی جعفری، شرف الدین ساحل، یونس اگاسکر، انیس چشتی، رفیق جعفر، شمیم طارق اور پروفیسر صاحب علی ایسے نام ہیں جن کے ذکر کے بغیر مہاراشٹر کے محققین کی فہرست مکمل نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان تمام محققین اور ان کی تحقیقی کاوشوں کا ذکر ناگزیر ہے۔
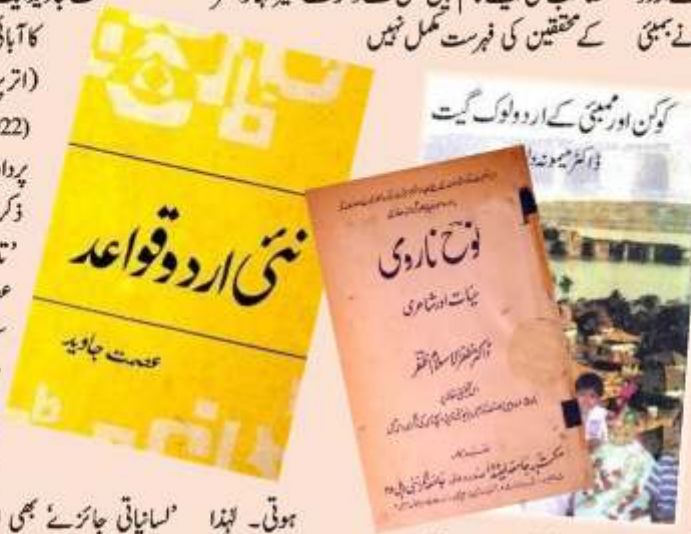
محمد ابراہیم ڈار عربی، فارسی اور اردو کے ایک وسیع المطالعہ محقق، ادیب اور انشا پرداز تھے۔ انھوں نے اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر محمد شفیع کی نگرانی میں مشہور عربی دانشور اور عالم جاحظ پر میکلوڈ عربک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے کام کیا۔ انھوں نے بے شمار تحقیقی مقالات سپردِ قلم کیے۔ ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی نے ابراہیم ڈار کے بکھرے ہوئے مضامین کو 'مضامین ڈار' کے نام سے مرتب کیا۔ مضامین ڈار کو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی نے چند مضامین کے اضافے کے ساتھ 2014 میں 'مقالات پروفیسر محمد ابراہیم ڈار' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں شامل مضامین تحقیق وتنقید کے اعلیٰ معیار پر ہیں۔ اس سے ان کی وسعت فکر اور بالغ نظری کا اندازہ ہوتا ہے۔

صفدر آہ سیتاپوری کا شمار بمبئی کے اردو محققین میں ہوتا ہے۔ تلسی داس پر ان کی تحقیقی تصنیف 'تلسی داس اور رام چرت مانس' اردو میں اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے، جس کی ادبی حیثیت مسلّم ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تلسی کے عہد کا پس منظر، اس کی حیات، تصانیف اور شاعری کا تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ صفدر آہ کی دوسری اہم کتاب 'فردوسی ہند' ہے۔ جس میں میرانیس کے عزیز شاگرد فارغ اور ان کے رزمیہ مرثیے کا اس طرح جائزہ لیا گیا ہے کہ مرثیے کی تمام خوبیاں سامنے آگئی ہیں۔ 'میر اور میریات' صفدر آہ کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں میر کے سوانحی کوائف، خاندانی پس منظر اور شاعری سے بحث ہے۔ ماہرین ادب نے میر کی شاعری کو نہ صرف پرکھا ہے بلکہ ان کی حیثیت کو تسلیم بھی کیا ہے بعض نے تو اردو کا سب سے بڑا شاعر مانا، یہاں تک کہ 'خدائے سخن' کہا گیا۔

عصمت جاوید ایک محقق اور ماہر لسانیات ہیں۔ ان کا آبائی وطن مئو ناتھ بھنجن (اترپردیش) ہے۔ ان کی پیدائش (1922) پونے میں ہوئی۔ ان کے پردادا شیخ حسام الدین کا ذکر اثر انصاری نے اپنی کتاب 'تذکرہ سخنورانِ مئو' میں کیا ہے۔ عصمت جاوید تقریباً اٹھارہ کتابوں کے مالک ہیں۔ ان کی پہلی مطبوعہ تصنیف 'فکر پیا' (1971) ہے۔ اس کا موضوع 'لسانیات اور ادبی تنقید' ہے۔

'لسانیاتی جائزے' بھی ان کی اہم کتاب ہے۔ 'نئی اردو قواعد' عصمت جاوید کا بہترین کارنامہ ہے۔ اس میں انھوں نے اردو قواعد کا تجزیہ سائنٹفک اور تکنیکی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لسانی پہلوؤں پر تحقیقی وتنقیدی نگاہ بھی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ 'ادبی تنقید'، 'وجدان' اور 'اردو پر فارسی کے لسانی اثرات تصرف کے آئینے میں' ایسی کتابوں کو لکھنے میں عصمت جاوید نے بڑی دیدہ وری اور تحقیق سے کام لیا ہے۔ ایک اور کتاب 'اردو میں فارسی کے دخیل الفاظ پر تصرف کا عمل' بھی اعلیٰ پایے کا نمونہ ہے، اس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی ہے۔ یہ کتاب بنیادی طور پر اردو میں عربی فارسی الفاظ کے تصرف کا تاریخی اعتبار سے جائزہ ہے۔ اس میں الفاظ کے صوتی، نحوی اور صرفی تصرف کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے بڑی کارآمد بحث کی ہے۔

ڈاکٹر عالی جعفری، شاعری، تنقید اور تحقیق سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ زبان وبیان، لسانی ارتقا، مختلف زبانوں کے اردو پر اثرات اور لفظ ومعنی کے رشتے پر ان کا مطالعہ کافی گہرا تھا۔ بمبئی کے اسمٰعیل یوسف کالج اور

الفنسٹن کالج کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔انھوں نے گجرات کے مشہور صوفی شاعر خوب محمد چشتی کی نادر و نایاب متصوفانہ شعری تصنیف 'خوب ترنگ' پر پروفیسر ظہیرالدین مدنی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔ 'خوب ترنگ' کا موضوع مسئلۂ وحدت الوجود ہے۔اس میں وہ لسانی خصوصیات موجود ہیں جو قدیم پنجابی، قدیم برج، ہریانی، مرٹھی اور دکھنی میں ملتی ہیں۔اس کا شمار جدید اردو مثنوی کی بنیادی کتابوں میں ہوتا ہے۔اس مقالے کو گجرات اردو اکادمی نے 1963 میں شائع کیا ہے۔علاوہ ازیں 'گجرات کی ایک غیر معروف مثنوی موہٗ سہاگ' ایک تحقیقی مقالہ ہے جسے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے رسالہ اردو میں 1951 میں کراچی سے شائع کیا تھا۔اس میں عالی جعفری نے موہٗ سہاگ کی شخصیت اور اس مثنوی

شرف الدین ساحل کی تحقیق 'ناگپور میں اردو' اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس سے قبل اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔

کی ادبی ولسانی حیثیت پر عالمانہ گفتگو کی ہے۔ایک محققانہ اور مبسوط مقالہ 'بمبئی کے کتب خانوں میں دیوان ولی کے قلمی نسخے' بھی اہم کارنامہ ہے۔

جالب مظاہری کا وطن سہسرام تھا مگر انھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ عروس البلاد بمبئی میں گزارا۔زبان وادب پر ان کا مطالعہ کافی گہرا تھا۔تدریسی کام کے دوران بچوں سے رابطے کی بنا پر تلفظ کی عام غلطیوں سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔انھیں پہلوؤں کے پیش نظر ان موضوعات پر تحقیق کی جانب راغب ہوئے۔مہاراشٹر میں اردو تحقیق کے لیے بہ لحاظ اصول وقواعد ایس جالب مظاہری کو سر فہرست رکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے علم عروض، صنائع بدائع، قواعد اردو اور اقسام نظم جیسے موضوعات پر کئی اہم تحقیقی تصانیف ادبی دنیا کو پیش کی ہیں۔ ان میں 'رموز نظم'، 'ممتاز القواعد' (فارسی) 'اصلاح تلفظ' اور 'قاموس الادب' وغیرہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ 'مطائبات شبلی' علامہ شبلی نعمانی کے شذرات ولطائف پر مبنی ایک لطیف ودلچسپ کتاب ہے۔

یونس اگاسکر اردو کے ایک معروف محقق، ناقد اور مترجم ہیں۔ اردو ادب کو انھوں نے کئی اہم کتابیں دی ہیں، جو ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی صلاحیت کی غماز ہیں۔ 'مراٹھی ادب کا مطالعہ'، 'اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو'، 'فکر وفن اور فکشن'، 'نٹ سمراٹ' اور 'غالب ایک بازدید' وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔ تحقیق کے موضوع پر ان کی جامع تصنیف 'اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو' ہے۔یہ تحقیقی مقالہ ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر کی نگرانی میں تحریر کیا گیا جس پر بمبئی یونیورسٹی نے یونس اگاسکر کو پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر یونس اگاسکر کی علمی صلاحیت اور ان کی کتاب 'اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو' کی ادبی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر یونس اگاسکر ادب کے ساتھ ساتھ سماجیات کے بھی سند یافتہ ہیں اور لسانیات کی باقاعدہ تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کا زیر نظر تھیس 'اردو کہاوتیں اور ان کے سماجی ولسانی پہلو' سماجیات ولسانیات کا خوب صورت سنگم ہے۔اردو میں ضرب الامثال اور کہاوتوں پر کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ اکثر وبیشتر کہاوتوں، محاوروں اور تلمیحوں کو ملا دیا گیا ہے۔ڈاکٹر یونس اگاسکر نے نہ صرف تمام ماخذ کو پوری دل جمعی سے کھنگالا ہے، بلکہ تمام وکمال سعی وجستجو سے کام لیا ہے اور موضوع کے تمام گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی جامع تصنیف ہے۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس کتاب کو اپنے موضوع پر پہلی جامع تصنیف ہونے کی سند دے دی ہے جس سے اس کی اہمیت دو چند ہو گئی ہے۔

شرف الدین ساحل محقق، ناقد اور تخلیق کار ہونے کے ساتھ ادب کے پارکھ بھی ہیں۔ تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تصانیف کسی مخصوص صنف تک محدود نہیں بلکہ ادب کی مختلف اصناف کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ عہد حاضر میں ان کا شمار مہاراشٹر کے اہم محققین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے 1977 میں 'ناگپور میں اردو' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ناگپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ شرف الدین ساحل کی تحقیق 'ناگپور میں اردو' اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس سے قبل اس موضوع پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ اپنے تحقیقی مقالے میں انھوں نے اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے لے کر بیسویں صدی کی آخری دہائی تک ناگپور کی ادبی شخصیتوں اور ان کے تحریری کارناموں کا بغائر مطالعہ کرتے ہوئے اپنی ذہانت اور تنقیدی صلاحیتوں کا عملی ثبوت فراہم کیا ہے، اور ان کے ادبی سرمایوں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ 'بیان میرٹھی: حیات اور شاعری' ساحل کا ایک عمدہ تحقیقی کارنامہ ہے۔ شرف الدین ساحل کی یہ کاوش ان کے تحقیقی جوش، ہمت واستقامت اور مسلسل کارکردگی کی بدولت ہی ممکن ہو سکا ہے۔

دکن مسلم ایجوکیشن اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پونہ بنیادی طور پر ایک علمی ادارہ ہے۔ اسے اردو اور فارسی زبان وادب کی تدریس اور فروغ کے مقصد سے قائم کیا گیا۔ اس ادارے میں علم وادب کی تدریس کے ساتھ ریسرچ کے طلبہ کے لیے ایک ریسرچ سینٹر بھی قائم ہے۔ جہاں سے ریسرچ اسکالر اپنے تحقیقی کام میں خوب استفادہ کرتے ہیں۔ اس انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہونے والی کتابوں میں 'خان بہادر پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز احوال وآثار' (2003) اور 'جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل' (2004) اہمیت کی حامل ہیں۔

انیس چشتی مہاراشٹر کے شہر پونے کے ایک معروف اسکالر اور محقق ہیں۔ انھوں نے بے شمار علمی، ادبی اور تحقیقی مقالات لکھے۔ عالمی رابطۂ ادب اسلامی کے سیمیناروں، اردو اکیڈمیوں، یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں میں اپنے مقالے پیش کیے۔ ان کے تحقیقی، علمی وادبی مقالات کا مجموعہ 'معصری وتحقیقی مقالات' کے نام سے 2012 میں شائع ہوا۔

رفیق جعفر ایک ممتاز ادیب، افسانہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر کے ساتھ ایک محقق بھی ہیں۔ اردو ادب کو انھوں نے کئی کتابیں دی ہیں۔ 'اردو ادب کے تین بھائی' ان کی تحقیقی کتاب ہے۔ اس میں اردو ادب کے تین بھائی محبوب حسین جگر، ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین کے ادبی وصحافتی کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی (قیام 1982) تحقیق وتدریس کا ایک اہم شعبہ ہے۔ اپنے قیام کے ابتدائی زمانے سے ہی ایک فعال اور متحرک شعبہ رہا ہے۔ اس شعبے کو پروفیسر عبدالستار دلوی، پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی، پروفیسر یونس اگاسکر، پروفیسر معین الدین جینابڑے اور پروفیسر صاحب علی جیسے اساتذہ ملے جن کی رہنمائی میں بے شمار تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ اس شعبے کا ریسرچ اینڈ ریفرڈ جرنل 'اردو نامہ' پروفیسر صاحب علی کی سعی بلیغ کا نادر ونایاب کارنامہ ہے، جو اپنی علمی وفکری ترجیحات اور رویوں کے سبب ایک معتبر جریدے کی حیثیت رکھتا ہے۔

■

Dr. Mohammad Zubair
MANUU Coordinator
LSC. M.S College of Arts.Comm.Sci. & BMS
Kausa Mumbra, Thane - 400612 (MS)
Mob:9022951081
m.zubair.mau@gmail.com

علم طب

سید سخی حسن نقوی

علم طب کی ابتدا بھی ویدک دور ہی میں ہوگئی تھی۔ اتھروید میں بہت سی بیماریوں اور ان کے علاج کا ذکر موجود ہے۔ آریہ لوگ اپنی قربانیوں کی چیر پھاڑ کیا کرتے تھے تاکہ قربانیاں دیوتاؤں کے شایانِ شان تحفہ بن سکیں۔ اس عمل سے انھوں نے ویدک دور ہی میں 'تشریح اعضا' کے سلسلے میں کافی اہم تجربات کرلیے اور اس طرح گویا طب و جراحی کی عظیم عمارت کی خشتِ اوّل رکھی۔

قدیم ہندوستانیوں نے دواؤں میں کام آنے والی جڑی بوٹیوں کے بارے میں حضرت عیسیٰ سے سیکڑوں برس پہلے سیکڑوں تجربوں کے بعد کافی معلومات فراہم کرلی تھیں۔ اس سلسلے میں نوجوان راجکمار جیوک کی کہانی، جس کا ذکر گذشتہ باب میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، اس کا بہترین ثبوت ہے۔ جڑی بوٹی کی اس معلومات نے نتیجے میں اس علم کو جنم دیا جسے 'آیورویدک' کہتے ہیں۔

چرک

آیورویدک کی باقاعدہ تعلیم چھٹی صدی ق م سے بہت پہلے **اتریہ** اور **کھیتل** نامی دو طبیبوں اور ان کے چھ شاگردوں نے دی جن میں اگنی ویش سرفہرست تھا۔ اگنی ویش کے ایک شاگرد چرک نے فنِ طب پر ایک **سام ھت** لکھا۔ چرک کو، جو ٹکشیلا کے دارالعلوم سے وابستہ تھا، فنِ طب کا امام مانا جاتا ہے۔ چرک کے **سام ھت** پر دوسری صدی عیسوی میں ایک دوسرے عالم نے جس کا نام بھی چرک ہی تھا، نظر ثانی کی۔ چرک کا سام ہت اس اعتبار سے کہ وہ اتنے پرانے زمانے میں لکھا گیا، ایک عظیم الشان تصنیف ہے۔ منجملہ اور بہت سی باتوں کے اس میں ایک مثالی شفاخانے کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ اس میں جڑی بوٹیوں سے تیار کی گئی دواؤں اور سونے اور دوسری دھاتوں سے بنائے گئے مرکبات کے نسخے (کشتہ جات) درج ہیں۔

طب موریہ عہد میں

تیسری صدی ق م میں ہم دیکھتے ہیں کہ اشوک نے حکومت کا رنگ ہی بدل دیا۔ اس کا دورِ حکومت رفاہِ عام کے کاموں کے لیے ممتاز ہے۔ منجملہ اور بہت سی باتوں کے اشوک نے دواؤں میں کام آنے والی جڑی بوٹیوں کی کاشت کا انتظام کرایا تھا جو نہ صرف ملک میں کام میں لائی جاتی تھیں بلکہ بیرونی ممالک کو مفت بھیجی جاتی تھیں۔ اشوک نے اپنی سلطنت میں جابجا انسانوں اور حیوانوں کے لیے شفاخانے کھلوائے تھے جہاں علاج مفت کیا جاتا تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں شالی ہوترا نامی طبیب نے جانوروں کے علاج کے موضوع پر ایک کتاب لکھی۔ یونانی شہادتیں مظہر ہیں کہ سکندر اعظم نے پنی فوج میں چند ہندوستانی طبیبوں کو ملازم رکھ لیا تھا جس سے ظاہر ہے کہ ہندوستانی فنِ طب سے لوگ کافی متاثر تھے۔

فن جراحی

فنِ جراحی (سرجری) سے جس پر مغربی دنیا آج ناز کر رہی ہے، قدیم ہندوستان کے لوگ ناواقف نہ تھے اور چھٹی صدی ق م میں بے تکلفی کے ساتھ اسے کام میں لاتے تھے۔ سشرت نامی طبیب کاشی کے دارالعلوم میں جو آج بھی ہندوستان کے قدیم علوم کا مرکز ہے فنِ جراحی میں درس دیا کرتا تھا۔ اس نے طب اور جراحی پر ایک کتاب لکھی جس میں جراحی کے 17 آلات کا ذکر کیا گیا ہے، جن میں بعض اتنے تیز ہوتے تھے کہ ان سے بال کی کھال نکالی جاسکتی تھی۔ اسے ال ہیثم کہتا ہے "پیٹ چاک کرکے بچہ پیدا کرنے، ہڈیوں کے جوڑ کو جگہ پر بٹھانے اور جسم کی ناقص ساخت کو درست کرنے کا فن، جسے آج کل کی اصطلاح میں 'پلاسٹک سرجری' کہتے ہیں، ہندوستان میں کمال کے اس درجے پر پہنچ گیا تھا جس کی مثال دنیا کے کسی اور ملک میں ملنی مشکل ہے۔ قدیم ہندوستانی جراح ناک، کان اور ہونٹوں کو جو جنگ میں یا عدالتی قطع و برید کے نتیجے میں بگڑ جاتے، درست کرنے میں حیرت انگیز مہارت رکھتے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سرجنوں نے مصنوعی ناک لگانے کا فن ہندوستانیوں سے سیکھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی طب اس معاملے میں یورپ کی طب سے اٹھارویں صدی عیسوی تک آگے رہی۔

علم معدنیات

ان طبی سرگرمیوں کے متوازی ہم دیکھتے ہیں علم معدنیات میں بھی تجربے کیے جارہے تھے جنھوں نے نتیجے میں فنِ طب کو تقویت پہنچائی۔ پانچویں صدی ق م اور اس کے بعد ہندوستان آنے والے یونانیوں نے ہندوستان والوں کو بے تکلفی کے ساتھ دھاتوں کو استعمال کرتے دیکھا۔ ہندوستان کے لوگ اس وقت تک تمام دھاتوں کے استعمال سے واقف ہوچکے تھے۔ وہ کانسہ کو پگھلانا اور ڈھالنا جانتے تھے۔ کانسہ ایک بہت نازک دھات ہوتی ہے۔ آج تک گھڑیالیں اسی دھات کی بنائی جاتی ہیں۔ یہ اتنی نازک ہوتی ہے کہ گھڑیال زمین پر گرکر فوراً ٹوٹ جاتی ہے۔

چنانچہ دوسری صدی ق م کی مشہور شخصیت، پتنجلی، جس نے پانینی کی مشہور و معروف ویاکرن کی شرح لکھی، معدنیات اور کیمیا دونوں کا ماہر تھا۔ اس زمانے

میں لوہے کا لفظ تمام دھاتوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ پتنجلی کی لوہا شاستر جس میں دھاتوں کو پگھلانے، نتھارنے اور مختلف دھاتوں کے مرکب تیار کرنے کے مسائل پر بحث کی گئی ہے، معدنیات کے موضوع پر ہماری قدیم ترین اور سب سے مستند کتاب ہے۔

الکیمی

دوسری یا تیسری صدی عیسوی کا ایک بودھ عالم، ناگ ارجن، جو بدھ مذہب کے 'مہایان' فرقے کا مبلغ، ماہر موسیقی، طبیب اور یوگی تھا، علم طب و معدنیات میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ناگ ارجن کو الکیمی کا، یا جسے عرف عام میں آج کل کیمیا گری کہتے ہیں، امام مانا جاتا ہے۔ معمولی اور گھٹیا قسم کی دھاتوں کو کیمیاوی عمل کے ذریعے سونے میں تبدیل کرنا، اس کی دلچسپی کا مرکز تھا۔ چنانچہ ناگ ارجن 'بڑے بڑے پتھروں کو ایک مقدس اور خاص طریقے سے جوش دیے گئے عرق، دوا، یا مرکب سے تر کر کے سونے میں تبدیل کر دیتا تھا۔ ناگ ارجن ہی نے سشرت کی کتاب پر نظر ثانی کی اور اس میں ضروری اضافے کیے۔

رسائن

الکیمی کی طرح ایک اور فن جسے 'رسائن' کہتے ہیں یعنی زندگی کو طول دینے اور بڑھاپے کو جوانی میں تبدیل کرنے کا فن اس زمانے میں کافی مقبول تھا۔ سیکڑوں قسم کی جڑی بوٹیوں سے تیار کیے گئے طرح طرح کے مرکبات، نسخے اور سونے چاندی کے کشتے استعمال کیے جاتے تھے۔ ناگ ارجن نے اس موضوع پر بھی ایک رسالہ سپرد قلم کیا۔

اہم تصانیف

چھٹی صدی عیسوی تک فن طب و جراحی میں خاطر خواہ اضافے ہو گئے۔ خصوصاً دواسازی یا عطاری کے فن کی تدوین اسی زمانے میں ہوئی۔ کیمیا تیات (باٹنی) اور طب نے مل جل کر ترقی کی راہیں طے کیں۔ تعلیمی درس گاہوں میں طب اور جراحی کا درس برابر دیا جاتا رہا۔ طلبا لاشوں کو چیرتے پھاڑتے، مختلف تجربات کرتے اور مریضوں کے آپریشن کرتے۔ بودھ خانقاہوں اور جین مذہب کے تعلیمی مرکزوں میں طب کی تعلیم خصوصیت کے ساتھ دی جاتی تھی۔ ملک میں جگہ جگہ اسپتال قائم تھے جن کی نگرانی قابل وید اور طبیب کرتے تھے۔ اس دور میں فن طب پر کئی اہم کتابیں تصنیف کی گئیں۔ فن طب کے ایک ماہر **مادھوا کر** نے ایک کتاب رگونی وِن چیہ تصنیف کی۔ اسی دور میں دھن ونتری نے جو چندر گپت وکر مادتیہ کے نورتنوں میں سرفہرست تھا، طب کی ایک فرہنگ تیار کی جسے دھن ونتری نگھنتو کہتے ہیں۔

قدیم ہندوستانی طب کا بنیادی تصور

قدیم ہندوستانی طب کا بنیادی تصور اخلاط اربعہ ہیں، یعنی بلغم، سودا، صفرا اور خون۔ ابتدا میں صرف پہلی تین خلطیں شمار کی جاتی تھیں، خون کا اضافہ بعد میں کیا گیا۔ ہندوستانی طبیب صحت مند جسم کے لیے ان خلطوں کا متوازن رہنا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک پانچ قسم کی ہواؤں سے جسم کا عمل برقرار رہتا ہے۔ پہلے وہ ہوا جو حلق سے نکلتی ہے اور تقریر پیدا کرتی ہے۔ دوسری وہ جو

ہندوستان کے قدیم اطبا اگرچہ دماغ کے افعال سے پوری واقفیت نہیں رکھتے تھے اور دل ہی کو عقل کا مرکز بھی جانتے تھے لیکن وہ ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت اور نظامِ عصبی کے وجود سے واقف تھے۔

دل سے نکلتی ہے جس کے ذریعے انسان سانس لیتا اور غذا نگلتا ہے۔ تیسرے وہ جو معدے سے نکلتی ہے اور پیٹ میں غذا کو پکاتی اور ہضم میں مدد دیتی ہے۔ چوتھی وہ جس کے ذریعے فضلات خارج ہوتے ہیں۔ پانچویں 'نفوذ پذیر' ہوا، جو جسم کی رگوں میں سرایت کرتی ہے اور جس کے ذریعے دورانِ خون اور جسم کی حرکت قائم ہے۔

اہلِ ہند اس بات کے قائل تھے کہ پہلے معدہ غذا کو پکاتا ہے، پھر وہ دل کی طرف منتقل ہوتی ہے اور اس کے بعد جگر کی طرف، جہاں اس کا جوہر خون میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خون کا ایک حصہ گوشت بن جاتا ہے اور باقی سے چربی اور ہڈیاں وغیرہ بنتی ہیں۔ ہندوستان کے قدیم اطبا کے نزدیک استحالۂ خون کے اس عمل کو تیس دن لگنے چاہئیں۔ ہندوستان کے قدیم اطبا اگرچہ دماغ کے افعال سے پوری واقفیت نہیں رکھتے تھے اور دل ہی کو عقل کا مرکز بھی جانتے تھے لیکن وہ ریڑھ کی ہڈی کی اہمیت اور نظامِ عصبی کے وجود سے واقف تھے۔

ہندوستانی طبیب بغداد میں

آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں عباسی خلفا نے ہندوستانی طبیبوں کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ حکومت نے انھیں سرکاری شفاخانوں میں طبیبِ خاص کے اعلیٰ مناصب سے نوازا، اور ان سے طب، دواسازی، سمیات، فلسفہ، ہیئت اور دوسرے علوم کی سنسکرت کی کتابوں کے عربی زبان میں ترجمے کرائے۔ خلیفہ مامون کے زمانے میں جو عباسی خلفا میں سب سے زیادہ اولوالعزم تھا، ریاضیات، ہیئت، طب اور دیگر علوم نے پہلے کے مقابلے میں زیادہ ترقی کی۔ بے شمار سنسکرت کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا گیا اور دوبان نامی ایک برہمن عالم کو دارالترجمہ کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

جس طرح یورپ کی طب عربی فن طب سے متاثر ہے اسی طرح عرب کی طب ہندوستانی فن طب کی مرہونِ منت ہے۔ عرب کے عالم ہندوستانی کتابوں کی بہت قدر کرتے تھے۔ چنانچہ اَوی سینا (ابن سینا)، دھازیز (الرازی) اور سراپین (ابن سرابی) کے جو ترجمے عربی سے لاطینی زبان میں کیے گئے، ان میں حکیم شرک (چرک) کا نام بار بار آتا ہے، اور یہ وہی چرک ہے جس نے چھٹی ق م میں فن طب پر ایک سام ہت تصنیف کیا، اور دوسری صدی عیسوی میں دوسرے چرک نے اس پر نظر ثانی کی۔

ہندوستانی طب یورپ میں

ہندوستان میں الکیمی (کیمسٹری) 'فن طب کی لونڈی' کی حیثیت رکھتی تھی اور اسی حیثیت میں وہ بیرونی ممالک میں پہنچی۔ بیماریوں کے علاج کے سلسلے میں ہندوستانی دواؤں نسخوں اور کشتوں کا استعمال یورپ میں عام ہو گیا اس کا ایک معمولی ثبوت یہ ہے کہ انگریزی میں جست کی آکسیجن کے مرکب کو ٹٹی کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے عربی 'طوطیہ' سے لیا گیا، اور طوطیہ خود سنسکرت کے 'تتھ'، جست (زنک) سے ماخوذ ہے، جسے عام طور پر 'نیلا تھوتھا' کہتے ہیں۔

اب جب کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں اور اپنے ملک و قوم کی تعمیر میں ہمہ تن مصروف ہیں، موقع ہے کہ ہم اپنے عظیم ماضی کے آئینے میں ایک شان دار مستقبل کی تعمیر کریں اور ہر علمی معاملے میں رہنمائی اور ہدایت کے لیے مغربی سائنس دانوں گیلیلیو، آرکیمڈیز اور کاپرنکس کی بجائے کناد، چرک، اور آریہ بھٹ اور اپنے دوسرے عظیم عالموں سے استفادہ کریں جنھیں زمانہ لاکھ بھلانے کی کوشش کرے لیکن تاریخ رہتی دنیا تک یاد رکھے گی۔ ■

ماخذ: ہمارا قدیم سماج، **مصنف:** سید تحی حسن نقوی، **تیسرا ایڈیشن:** 1998، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم 'زبان اور زمینی صورت حال' کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورتِ حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

تبصرہ و تعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وماعلیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلّات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیر ضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

انسانی حقوق

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

صفحات: 514، قیمت: 235 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، 93، فورتھ فلور، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی 25

انسانی حقوق ایک وسیع عنوان ہے۔ انسانی حقوق کا جدید تصور دوسری جنگ عظیم کے بعد مرتب کیا گیا۔ ایک عام آدمی کے لیے انسانی حقوق وہ ہیں جو انسان کو پیدائش سے لے کر اس کی موت تک ہر جگہ اور ہر وقت برابری کی بنیاد پر حاصل ہونے چاہئیں۔

پیش نظر کتاب انسانی حقوق خواجہ عبدالمنتقم کی تصنیف ہے۔ خواجہ عبدالمنتقم وزارت قانون، وزارت برائے اقلیتی امور، اقلیتی یونیورسٹی اور یونین پبلک سروس کمیشن سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے ہیں۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں ان کی دو درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ ان کی یہ تمام تصانیف خواتین سے متعلق ہیں۔ قانون کی تمام باریک شقوں پر ان کی گہری نظر ہے۔

خواجہ عبدالمنتقم کی کتاب انسانی حقوق میں تقریباً ہر طرح کے حقوق کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں انسانی حقوق، تعارف اور تاریخی پس منظر، انسانی حقوق اور بین الاقوامی روابط، انسانی حقوق اور بھارت کا آئین، انسانی حقوق، اقلیتیں اور بھارت کا آئین، انسانی حقوق اور مذہبی رواداری، انسانی حقوق اور قانون کی بالادستی، انسانی حقوق اور ذرائع ابلاغ، انسانی حقوق اور خواتین، انسانی حقوق اور بچے، انسانی حقوق اور صارفین، انسانی حقوق اور متعلقہ قوانین، انسانی حقوق اور بین الاقوامی دستاویزات وغیرہ پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب میں ضمیمے کے طور پر عالمی انسانی حقوق کونسل اور ذیلی ادارے، انسانی حقوق سے متعلق بین الاقوامی دستاویزات کی فہرست اور انسانی حقوق سے متعلق اصطلاحات وغیرہ کو بھی شامل کتاب کیا گیا ہے۔

انسانی حقوق اور بین الاقوامی روابط کے ذیل میں خواجہ عبدالمنتقم نے لکھا ہے کہ:

''گزشتہ صدی کی آخری دہائی میں انسانی حقوق سے متعلق کام کرنے والے غیر سرکاری اداروں کی تعداد میں دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ میڈیا نے بھی اس عرصے میں انسانی حقوق کے تحفظ کی اہمیت اور ان کی خلاف ورزی و پامالی سے متعلق امور کو زیادہ سے زیادہ جگہ دی ہے۔''

خواجہ عبدالمنتقم کے مطابق میڈیا کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے متعلق واقعات کو عوام کے سامنے لائے اور ارباب حکومت کو بھی اس سے آگاہ کرے۔ انھوں نے مختلف دفعات کے تحت یہ بات بھی سمجھنے کی سعی بلیغ کی ہے کہ تمام انسانوں کو حق خود ارادیت حاصل ہے، اس حق کی بدولت وہ آزادانہ اپنے سیاسی تشخص کا تعین کرتے ہیں اور اپنی معاشی، سماجی اور ثقافتی ترقی کے لیے عمل پیرا ہوتے ہیں۔

آج صورت حال یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی حصے میں اگر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی جاتی ہے، تو اس کے خلاف دنیا کے ہر گوشے سے آواز اٹھتی ہے، لیکن ان سب کے باوجود ہنگامی حالات میں انسانی حقوق یا بنیادی حقوق کی معطلی کے سلسلے میں بہت سی توضیحیں اور وضاحتیں دنیا کے تقریباً ہر ملک کے دستور میں موجود ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ انسانی حقوق کا احترام نہ صرف جمہوری بلکہ غیر جمہوری ممالک کے ساتھ ساتھ ایسے ممالک پر بھی اخلاقی طور پر لازم ہے جو ضابطے کے مطابق اقوام متحدہ کے رکن نہیں ہیں۔

ہندوستان میں بھی ناگہانی سانحات سے متعلق بہت سی توضیحیں آئین کی مختلف دفعات کے تحت درج ہیں، جن پر حکومت کے اعلیٰ اداروں کی ذمے داری ہے کہ وہ ان پر باضابطہ عمل آوری کو یقینی بنائے۔

خواجہ عبدالمنتقم 'انسانی حقوق' جیسی اپنی تمام کتابوں کے لیے قابل مبارکباد ہیں اور ان کی اس طرح کی تصنیفات کی ستائش کی جانی چاہیے۔

'انسانی حقوق' کا یہ اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ اس میں نئی تحقیقات کی روشنی میں سامنے آنے والی کئی اہم دفعات کو شامل کیا گیا ہے۔

قومی کونسل کو بھی مبارکباد پیش کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اس ادارے نے ایسے نایاب موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کو اولیت دی ہے جو اردو زبان میں گزشتہ صدی تک نایاب تھیں۔ امید ہے کہ قومی کونسل کی دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کی بھی شایانِ شان پزیرائی ہوگی۔

تحقیق و تنقید

نئی صدی نیا ادب

مصنف: شمیم طارق

صفحات: 148، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2023

ناشر: ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی

مبصر: عبدالباری قاسمی، شاہین باغ، نئی دہلی

شمیم طارق کا شمار اردو کے اہم ناقدین، محققین اور قلمکاروں میں ہوتا ہے، کئی دہائیوں سے تنقیدی، تحقیقی، صحافتی مضامین اور کالم مسلسل لکھ رہے ہیں، دو درجن کے قریب اہم اور معیاری کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ روزنامہ انقلاب اور دیگر قومی سطح کے اخبارات میں ہزاروں کالم شائع ہو چکے ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے بھی متعدد مونوگراف اور کتابیں شائع کی جا چکی ہیں۔ شمیم طارق کی اہم کتابوں میں غالب اور ہماری تحریک آزادی، صوفیا کی شعری بصیرت میں شری کرشن، تاثر اور تجزیہ، تقابل اور تناظر، شرف محنت و کفالت، ٹیگور شناسی، بہادر شاہ ظفر، غالب اور 1857 انجمن اسلام اور اس کی کریمی لائبریری، سید نجیب اشرف ندوی، تصوف اور بھکتی، کالی داس گپتا رضا اور صوفیا کا بھگتی راگ" وغیرہ شامل ہیں۔

شمیم طارق کا یہ امتیاز ہے کہ متنوع موضوعات پر مدلل شگفتہ اور دلکش نثر تخلیق کرتے ہیں۔ اس وقت انھیں اردو کے ممتاز قلمکاروں میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

'نئی صدی نیا ادب' شمیم طارق کی بائیسویں تصنیف ہے جسے ساہتیہ اکادمی نے شائع کیا ہے۔ شمیم طارق ان موضوعات پر خامہ فرسائی کرنا پسند کرتے ہیں جن پر عام طور پر قلمکار توجہ نہیں دیتے یا اجتناب کرتے ہیں انہوں نے اس کتاب میں بھی اسی طرح کے موضوعات کو شامل کیا ہے۔ شمیم طارق نے یہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں اردو میں کن نئے موضوعات پر لکھا گیا یا جن موضوعات پر قدیم زمانہ سے لکھنے کا سلسلہ جاری ہے ان میں کس طرح کی ندرت پیدا کی گئی ہے۔ شمیم طارق کی مذکورہ کتاب "نئی صدی نیا ادب" میں، ویدک ادب، دلت ادب، آدیباسی سماج اور اردو ادب، تقابلی مطالعہ، مطالعہ لسانیات، اردو اور ہندی کی ساجھی وراثت، اردو ادب میں ہندوستانی اساطیر اور فکر و فلسفہ، ثقافتی مطالعات، نکڑ ناٹک اور اس کی سماجی معنویت، تانیثیت اور اردو کی ادبی روایت، مطالعہ تصوف، ناول، افسانے، نئی نظم، غزل، غیر افسانوی نثر، ادبی تحقیق، ادبی تنقید، تبصرے، ترجمے اور بچوں کا ادب وغیرہ مضامین شامل ہیں۔ ان عناوین سے ہی اس کتاب کی اہمیت اور معنویت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تانیثیت اور اردو کی ادبی روایت مضمون سے ایک اقتباس دیکھیے " دنیا میں سب سے عظیم مرتبہ ماں کا ہوتا ہے مگر اب ایسے واقعات رونما ہونے کے ساتھ ایسے الفاظ بھی استعمال کیے جا رہے ہیں جو لفظ ماں کے تقدس کو مجروح کرتے ہیں۔ مثلاً پہلے ماں، دائی ماں اور سوتیلی ماں جیسے الفاظ ہی سننے میں آتے تھے اور ماں، دائی ماں کے الفاظ کانوں میں رس گھولتے تھے بعض سوتیلی مائیں بھی سگی ماں کی مثال ہوا کرتی تھی۔ اب lactating mother کا لفظ دائی ماں کے بجائے آیا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ Foster mother پرورش اور نگہداشت کرنے والی عورت کو کہتے ہیں۔ Genetic mother وہ ہے جس کا ماں ہونا علم توالد و تناسل سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح Biological Mother حیاتیاتی ماں Surrogate Mother یعنی قائم مقام ماں کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ ان لفظوں سے طرز فکر اور طرز زندگی میں فرق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زبان و لغت کو نئے نئے الفاظ تو ملے ہی ہیں سائنسی ایجادات نے انسان کو حیران بھی کر دیا ہے مگر ماں اور بیٹے کے رشتے پر زوال آیا ہے۔ انسان دولت کمانے کے لیے ماں کی ممتا پر بھی ڈاکہ ڈال رہا ہے اور رشتے کے تقدس پر بھی۔ (ص: 72-71)

ماں پر اردو میں بے شمار مضامین لکھے گئے اور لکھے جاتے ہیں مگر شمیم طارق نے اپنے اس مضمون میں جس پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے وہ قابل غور ہے۔

غزل اردو کی سب سے مقبول صنف ہے اس پر مسلسل لکھا بھی جاتا رہا ہے۔ مضمون 'غزل' سے شمیم طارق کا اقتباس دیکھیے:

"ہر دور کی غزل کے موضوعات، زبان اور پیرایۂ بیان میں بہت کچھ مشترک بھی ہے اور بہت کچھ مختلف بھی، ترقی پسند ادبی تحریک کی ابتدا اور عروج کے بعد نئی غزل یا نئی شاعری، جدید شاعری یا جدید غزل اور پھر مابعد جدید عہد میں ایسی شاعری اور غزل گوئی کا سلسلہ شروع ہوا جو پرانی شاعری یا پرانی غزلوں کا تسلسل اور قابل فہم ہونے کے باوجود نئے پن کا احساس دلاتی ہے۔ مثال کے طور پر آزادی کے بعد 75 برسوں میں تقسیم، دربدری، بے روزگاری، فساد اور عدم تحفظ کے احساسات غزل کے شعروں کا موضوع بنے مگر ہنگامی حالات میں تخلیق کیے گئے اشعار یا وہ ہنگامی موضوعات جو غزل میں موزوں کیے گئے، کم ہی شعری تجربہ بن سکے۔" (ص: 108)

کتاب کے مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے اردو کا دامن بہت وسیع ہے۔ آج نئے موضوعات پر بھی لکھا جا رہا ہے اور قدیم موضوعات میں بھی جدت پیدا کی جا رہی ہے۔ شمیم طارق کی تحریروں میں تعریف و تنقیص کے باب میں افراط و تفریط کا پہلو نہیں دکھائی دیتا۔ بہت سے ادیبوں اور قلمکاروں کی گرفت بھی کرتے ہیں اور بہت سے قلمکاروں کی تعریف بھی مگر خوبصورت انداز میں اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی اور سنجیدگی برقرار رہتی ہے۔

کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمیم طارق نے بہت محنت اور عرق ریزی سے اس کتاب کو تحریر کیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی اور شمیم طارق دونوں اس کتاب کی اشاعت کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اچھا ہوگا اگر ساہتیہ اکادمی اس کتاب کو ہندی اور دیگر زبانوں میں بھی شائع کرے۔

ترتیب

نعیم انیس - شخصی انفراد اور ادبی اختصاص

مرتب: پروفیسر محمد کاظم

صفحات: 624، قیمت: 600 روپے، سنہ اشاعت 2024

ناشر: ادبیہ پرنٹرس، کولکاتا

مبصر: ڈاکٹر شاہد حبیب (اسسٹنٹ ایڈیٹر اردو، پبلی کیشن ڈویژن این سی ای آر ٹی، شری اروبندو مارگ، نئی دہلی

یہ المیہ ہی مانا جائے گا کہ ہمارے شعرا و ادبا اور دیگر فنکاروں کو اپنی ناقدری کے احساس کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونا پڑا ہے۔ فیض احمد فیض (1984-1911) جیسے چند ہی خوش قسمت ہیں جن کو اس بات کا اطمینان تھا کہ ان کی قوم نے ان کو خوب نوازا۔ ورنہ قوم و ملت کا مزاج یہی رہا ہے کہ جیتے جی کسی باکمال کی عزت افزائی نہ کی جائے۔ اسی لیے مولانا ابوالحسن علی ندوی (1999-1914) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "یہ ملت مردہ پرستی میں بدنامی کی حد تک مشہور ہے"۔ لیکن یہ خوش آئند ہے کہ اب یہ مزاج بدل رہا ہے۔ شاگردانِ شارب ردولوی (2023-1932) نے حال ہی میں بڑے ہی تزک و

احتشام کے ساتھ لکھنؤ میں جشنِ شارب کا انعقاد کیا اور ان کے عقیدت مندوں نے ان کے فکروفن پر کتابیں شائع کرائیں۔ پروفیسر محمد کاظم کی مرتبہ زیرِ تبصرہ کتاب ''نعیم انیس۔ شخصی انفراد اور ادبی اختصاص'' کو دیکھ کر اس احساس کو تقویت مل رہی ہے۔ انٹرنیٹ انقلاب کی بدولت اساتذہ کی پہنچ کا دائرہ دور دراز تک پھیلنے سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا تو 'آوٹ لُک' اور 'انڈیا ٹوڈے' جیسے رجحان ساز (Trend Setter) سمجھے جانے والے جریدوں کو بھی ''وکاس دیو کرتی، اودھ اوجھا، خان سر اور الکھ پانڈے'' نامی اساتذہ کو اپنے سرورق اور کور اسٹوری (14 نومبر 2022) میں جگہ دینی پڑی۔ اس طرح کے واقعات بتا رہے ہیں کہ سماج بدل رہا ہے اور سماج میں اساتذہ اور فنکاروں کی بھی عزت بڑھ رہی ہے جو یقیناً باعث مسرت ہے۔ ڈاکٹر نعیم انیس (پ: 1968) کے حساس، بیدار ذہن اور سعادت مند شاگردوں نے اپنے مشفق اور قابل استاد کی خدمت کا اعتراف کر کے اسے منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے تو یقیناً یہ ایک فالِ نیک ہے۔ ان کے اس عمل سے دیگر قابل اساتذہ کو بھی مزید اچھا کرنے اور ان کے شاگردوں کو ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کی ترغیب ملے گی۔ اس طرح جب مغرب کے مثل ہی ہمارے یہاں بھی اساتذہ کو سب سے اونچا مقام ملنے لگے گا تو یقیناً ہم ایک بار پھر 'وشو گرو' بننے کی پوزیشن میں آ جائیں گے کہ استاد ہی قوم کا معمار ہوتا ہے اور معمار جتنا قابل اور خود اعتمادی سے بھرا ہوا ہوگا، اسی قدر وہ مزید بہتر انداز میں قوم کی تعمیر کرنے کی فکر کرے گا۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'نعیم انیس۔ شخصی انفراد اور ادبی اختصاص' سات حصوں میں منقسم ہے اور اپنی شہ سرخی کو پوری طرح سے جواز عطا کر رہی ہے یعنی اس میں نعیم انیس کے ذاتی خصائل وخصوصیات اور ادبی وفنی کمالات کو پورے طور پر سمیٹ لیا گیا ہے۔ پہلے حصے کی سرخی ہے 'رنگِ عکس'۔ اس حصے میں پروفیسر ابنِ کنول، پروفیسر محمد منصور عالم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر زین رامش، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، عبدالسلام عاصم اور ڈاکٹر معید رشیدی جیسے 22 مشاہیرِ ادب وصحافت نے نعیم انیس کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا حصہ ہے 'روبرو'، جو جاوید دانش (کناڈا)، اشرف علی بستوی (ایشیا ٹائمز، نئی دہلی) اور ڈاکٹر نزہت زہرا (کولکاتہ) کے ذریعے لیے گئے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ 'رشتوں کے رنگ' کے عنوان سے تیسرے حصے میں نعیم انیس کے رشتے داروں، شاگردوں اور عزیزوں کے لکھے 21 تاثراتی مضامین ان کی خانگی اور تدریسی زندگی کے مخفی گوشوں کو اجاگر کر رہے ہیں۔ نعیم انیس نے اپنی زندگی کا ایک مختصر مگر اہم حصہ مرشدآباد میں گزارا تھا۔ یہیں سے ان کی تدریسی زندگی کی شروعات ہوئی تھی مگر کلکتہ گرلس کالج میں مستقل ملازمت ہونے کے بعد انھیں مرشدآباد کو خیرآباد کہنا پڑا۔ ضابطے کے تحت تو ان کا تعلق مرشدآباد سے ختم ہو گیا تھا لیکن دل کا رشتہ کبھی ختم نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ مرشدآباد نے اب تک انھیں دل سے لگائے رکھا ہے اور ان کی ہر چھوٹی بڑی کامیابی پر وہ جھوم اٹھتے ہیں۔ اس کتاب کا چوتھا حصہ 'مرشدآباد اور نعیم انیس' ان کے اسی رشتے کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ اصغر انیس، وثیق الارشاد علی القادری، اطہر مرشدآبادی، ڈاکٹر عرشیہ اقبال، سید وقار عباس علی مرزا، ڈاکٹر سید محمد فیصل علی خان اور سید آصف عباس میرزا کے قلم سے نکلے سات مضامین میں نعیم انیس کے اس تعلق کو مختلف حوالوں سے یاد کیا گیا ہے۔ 'رنگِ نثر' کے عنوان سے کتاب کے پانچویں حصے میں ڈاکٹر مشتاق اعظمی، ڈاکٹر دبیر احمد، ڈاکٹر زرینہ بیگم، حلیم صابر، ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر ابراہیم افسر جیسے 21 تجزیہ نگاروں نے نعیم انیس کی 27 تحقیقی وتنقیدی تصنیفات، تالیفات اور ترتیبات میں سے بیشتر کو فن کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ چھٹا حصہ 'رنگِ شاعری' کے نام سے ہے۔ اس میں نعیم انیس کی نثری نظموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد افتخار شفیع (سرگودھا، پاکستان)، اختر جاوید، شاہ نواز قریشی، ڈاکٹر محمد شمشیر عالم (احساس سے لبریز نعیم انیس کی نثری نظمیں)، ڈاکٹر مجیب شہزر، ایم نصراللہ نصر اور ڈاکٹر محمد شاہد (نعیم انیس کی نثری نظمیں: موضوع اور اسلوب) جیسے فنکاروں نے ان کی نظم نگاری کی خصوصیات کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ آخری حصہ 'رنگِ محبت' ہے۔ اس میں رونق نعیم، عامر قدوائی (کویت)، ضمیر یوسف، ڈاکٹر زرینہ بیگم، ارشاد آرزو، نسیم فائق، شیراز حسین شیراز جیسے معتبر شعرا نے نعیم انیس کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عقیل احمد عقیل نے ان ساتوں حصوں کی شروعات کے لیے موضوع کی مناسبت سے ایک ایک قطعہ لکھ کر کتاب میں ایک طرح کی انفرادیت لا دی ہے۔ ڈاکٹر زرینہ بیگم کے درج ذیل دو شعر نعیم انیس کی شخصیت پر پوری طور پر صادق آتے ہیں:

اردو کے میزبان ہیں یہ ڈاکٹر نعیم ۔۔۔ علم و ہنر خلوص سے پیہم عمل پذیر
ہر فن کے ترجمان ہیں یہ ڈاکٹر نعیم ۔۔۔ یادوں کے جگنو ہوں کہ تحقیق فن کوئی

ڈاکٹر نعیم انیس کی متنوع خدمات کی وجہ سے ان کے محبین انھیں ہشت پہلو فن کار کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے قاری کی یہ محبتیں نعیم انیس کی ذمے داریوں کو مزید بڑھا رہی ہیں۔ کتاب کے مرتب پروفیسر محمد کاظم نے اپنے مبسوط مقدمے میں لکھا ہے کہ ''انھوں نے جب 1997 میں بحیثیت استاد، کلکتہ گرلس کالج جوائن کیا تو ان کی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مستقل ملازمت کے بعد کچھ لوگ 'شرگرمی' میں مشغول ہو جاتے ہیں تو نعیم انیس جیسے لوگ اپنی سرگرمی کا دائرہ وسیع کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں''۔ (ص 27)۔ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر نعیم انیس نے کلکتہ گرلس کالج سے منسلک ہونے کے بعد اپنی سرگرمیوں کی بدولت کلکتہ کی ادبی فضا کو اپنی تگ ودو سے مزید معطر ضرور کیا لیکن ذاتی طور پر انھوں نے اپنا نقصان بھی کیا۔ کیوں کہ اگر وہ کسی مرکزی ادارے سے وابستہ ہوتے تو خود بھی مزید ترقی کرتے اور اپنی روشنی ہندوستان بھر میں تقسیم کرنے کی پوزیشن میں ہوتے۔ بیک کور پیج پر شائع خواجہ اکرام الدین صاحب نے ڈاکٹر نعیم انیس کی ہمہ جہت خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''۔۔۔ اسی لیے میری نظروں میں ایسے اساتذہ کی زیادہ عزت ہے جو محض نوکری نہیں کرتے بلکہ ادب کی خدمت کرتے ہیں۔''

کتاب کی ترتیب فنی تقاضوں کے عین مطابق ہے اور طباعت بھی اچھی ہے۔ ساتھ ہی قیمت بھی مناسب ہے۔ (624 صفحات پر مشتمل کتاب کی قیمت محض 600 روپے)۔ کتاب کے آخر میں جملہ 85 قلمکاروں کے مختصر تعارف سے نعیم انیس کے حلقۂ یاراں کی وسعت وعلمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کاوش کے لیے شاگردانِ نعیم انیس، بطورِ خاص شاہد اقبال اور شیخ پرویز قابلِ مبارکباد ہیں۔

ڈاکٹر شکیب انصاری : حیات اور ادبی خدمات

مرتب: ڈاکٹر غضنفر اقبال
صفحات: 184، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2024
ناشر: اپلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی
مبصر: فرحانہ نازنین
اوکھلا وہار، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

'ڈاکٹر شکیب انصاری حیات اور ادبی خدمات' ڈاکٹر غضنفر اقبال کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ ایک ایسے شخص کے کام اور افسانے کو ڈھونڈ کر منظم، منتخب اور پھر مرتب کرنا

جو کہ گمنام بھی ہو کافی صبر آزما اور مشکل عمل ہے مگر ڈاکٹر غضنفر اقبال نے یہ کام بخوبی کر دکھایا ہے۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال کی مرتب کردہ کتاب 'ڈاکٹر شکیب انصاری حیات اور ادبی خدمات' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ 'فن شکیب' کے نام سے منسوب ہے۔ جس میں شکیب انصاری کے افسانے اور ان کی تحاریر اور تخلیقات شامل ہیں اس حصے میں شکیب انصاری کے لگ بھگ چھ یا سات افسانے شامل ہیں یہ سارے افسانے بے حد خوبصورت اور دلچسپ انداز بیان کے حامل ہیں جو شروع سے لے کر آخر تک اپنے قاری کو اپنے حصار میں قید رکھتے ہیں۔ شکیب انصاری کے افسانے کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ شروع سے لے کر آخر تک قاری کے تجسس اور دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے افسانے کے بعد شکیب انصاری کے کچھ مضامین تبصرے اور تجزیے شامل کتاب ہیں۔ یہ مضامین تجزیے و تبصرے بھی فنکار کی مہارت کی منہ بولتی تصویر پیش کرتے ہیں۔ شکیب انصاری ایک ایماندار قلم کار تھے انھوں نے جو بھی تجزیہ یا تبصرہ کسی بھی قلم کار کی تخلیقات پر کیا وہ پوری ایمانداری اور دیانتداری سے کیا اس کتاب میں حمید سہروردی کے 'ریت ریت لفظ' پر ان کا مفصل تبصرہ شامل ہے اس مضمون میں وہ کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں'' حمید سہروردی نے اپنی کاوش کی ترتیب کو دیدہ زیب بنایا ہے اسے چھونے اور پکڑنے کے لیے ہاتھ بے اختیار اس کی طرف بڑھ جاتے ہیں سرورق پر جو کچھ ہے وہ خلیل جبران کی یاد کو تازہ کرتا ہے جو تجریدی آرٹ کا نہایت ہی واضح اور زیادہ جانا پہچانا جانے والا شخص تھا اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ وہ اپنے اظہار خیال یعنی آرٹ کی وضاحت پر پوری قدرت رکھتا تھا۔''

اس اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شکیب انصاری اپنے فن کے ماہر ہونے کے ساتھ ہی غیر جانبدارانہ تجزیہ اور تبصرہ کرنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال تھے غضنفر اقبال کا یہ کارنامہ اردو ادب میں مدتوں یاد رکھے جانے کے قابل ہے کہ انھوں نے ایک انمول موتی کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر ہمیشہ کے لیے اردو ادب میں محفوظ کر دیا ہے۔

شکیب انصاری پیشے سے تو ایک بی۔ یو۔ ایم۔ ایس ڈاکٹر تھے مگر اردو ادب سے ان کی والہانہ محبت اور عشق نے انھیں ایک مصنف بنا ڈالا غضنفر اقبال نے ان کی شخصیت پہ کتاب مرتب کر کے ان کی ادبی زندگی کو اردو ادب کو جاودانی بخش دی ہے اس کتاب میں دوسرا حصہ 'شکیب یاد' ہے جو شکیب صاحب کی یاد میں لکھے گئے مختلف مصنفین و ادیبوں کے مضامین پر مشتمل ہے جس کو پڑھ کر شکیب انصاری کی شخصیت اور ان کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اس حصے میں سید مجیب الرحمٰن، پروفیسر حمید سہروردی، منظور وقار، سید ابراہیم مامون، پروفیسر محمد عبدالحمید اکبر، جیسے کئی فعال مصنفین کے مختلف عنوانات پر مشتمل مضامین شامل ہیں جن میں شکیب انصاری کی حیات اور ادبی کارناموں پر مختصر ایک جائزہ پیش کیا گیا ہے منظور وقار صاحب اپنے مضمون میں شکیب انصاری کا تعارف کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

'' شکیب صاحب ان قلم کاروں میں سے تھے جو لکھنے کے بعد چھپنے کے بجائے چھپنے پر یقین رکھتے تھے غالباً چند ناقدین اردو کی طرح شکیب صاحب کا بھی یہ خیال ہوگا کہ یہ چھپنے والے قلم کار ادب کو کمیاب اور نایاب بنا دیتے ہیں'' جب کہ میر شاہ نواز شاہین شکیب انصاری کے فن افسانہ نگاری کے متعلق یوں گویا ہے:

'' شکیب انصاری کے افسانے وسیع مطالعہ، باریک بینی، تجربہ و اکتساب اور مشاہدے کی غمازی کرتے ہیں ان کے بیانیہ افسانوں میں جزئیات نگاری کا غالب عنصر پایا جاتا ہے جس سے افسانہ طوالت کا شکار ہوتا ہے مگر ان کا یہی اسلوب انھیں دوسروں سے ممیز کرتا ہے ان کے افسانوں کے کردار سماجی شعور انسانی فطری تقاضوں اور نفسیاتی محرکات کا آئینہ دار ہے ان کی تنقیدی بصیرت ان کی تخلیقات اور مضامین میں نمایاں ہے۔''

عمدہ بیش قیمت، لاجواب اور معیاری کتاب کو مرتب کرنے پر غضنفر اقبال بلاشبہ قابل ستائش، تعریف و توصیف کے مستحق ہیں۔ انھوں نے جس محبت، محنت اور عقیدت سے اس کتاب کی ترتیب و تدوین کی ہے۔

تذکرہ و سوانح

فضل حق آزاد

نام مصنف: پروفیسر محمد حامد علی خاں

صفحات: 112

ناشر: اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

مبصر: عبدالرحمٰن، سینٹ اسٹیفینز کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر نظر کتاب 'فضل حق آزاد' ایک مونوگراف ہے جسے 'اردو ڈائریکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ' حکومت بہار نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب دبستان بہار کی سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات کو محفوظ رکھنے اور نئی نسل کو ان سے متعارف کرانے کی غرض سے تصنیف کی گئی ہے۔ فضل حق آزاد (1854-1942) عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے معاصرین میں سرسید احمد خان، خواجہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، اکبر الہ آبادی، علامہ محمد اقبال، صفیر بلگرامی، عبدالغفور شہباز اور شاد عظیم آبادی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

مصنف کتاب پروفیسر محمد حامد علی خاں نے اس کتاب میں 'فضل حق آزاد' کی ادبی خدمات سے متعارف کرانے کے لیے گیارہ مختصر مضامین، ایک ضمیمہ اور انتخاب کلام کو شامل کیا ہے۔ پیش لفظ کے بعد پہلا عنوان 'فضل حق آزاد: ایک نظر میں' ہے۔ یہ مضمون دو صفحات پر مبنی مختصر تعارف (سیرہ ذاتیہ) ہے۔ جس میں نام، تخلص، قلمی نام، ولادت، وفات، وطن، تعلیم، رفاقت، شادی، اہلیہ، اولاد، ملازمت، تخلیقی سفر، شرف تلمذ، اعزاز، تخلیقات، صحافت اور دعوی جیسے معلومات کو جمع کیا گیا ہے۔ اس کے بعد 'فضل حق آزاد مہد سے لحد تک' دس صفحات پر مشتمل مضمون ہے۔ اس میں فضل حق آزاد کی زندگی اور ادبی خدمات کا بیان قدرے تفصیلی ہے۔

'آزاد کی غزل گوئی' عنوان کے تحت ان کی غزلیہ شاعری پر بحث کرتے ہوئے غزلیہ شاعری کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کا رنگ حسب حال بدلتا رہا ہے۔ پہلے دور میں عیش کوشی، لذت، لگاوٹ اور بناوٹ کا رنگ غالب ہے۔ جب کہ دوسرے میں قومی، اخلاقی، سیاسی اور اصلاحی خیالات کا رجحان ملتا ہے۔ تیسرے میں غالب کی فکر، آتش کا تصوف اور مومن کی معاملہ بندی نظر آتی ہے۔

'آزاد بحیثیت نظم نگار' عنوان کے تحت نظم کی مختصر تاریخ کے بعد 'آزاد' کی نظم نگاری کے حوالے سے بحث کی گئی ہے: مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'فضل حق آزاد' سرسید تحریک اور دبستان حالی و شبلی کے زیر اثر 'نظم نگاری' کی طرف مائل ہوئے۔ انھیں زبان و بیان، فن و تکنیک، تراکیب الفاظ، تشبیہات و استعارات اور ضرب الامثال کے استعمال پر قدرت حاصل تھی؛ اس لیے انھوں نے موضوعاتی نظموں کو نت نئی وسعت بھی عطا کی ہے۔

'آزاد کی قصیدہ نگاری، آزاد کی مثنوی نگاری، آزاد کی غنائی شاعری، آزاد کی رباعی نگاری، آزاد کی صحافت، آزاد کا شعور نقد اور آزاد کی نثر نگاری اس کتاب میں شامل دیگر مضامین ہیں۔ نصف کتاب کے بعد ضمیمے اور انتخاب کلام کا حصہ شروع ہوتا ہے، ضمیمے میں فضل حق آزاد کی عدم مقبولیت پر مختصر گفتگو کی گئی ہے اور یہ پیش کیا گیا

ہے کہ 'آزاد' اپنے ہم عصروں میں ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ لیکن کلام کے منظر عام پر نہ آنے کی وجہ سے انھیں وہ شہرت نہ ملی جو 'شاد عظیم آبادی' کو حاصل ہوئی۔ ضمیے کے بعد 'انتخاب کلام' کا حصہ شروع ہوتا ہے، جس میں غزل، نظم، مراثی ور باعیات وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر یہاں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں۔

عطائے حضرت پیر مغاں ہے جھک کے لے ساقی
تامل میں یہاں الزام پہ الزام آئے گا
نظر آتا تو ہے دریائے عرفاں خوب ہی دل کش
سمجھ کا دائرہ لیکن بہت محدود ہوتا ہے
یہ بستی اب بھی بازار ختن ہے باکمالوں سے
غزال آنکھیں چراتے ہیں عظیم آباد والوں سے
تمھیں آزاد ہو بس پہلوان شاعری باقی
نہ رستم آئے گا ہرگز نہ زال وشام آئے گا

(فضل حق آزاد)

چونکہ مونوگراف یا فردنامہ سوانح سے مختصر ہوتا ہے اس لے مصنف کے سامنے ایک بندش ہوتی ہے کہ وہ زیر غور شخصیت کے انھیں واقعات وخدمات کو شامل کرے جو شخصیت کو ابھارنے میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہوں۔ ممکن ہے کہ مصنف کتاب نے انھیں ساری بندشوں کے مدنظر اختصار سے کام لیا ہو۔ حالانکہ کچھ باتوں کی تکرار کو ختم کرنے سے عناوین پر سیر حاصل بحث کی جا سکتی تھی۔ ضمیے میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ باتیں 'آزاد مہد سے لحد تک' میں ایک مرتبہ ذکر کی جا چکی ہیں۔ اس لیے ضمیے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ مضامین میں مصنف کی ذاتی رائے کا اظہار کم ہے۔ ایک دو مضامین کے علاوہ زیادہ تر مضامین مزید تفصیل طلب ہیں۔ 'آزاد کی نثر نگاری' عنوان کے تحت ان کے تین خط کو نقل کر دیا گیا ہے، اگر ان خطوط کے حوالے سے کچھ تحقیقی اور تنقیدی گفتگو کی جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

بہر حال اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے باب میں 'اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومت بہار' کا یہ اقدام نہایت خوش آئند ہے؛ کہ انھوں نے 'بہار کی سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی خدمات کو محفوظ رکھنے اور نئی نسل کو ان سے متعارف کرانے کی غرض سے فردناموں کی تصنیفات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔' زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب 'فضل حق آزاد کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کی تفہیم میں' ایک نیا باب ثابت ہوگی اور قارئین میں پذیرائی حاصل کرے گی۔

اردو کے دو سفیر: خالد اور نذیر

مصنف: سید ساجد علی ٹونکی

صفحات: 128، قیمت: 150، سال اشاعت: 2023

ناشر: علی پبلی کیشنز، ٹونک، راجستھان

مبصر: ڈاکٹر جہاں گیر حسن، شاہ صفی اکیڈمی، سید سراواں، کوشامبی (یوپی)

شہر 'ٹونک'، راجستھان کا مشہور ومعروف خطہ ہے اور اپنے اندر مختلف ومتنوع تاریخ وتمدن کی نیرنگیاں سموئے ہوئے ہے۔ سید ساجد علی ٹونکی کا تعلق اسی علمی وادبی اور تاریخی شہر 'ٹونک' سے ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اسی مرد قدر شناس کے جوہر تحقیق وتفتیش کا نتیجہ ہے۔ اس میں عہد حاضر کے دو مایہ ناز ادیب ڈاکٹر نذیر فتح پوری اور پروفیسر خالد محمود کی علمی وتحقیقی کاوشیں اور ادبی خدمات کا دلکش خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب، ترتیب وفہرست مضامین، مقدمہ اور دو تاثراتی تحریروں (خشت اول، خشت دوم) کے علاوہ دیگر 9 مضامین اور ایک گوشہ تصاویر پر مشتمل ہے۔ ان میں سے چار مضامین ڈاکٹر نذیر فتحپوری سے متعلق ہیں، چار مضامین پروفیسر خالد محمود سے متعلق ہیں اور ایک مضمون مولف موصوف سے متعلق ہے۔

مقدمہ انتہائی پر مغز اور علمی ہے اور ہر دو شخصیات سے متعلق کافی وشافی معلومات فراہم کرتا ہے کہ خالد محمود اور نذیر فتح پوری سے مؤلف کس طرح متعارف ہوئے، ان کا بیک گراؤنڈ کیا ہے اور ان کے مابین کس قدر مماثلتیں اور کس قدر تضادات ہیں، ان باتوں کو بڑے سلیقے سے نمایاں کیا گیا ہے، مثلاً: 22 مماثلتیں شمار کرانے کے بعد تضادات سے متعلق مؤلف لکھتے ہیں: اوّلین تضاد تو یہی ہے کہ خالد محمود اکیڈمک لحاظ سے ایک امتیازی پوزیشن کے حامل ہیں جب کہ نذیر فتح پوری کا اکیڈمک سلسلہ پانچویں کلاس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پیشے کے اعتبار سے خالد محمود سرکاری ملازم ہوئے، پروفیسر کے منصب تک پہنچے اور آسودہ حال زندگی بسر کی۔ اس کے برعکس نذیر فتح پوری راج مستری کا پیشہ اختیار کیا اور ایک مزدور کی زندگی بسر کی۔ خالد محمود نے بھوپال کا علمی وادبی ماحول پایا لیکن اس کے برخلاف نذیر فتح پوری پونے میں جھگی جھونپڑی میں رہے اور ہمیشہ ناموافق حالات کا سامنا کیا وغیرہ۔ گویا جن خدمات کو پروفیسر خالد محمود نے تمام تر سہولیات کے سائے میں انجام دیں انھیں خدمات کو نذیر فتح پوری نے ناموافق اور سخت حالات میں انجام دیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو علمی وادبی میدان میں جس کمال ہنرمندی اور جانفشانی کا مظاہرہ نذیر فتح پوری نے کیا وہ قابل صد رشک ہی نہیں بلکہ آج کے عہد میں نوجوان اردو نسل کے لیے بڑا ہی حوصلہ بخش اور محرک ہے۔

'پیش لفظ (خشت اول)' ڈاکٹر حسن آرا کی ایک تاثراتی تحریر ہے جس میں شہر ٹونک پر سرسری نظر ڈالنے کے ساتھ کتاب میں شامل مضامین کا فرداً فرداً جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز مؤلف موصوف کے نظریۂ 'واقعی نذیر فتح پوری اور خالد محمود اُردو کے سفیر ہیں' سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے ان کی اردو خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ڈاکٹر ارشد عبدالحمید نے اپنی تحریر 'خشت دوم' میں نذیر وخالد کے ساتھ خود سید ساجد علی ٹونکی کو بھی 'اُردو سفرا' کے زمرے میں شامل کیا ہے جس کا اظہار ان کے اس ایک جملے 'دو نہیں، تین سفیر (ساجد، خالد اور نذیر)' سے ہوتا ہے۔

'فتح پور شیخاوٹی' کا مختصر تعارف' ایک محقق ومعتمد تحریر ہے۔ اس کے بموجب علمی وادبی، تہذیبی وتمدنی اور تاریخی وسیاسی امتیازات کی بنیاد پر فتح پور نام سے تین شہر مشہور ہیں: ایک فتح پور، یہ الہ آباد اور کان پور شاہراہ پر واقع ہے۔ اس شہر کا نام شمس الدین ابراہیم شاہ نے 1430 میں تجویز کیا تھا۔ دوسرا فتح پور سیکری، یہ آگرہ سے قریب واقع ہے۔ اس شہر کو مغل شہنشاہ اکبر نے 1573 میں بسایا تھا۔ تیسرا فتح پور، ضلع سیکر راجستھان میں واقع ہے اور فتح پور شیخاوٹی سے متعارف ومشہور ہے۔

'سرونج کا مختصر تعارف' یہ بھی ایک محقق ومعتبر تحریر ہے۔ اس کے بموجب خالد محمود کی پیدائش اور تعلیم وتربیت سرونج میں ہوئی۔ اعلی تعلیم بھوپال سے حاصل کی۔ پھر اسکول وکالج ہوتے ہوئے سینٹرل یونیورسٹی جامعہ ملیہ تک پہنچے۔ سرونج قدیم زمانے میں راجپوتانہ مسلم ریاست 'ٹونک' مدھیہ پردیش کا خاص حصہ رہا ہے اور جغرافیائی لحاظ سے مالوہ کے ماتحت۔ مالوہ اپنے قدرتی وسائل کے باعث ملکی اور غیر ملکی حکمرانوں کے لیے ہمیشہ قابل توجہ رہا اور اس علاقے میں برابر جنگیں ہوتی رہیں۔

’ڈاکٹر نذیر فتح پوری کا شیخاوٹی سے پونہ تک کا سفر‘ اس مضمون میں اولاً بطور اِختصار شیخاوٹی اور قرب وجوار کے احوال قدیمہ کا جائزہ لیا گیا ہے کہ تعلیم ومعاش کے لحاظ سے یہ کافی پسماندہ تھا۔ بیرون ممالک جانے کے باعث یہاں کی اقتصادی حالتیں معمول پر آئیں، لوگوں میں تعلیم وتعلم سے متعلق بیداری آئی اور یوں شیخاوٹی تعلیمی مراکز میں شامل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی نذیر صاحب سے ملاقات کا ذکر اور ان کے اوراق حیات کے راز سربستہ وا کیے گئے ہیں جو قابل رشک بھی ہیں اور قابل عبرت بھی۔

’’ڈاکٹر نذیر فتح پوری ’شاعرہ مصورہ پروین شیر‘ کے آئینے میں‘ یہ تبصراتی تحریر نذیر فتح پوری کی کتاب ’شاعرہ مصورہ پروین شیر‘ کی مدد سے وجود میں آئی ہے۔ اس تحریر کے بموجب: پروین شیر پٹنہ کی رہنے والی ہیں۔ گھرانہ، علمی وادبی ہے۔ ہندوپاک اور یورپی ممالک کے مجلات ورسائل کی مقبول قلمکار ہیں۔ کرچیاں، نہال دل پر شہاب جیسے، یہ چند سیپیاں سمندر سے‘، ’بیکرانیاں‘ وغیرہ مصوری وشاعری اور تخلیقی سفرناموں کا شاہکار نمونہ ہیں۔ مختلف اعزازات سے مشرف ہوچکی ہیں۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند، گوپی چند نارنگ اور پروفیسر عتیق اللہ جیسے افراد کے نزدیک بھی معتبر ومسلم ہیں۔ گویا اس تحریر سے جہاں پروین شیر کی علمی وادبی خدمات پر روشنی پڑتی ہے وہیں نذیر صاحب کی علمی جولانیت اور تحقیقی رنگ وآہنگ کا احساس ہوتا ہے۔

’پروفیسر خالد محمود کا سرونج سے دہلی تک کا سفر‘ ایک معلوماتی تحریر ہے۔ اس میں سرونج کے سیاسی وسماجی اور علمی وادبی پوزیشن کے ساتھ خالد محمود کے اَوراق حیات مثلاً، تعلیم وتعلم، ملازمت وروزگار، اور منظوماتی ومنثوراتی خدمات جیسے: تصانیف وتالیفات، سفرناموں، دیباچوں، تقاریظ، انعامات واعزازات، سفرنامے، مقدمہ نویسی کو بالتفصیل موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی شخصیت اور علمی وادبی خدمات پر مشتمل کتب ورسائل اور اخبارات ومضامین کی تفصیل گوشوارے کی شکل میں دی گئی ہے۔ نیز مختلف اداروں کی رکنیت اور ان کے لیے نصابی ترتیب وتدوین پر فوکس کرنے کے ساتھ اُن کانفرنسوں وسیمناروں کا ذکر کیا گیا ہے جن میں خالد محمود نے بطور شرکا/ بطور مہمان خصوصی اور بحیثیت صدر شریک ہوئے۔ بلاشبہ اس مضمون کو خالد محمود شناسی میں سنگ میل کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔

’پروفیسر خالد محمود ’’نقوش معنی‘ کے آئینے میں‘ اس مضمون کے ذریعے جو معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں وہ یہ ہیں: ’نقوش معنی‘ (2020) خالد محمود کی 27 ویں تصنیف ہے۔ اِن میں زیادہ تر نگارشات خالد محمود کے یادگاری خطبات ہیں جو انھوں نے ’دارالمصنفین‘، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور وغیرہ اداروں میں پیش کیے ہیں۔

’سید ساجد علی ٹونکی ایک تعارف‘ یہ، آخری تحریر ہے جس کے محرر مختار ٹونکی ہیں۔ بقول مختار: راجندر سنگھ بیدی، شمس الرحمٰن فاروقی، دیپک بدکی وغیرہ کے طرز پر ساجد ٹونکی نے اپنی پروقار شخصیت کا سکہ پہلے پہل اقتصادیات اور بینک کاری کے شعبے میں بٹھایا اور پھر ادبی افق پر چندے آفتاب چندے ماہتاب بن کر چمکا کیے۔ ’ہندوستانی اقتصادی مسائل‘ (فروری: 1990)، ’قومی بچت اور ڈاک خانے‘ (مئی: 1992)، ’بینک، بیاج اور بیج‘ (جولائی: 1993) وغیرہ اقتصادیات وبینکنگ کے موضوعات پر شاہکار ہیں۔ ’تدریسی مسائل‘ (1993)، ’جدید تعلیم اور ہمارے مدارس‘ (1996) وغیرہ اُن کی تدریسی بالیدگی اور کثیر جہت شخصیت کا ثبوت ہیں۔ ’کاخ غریباں‘ طنزیات ومضحکات کے فن پر اخلاقی کہانیوں کا حسین گلدستہ ہے۔ ’مولانا سید زبیر علی: شخصیت وخدمات (1999) اور مولانا سید قاسم علی افریقی: شخصیت وخدمات (2001) شخصیت وسوانح کے فن پر قابل صد ستائش تصانیف ہیں۔ ’جنوبی افریقہ‘ (2001) اور ’جانب حرم‘ (2005) سفرنامے کے موضوع پر قابل مطالعہ ہیں۔ ’ٹونک میں اردو کا فروغ‘ (2013) شعر وادب کا عہد بہ عہد تاریخی وتجزیاتی دستاویز ہے، ’قوس وقزح‘ (2019) خالص تحقیقی وتنقیدی ہے اور ’قلم گوید‘ (2021) چند علمی وادبی عظیم الشان شخصیات کی حیات وخدمات کا دلکش مجموعہ ہے اور یہ تینوں کتابیں ادبی لحاظ سے عدیم المثال اور فقید المثال کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اخیر میں تصاویر کا ایک گوشہ ہے جس میں ڈاکٹر نذیر فتح پوری، پروفیسر خالد محمود اور صاحب کتاب کے احوال تصاویر کی زبانی درشائے گئے ہیں۔

بیتاب صدیقی

مصنف: ڈاکٹر نسیم اختر

صفحات: 128

ناشر: اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سیکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ
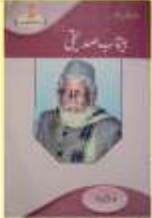
مبصر: سید اظہار، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، نارتھ کیمپس، نئی دہلی

مولانا عبدالحی بیتاب صدیقی اردو تحریک اور اردو زبان وادب کا ایک مشہور ومعروف اور مستند چہرہ رہے ہیں۔ بیتاب صدیقی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہ یک وقت ایک سرگرم مجاہد آزادی، دور اندیش اور باریک بیں سیاست دان، بے لوث خادم ملت وقوم، شاندار منتظم، کامیاب مدرس، شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ آٹھ دس سال کی عمر ہی سے شعر گوئی کی ابتدا کردی تھی۔ مضطر کے وسیع حلقۂ شاگردی میں داخل ہوگئے۔ کثرت سے اشعار کہا کرتے تھے۔ بیتاب تخلص اختیار کیا۔ لوگ انھیں نام سے زیادہ تخلص سے پہچانتے ہیں۔ ان کا کلام یا بیاض محفوظ نہیں؛ کیونکہ کچھ تو سیلاب کی نذر ہوگیا تھا اور کچھ گھر میں ہوئی چوریوں کی۔ ان کی غزلوں نظموں اور رباعی وغیرہ کے کچھ نمونے ملے ہیں۔ 1960 کے بعد سے شعر گوئی ترک کرکے اردو تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ اردو تحریک میں ان کی حیثیت اساسی تھی اور کردار قائدانہ۔ اس تحریک کے زیر اثر انھوں نے غلام سرور، شاہ مشتاق وغیرہ کے ساتھ مل کر اردو زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ 1951 میں 'بہار ریاستی انجمن ترقی اردو' کے قیام میں اہم رول ادا کیا۔ بیتاب نے صحافتی اور ادبی میدانوں میں بھی جھنڈے گاڑے۔ چنانچہ پٹنہ سے جاری ہونے والے ہفتہ وار ’مومن دنیا‘ (1947) اور ہفتہ وار ’طوفان‘ (1950) کی ادارتی خدمت انجام دی۔ 1953 میں غلام سرور کے ہفتہ وار ’سنگم‘ پٹنہ کے اجرا میں شرکت کے ساتھ ساتھ تا عمر غیر اعلانیہ ایڈیٹر رہے۔ اس دوران انھوں نے بیش قیمتی اداریے، خبریں، بیانات، اعلانات وغیرہ تحریر کیے۔ بیتاب کا شمار بہار کے صفِ اول کے ادبا میں ہوتا، اگر انھوں نے اپنی شاعری کی طرح انشا پردازی کا بھی گلا نہ گھونٹا ہوتا۔ انھوں نے موضوعات کی مناسبت سے سادہ اور عام فہم اسلوب بیان اختیار کیا۔ بیتاب کی ادبی خدمات کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے: انھوں نے الگ الگ موضوعات پر چشم کشا مضامین، اداریے اور ’معمار قوم شاہ محمد زبیر‘ جیسی ضخیم تصنیف ادبی دنیا کو تحفے میں دی۔ اس کے علاوہ ابتدائی درجات کے بچوں کی ذہنی سطح کا خیال کرتے ہوئے درسیات پر بھی انتہائی وقیع ادبی کام انجام دیا۔ بیتاب صدیقی مجاہد آزادی بھی تھے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے انھوں نے جہادِ آزادی کا بگل بجا دیا تھا۔ مدرسہ عزیزیہ میں داخلے کے ساتھ ہی وہ خلافت تحریک کی حمایت اور لیگ کی مخالفت میں کود پڑے تھے۔ اسی سلسلے کو جاری رکھنے کی وجہ سے قید بہ سلاسل بھی ہونا پڑا۔ 1942 عیسوی کے بھارت چھوڑو آندولن میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بہادری کا عالم یہ تھا کہ ایک انگریز فوجی کی طرف سے ان کے سر پر بندوق رکھے جانے کے باوجود پٹنہ میں سرنگ کھودنے میں مصروف رہے۔ جواہر لعل نہرو،

ابوالکلام آزاد، شاہ محمد زبیر وغیرہ قائدین ومجاہدینِ آزادی کے ساتھ قریبی مراسم رہے۔

زیرِ نظر کتاب 'بیتاب صدیقی: مولانا عبدالحی بیتاب صدیقی کی مختصر سوانح حیات اوران کی ادبی، صحافتی، سیاسی اور مجاہدانہ خدمات پر مشتمل کاوش ہے۔ کتاب کو ڈاکٹر نسیم اختر نے 2020 عیسوی میں 'اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ، کے ڈائرکٹر جناب احمد محمود کی فرمائش پر تالیف کیا ہے۔ ڈائریکٹر احمد محمود نے مختصر مقدمہ تحریر کیا ہے، جس میں انھوں نے بہار کی سرکردہ ادبی شخصیات کا ذکر کرتے ہوئے، اردو ڈائریکٹوریٹ کی طرف سے مجوزہ ادبی شخصیات پر فردناموں کی اشاعت کے سلسلے کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر نسیم اختر نے 'ابتدائیہ' کے عنوان کے تحت بیتاب کے کارناموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کتاب کی وجہِ تالیف کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ پھر مشمولات پر روشنی ڈالتے ہوئے کتاب کی تالیف کے سلسلے میں جن لوگوں نے معاونت اور مشوروں سے نوازا، ان کا ذکر خیر اور شکریہ ادا کیا ہے۔

یہ کتاب مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہے: بیتاب صدیقی: ایک نظر میں، خاندانی پسِ منظر، مختصر حالاتِ زندگی، ایک مجاہدِ آزادی، بیتاب صدیقی اور اردو تحریک، بیتاب صدیقی اور غلام سرور، بیتاب صدیقی: ایک سخنور، صحافتی خدمات، ادبی خدمات گیسوئے اردو ابھی... بیتاب صدیقی: ایک اجمالی جائزہ۔ کتاب کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مرتب نے بیتاب صدیقی کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اس کتاب میں شامل نہ ہو، مگر چوں کہ یہ بیتاب کی زندگی پر پہلا سوانحی نمونہ ہے اس لیے مزید کام کیے جانے کی گنجائش باقی ہے اس کا اعتراف خود مرتب نے بھی کیا ہے۔

یہ کتاب بیتاب صدیقی کی زندگی کا مکمل احاطہ کرتی ہے اور ان پر مزید ریسرچ کے خواہش مند حضرات کے لیے یہ کتاب رہنما ثابت ہوگی۔ کتاب کا کاغذ اور طباعت انتہائی نفیس ہے، ہاں کہیں کہیں ٹائپنگ کی غلطیاں موجود ہیں۔ امید ہے آئندہ ایڈیشن میں یہ خامیاں بھی دور کردی جائیں گی۔

شاعری

غیرت گلزار (چہار بیت کا مجموعہ)

شاعر: حافظ عمادالدین خان مراد سعیدی (مرحوم)

مرتب: ڈاکٹر سعادت رئیس

صفحات: 128، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: فہیم الدین خاں (سکریٹری)، مراد اکیڈمی، ٹونک (راجستھان)

مبصر: ارشد عبدالحمید، فردوس نگر کالونی، ٹونک۔304001 (راجستھان)

ٹونک کے شاندار دینی، علمی اور ادبی ماضی سے کون واقف نہیں۔ اس ماضی پر فخر کرنا بھی جائز ہے لیکن 'ماضی کے آئندہ' یعنی حال کے بارے میں فکر مند رہنا بھی ضروری ہے۔ اگر تسلسل قائم نہ رہے تو اقبال کے الفاظ میں کوئی بھی یہ سوال کرسکتا ہے کہ:

"تھے تو آبا وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو"

... شکر ہے کہ تسلسل قائم ہے۔ ٹونک کے شعرا اور مصنفین کی ایک سے بڑھ کر ایک کتاب وقفے وقفے سے منظر عام پر آتی رہتی ہے۔ اس کی تازہ مثال حضرت مراد سعیدی مرحوم کی چار بیتوں کا مجموعہ 'غیرت گلزار' ہے جسے ڈاکٹر سعادت رئیس نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب کے متن پر تو بعد میں نظر پڑتی ہے، پہلے قاری کی نظر اس کے صوری حسن پر ٹھہری جاتی ہے۔ اس کا سرورق جاذب، کاغذ عمدہ اور طباعت روشن ہے۔

حضرت حافظ عمادالدین خاں مراد سعیدی مرحوم ٹونک کی ان شخصیات میں سے تھے جو تہذیب کے متعدد پہلوؤں کو بیک وقت روشن رکھتی ہیں۔ وہ حافظ قرآن بھی تھے، انھیں زبان وادب سے بھی شغف تھا اور وہ مشاعروں، شعری نشستوں یہاں تک کہ چار بیت کے مقابلوں تک کی محفلیں سجانے میں دامے، سخنے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ایسی اہم شخصیت کے نام سے وابستہ کلام کو یکجا کرنا اور ترتیب دے کر منظر عام پر لانا یقیناً ایک اہم خدمت ہے۔ اس سلسلے میں ان کے فرزند جناب فہیم الدین خاں اور مرتب ڈاکٹر سعادت رئیس، دونوں یکساں طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی لگن اور محنت کے بغیر یہ کام انجام کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔

جہاں تک کتاب کے مشمولات کا سوال ہے، مراد صاحب کا کلام اس کے 52 صفحات کو محیط ہے۔ باقی 76 صفحات نثر پر مشتمل ہیں۔ اس نثر میں 'عرضِ مرتب' کے طور پر ڈاکٹر سعادت رئیس کی تحریر ہے۔ 'پیش لفظ' پروفیسر سید صادق علی نے لکھا ہے۔ 'اظہارِ تشکر' کے تحت فہیم الدین خاں کی تحریر ہے۔ 'بس عشق عشق ہے قصہ مراد کا' عنوان سے عبدالحمید طارق کا مضمون ہے۔ جناب مرزا نسیم بیگ کی تحریر 'چار بیت اور ٹونک' کے نام سے شامل ہے۔ جناب سلیم خاور نے اپنے مضمون کو 'مراد سعیدی بحیثیت چار بیت نگار' کا عنوان دیا ہے اور جناب سید ساجد علی ٹونکی نے تعارف اور خدمات کی ذیل میں مراد صاحب اور مراد اکیڈمی پر ایک مبسوط تحریر فراہم کی ہے۔

'غیرت گلزار' میں مراد صاحب کے دو حمدیہ قطعات اور ایک آٹھ بندوں پر مشتمل نعتیہ نظم کے علاوہ 23 چار بیتیں شامل ہیں۔ ان میں بھی اوّل آٹھ چار بیتیں نعت اور منقبت سے متعلق ہیں۔ ان تخلیقات سے مرحوم کے عشق رسول کا جذبہ صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو جذباتی سطح پر انھی چار بیتوں میں ان کے تخلیقی جواہر بھی کھل کر سامنے آتے ہیں۔ دیگر موضوعات میں عشق مجازی، ساقی نامہ اور حب وطن کے علاوہ استاد بسمل سعیدی سے متعلق دو چار بیتیں ہیں اور ایک چار بیت محترمہ ناہید کی شادی کے موقعے پر لکھی گئی ہے۔

چار بیت نگاری کے فن میں سب سے اہم حصہ اس کا مطلع یا مکھڑا ہوتا ہے۔ اگر مکھڑا قاری یا سامع کو فوراً اپنی گرفت میں لے لے تو چار بیت کا آدھا قلعہ تو یہیں فتح ہو جاتا ہے۔ بولتی ہوئی ردیف پر مشتمل زمین، بیساختگی اور کیفیت وہ عناصر ہیں جو مطلعے کو مقبول اور کامیاب بناتے ہیں۔ اسی کے ساتھ زبان کا لطف اور موضوع کے تئیں تجسس کا عنصر بھی شامل ہو جائے تو سونے پر سہاگہ ہوتا ہے۔ 'غیرت گلزار' میں شامل چار بیتوں کے بہت سے مطلعے اسی ہنر کے مظہر ہیں مثلاً واقعۂ کربلا کے حوالے سے ایک مطلع اس طرح ہے۔

مرضیِ حق پہ چلے یوں نہیں چاہا پانی
ورنہ ہر سمت سے آجاتا برستا پانی

اس مطلع میں معنی خیز ردیف کے ساتھ روانی اور برجستگی تو ہے ہی، اسی کے ساتھ چار بیت کے موضوع اور آگے آنے والے بندوں کا معنوی سراغ بھی پوشیدہ ہے جو تجسس کو فروغ دیتا ہے۔ ایک اور مطلع دیکھیے۔

گل رعنا کو تپتی خاک پر دیکھا نہیں جاتا
تجھے دشمن کے گھر رشک قمر دیکھا نہیں جاتا

گل رعنا اور رشکِ قمر کو تپتی خاک (رقیبانہ صورت حال) پر دیکھنے کا تصور جس شعری بیانیہ (Narrative) کی تمہید ہے وہ آگے آنے والے بندوں کی طرف واضح اشارہ کر رہا ہے۔ اسی طرح کے کچھ اور مطلعے دیکھیے۔

فرشتو! پھول برساؤ مرا محبوب آیا ہے   عبیر و عود مہکاؤ مرا محبوب آیا ہے

عشق کو آئیں بھلا حسن کے انداز کہاں   دیدۂ شوق کو حاصل نگہ ناز کہاں

جیسا کہ مذکور ہوا، مطلع کامیاب ہو تو اگلے چار بندوں میں خیال اور مضمون کا پھیلاؤ شاعرانہ کمال کو راہ دیتا ہے۔ 'غیرتِ گلزار' کی اکثر چار بیتوں میں یہ پھیلاؤ فنکارانہ مہارت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ مثال کے لیے اوپر منقول ایک مطلع 'گل رعنا' سے شروع ہوا ہے۔ اس مطلع میں رقیب کے حوالے سے ایک صورت حال کا تصور کیا گیا ہے۔ اب اس کے پہلے بند میں یہ ممکن تھا کہ دشمن کا کچھ ذکر کیا جائے لیکن شاعر نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی جگہ وہ اپنے عشق سے قبل کی زندگی کو یاد کرتا ہے۔

کوئی غم ہی نہیں تھا اچھے رہتے تھے بیاباں میں
سکون دل ملا کرتا ہے جیسے باغ رضواں میں
یہاں آئے تو دیکھی خاک ہی اڑتی گلستاں میں
بہاروں پر خزاؤں کا اثر دیکھا نہیں جاتا
گل رعنا کو تپتی خاک پر دیکھا نہیں جاتا

یہ بند مطلع کے تاثر کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ دوسرے بند میں موجودہ صورت حال پر توجہ ہے اور تیسرا بند اس خواہش کا اظہار ہے کہ:

"مجھے رہنے دے میں جس حال میں ہوں دل کو راحت ہے"

... اور آخری بند میں محبوب کی حالت زار کا بیان ہے کہ:

"تبسم اب کہاں، رہتا ہے گریاں وہ گل رعنا"

... خیال کے اس پھیلاؤ کی یہ تنظیم خوب ہے کہ رشک قمر دشمن کے گھر میں ضرور ہے لیکن خوش وہ بھی نہیں ہے۔

فنی نقطۂ نظر سے بھی 'غیرت گلزار' کلاسیکی طریقہ ہائے کار کا اتباع کرتے ہوئے مراعات النظیر، حسن تضاد اور تشبیہ و استعارہ کا خاطر خواہ اہتمام کرتی ہے۔ یہ جس عہد کی شاعری ہے، اسی عہد میں مخمور سعیدی، سخاوت شمیم، صابر حسن رئیس اور حسن اقبال وغیرہ نئی شاعری کی طرف ملتفت تھے لیکن اسی کے متوازی اساتذہ کا ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو کلاسیکی لفظیات کے ذریعے بھی مجاز، استعارہ اور اس سے بھی آگے جا کر علامت سازی کا جادو جگا رہا تھا۔ ان میں استاذی ابن احسن بزمی مرحوم کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ 'غیرت گلزار' میں علامتی اظہار کا رجحان تو نظر نہیں آتا لیکن کلاسیکی لفظیات کی اپنی ایک علامتی سطح ہے اور اسے سلیقے سے برت لینا بھی کم سعادت کی بات نہیں۔ 'غیرت گلزار' اس سلیقے کی عمدہ مثال ہے۔ یہ چار بیتیں ایک جانب صنفی تقاضوں کو بطرز احسن پورا کرتی ہیں تو دوسری طرف کلاسیکی صلابت کے لطف سے بھی ہمکنار ہیں۔

یہ کتاب ایک طرف متعدد خوبیوں کی حامل ہے تو بعض اسقام پر بھی نگاہ پڑتی ہے۔ بعض اسقام متن سے متعلق ہیں اور مرتب یہاں مجبور ہے کہ جیسا متن فراہم ہوگا، ویسا ہی پیش کیا جائے گا۔ یہ ضرور ہے کہ شاعری کے مجموعے میں شاعری کم اور نثر زیادہ ہو تو لگتا ہے جیسے حواشی نے متن کو کھا لیا ہے۔ پھر مجھ جیسا طالب علم سب کچھ لکھتا ہے، متن ہی پر بات نہیں کرتا۔ بہتر ہوتا کہ 'غیرت گلزار' کی چار بیتوں کے حوالے سے فنی معاملات کا احاطہ کیا جاتا اور کچھ تعیین قدر کی بات ہوتی۔ اس کے باوجود کتاب کی اہمیت و افادیت مسلم ہے اور کوئی اپنی پہلی ہی تالیف میں اس قدر مواد فراہم کرتے ہوئے حسن ترتیب کا ثبوت پیش کرے تو اس کی صلاحیتوں کا اعتراف لازم ہے۔ ڈاکٹر سعادت رئیس مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے استاد پروفیسر سید صادق علی کی رہنمائی میں تحقیق ادب کا صبر آزما لیکن صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ ان کے لیے بہت سی دعائیں اور برادرم فہیم الدین خاں کو ایک بار پھر مبارک باد کہ انھوں نے ایک لائق فرزند ہی کا نہیں ایک فائق اردو دوست کا فریضہ بھی ادا کیا ہے۔

جمالِ رنگ

شاعر: فہیم جوگاپوری

صفحات: 259، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2024

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، کالی باغ، بتیا (بہار)

فہیم جوگاپوری نئی شاعری کے حوالے سے ایک بہت ہی اہم اور مستند نام ہے۔ ان کا مستقل مستقر تو بہار کا تاریخی شہر سیوان ہے، لیکن ان کی شاعری کو کسی ایک شہر سے منسوب کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ انھوں نے اپنے منفرد اور امتیازی لب و لہجے کی بدولت ہندوستان گیر پیمانے پر اپنی شناخت مستحکم کی ہے۔ فہیم جوگاپوری تقریباً 40 برسوں سے مشق سخن میں مصروف ہیں۔ اس سے قبل ان کی غزلیات کے تین مجموعے 'نوید سحر'، 'ادھوری بات' اور 'دھوپ چھاؤں' منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں اعتبار و استناد حاصل کر چکے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ ایک وقت تھا کہ انھوں نے سیوان کے استاذ شاعر کوثر سیوانی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا، اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ خود اصلاح سخن کا مرکز بن گئے۔ یہی سبب ہے کہ آج ان کے متعدد تلامذہ بہترین شعرا کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔

فہیم جوگاپوری ایک صاف، شفاف، اور سادہ لوح شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اپنے خلوص اور اپنی منکسر المزاجی کی بدولت نہ صرف اپنے ہم عصروں میں بلکہ اپنے خوردوں میں بھی مقبولیت اور محبوبیت حاصل کی ہے۔ مجھے فہیم صاحب کو بارہا سننے اور پڑھنے کا موقع ملا ہے اور آج ان کے تازہ ترین شعری مجموعے 'جمالِ رنگ' میں انھیں یکمشت پڑھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ ان کی شاعری کے غائر مطالعے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ اپنے بیشتر معاصرین میں بالکل علاحدہ اور ممتاز ہیں۔ میں اس شاعری کا کوئی جواز تسلیم نہیں کرتا، جس میں کسی نہ کسی سطح پر ندرت نہ ہو مگر جمالِ رنگ کے شاعر کا سب سے بڑا خاصہ اس کے یہاں ہر سطح پر ندرت اور تازگی ہے۔ ان کا لب و لہجہ، ان کی لفظیات، ان کے متنوع موضوعات نیز ان کے نجی تجربات و مشاہدات آج کے بیشتر شعرا سے جدا ہیں۔ ان کے اشعار کی قرأت کے بعد شدت کے ساتھ یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسروں کی آواز میں آواز ملانے اور کورس کا حصہ بننے سے قصداً اجتناب برتا ہے۔ انھوں نے بیشتر مقامات پر خالص اپنے انداز و اسلوب اور تجربات و مشاہدات کو اپنا راہنما بنایا ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں سادگی بھی ہے، پرکاری بھی ہے اور اپنے عہد کا پختہ شعور و آگہی بھی ہے۔ ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی کہ ان کے یہاں غیر ضروری علامت، ابہام اور اغلاق نہیں۔ ان کے یہاں اکثر اشعار براہ راست ہیں جس کی وجہ سے ان کے موقف اور فکر کی موثر ترسیل بہ آسانی ہو جاتی ہے۔

فہیم صاحب کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے انفراد کے متعلق اب تک درجنوں ادبا، شعرا نے اظہار خیال کیا ہے۔ جن میں مظہر امام، مخمور سعیدی، نادم بلخی، شکیل الرحمٰن، کمال احمد صدیقی، نصرت ظہیر، شاہین، علی احمد فاطمی، انور پاشا، حقانی القاسمی، محمد کاظم اور خان محمد رضوان جیسی شخصیات کے نام آتے ہیں۔ ان ادبا و شعرا کے یہاں ایک بات

مشترک ہے کہ فہیم جوگاپوری اپنے عہد کا ایک اہم اور بڑا شاعر ہے، جس پر توجہ مرکوز کرنا ضروری ہے۔

اب آیئے! 'جمالِ رنگ' سے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

ہمارے حرفِ صداقت سے ڈر گیا قاتل
قلم اٹھانے سے پہلے ہمارے ہاتھ کٹے

ابھی ابھی مرے نزدیک سے گیا ہے کوئی
مجھے ٹٹولو مری سانس چل رہی ہے کیا!

ہے دل کو آج درد فزوں تر کی جستجو
اے رنجِ انحطاط کہیں لے کے چل مجھے

مبارکباد کے حقدار ہو تم ہی زمانے میں
تمھارے زہر سے بیمار اچھا ہونے والا ہے

دھوپ اور چاندنی مت چھین فقیروں سے کہ ہم
چاند سورج کو گرفتار بھی کر سکتے ہیں

تمام شہر تھا ڈوبا ہوا اندھیرے میں
ہم اک دیے سے اجالا کہاں کہاں کرتے

فہیم آؤ یہاں سے بھی کوچ کر جائیں
زمانہ ہوگیا اپنے کو رائیگاں کرتے

درج بالا اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تمام احساسات وتجربات شاعر کے اپنے ذاتی تجربے کا فنی عکس ہیں۔ شاعر اکثر مقام پر حق وناحق کے تصادم اور اثبات ونفی کی جنگ کی تصویر کشی کرتا ہے۔ شاعر ان عناصر کی خطاؤں کو درگزر کرنے کا ظرف بھی رکھتا ہے، جو اپنی خطاؤں پر نادم اور ملول ہیں۔ شاعر کے یہاں رومانی اشعار بھی ہیں، لیکن بہ اندازِ دگر۔ اس مقام پر بھی شاعر کا جداگانہ انداز واسلوب صاف جھلکتا ہے۔ یہاں دوسرا، تیسرا اور چوتھا شعر اپنے گردوپیش کے گہرے اور عمیق ادراک وآگہی پر مبنی ہے۔ شاعر عہد حاضر کی بے حسی، بے اعتنائی اور بے ترتیبی پر حد درجہ نالاں ہے اور اس بات کا خدشہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر یہی صورت حال برقرار رہی تو پورا معاشرہ اپنی روایت اور اقدار سے کٹ کر تاریک غار میں معدوم ہوجائے گا۔

شاعر نے اگلے اشعار میں بھی انھیں کیفیات کو الگ الگ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ ان اشعار میں ایک بات مشترک ہے کہ جمال رنگ کا شاعر عہد موجود کے مزاج اور طرف واداسے حد درجہ مایوس ہے اور اس کا برملا اظہار بھی کرتا ہے۔ اس کے یہاں اکثر اشعار میں زیاں کا احساس غالب ہے، مگر وہ مایوسی اور کلبیت کا شکار ہرگز نہیں ہوتا۔ اس کے یہاں امید وبیم اور رجائیت کا اظہار بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر اخیر میں صرف ایک شعر دیکھ لیں۔

بچھڑ کے ملنے کا موڑ آئے گا ضرور فہیم
بڑھائی جائے کہانی جو ڈھنگ سے آگے

مجھے امید ہے کہ ادب کے جانکار اور فنکار اس مجموعے کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے، تاکہ موجودہ شعری منظرنامے پر فہیم فہمی کی راہ ہموار ہوسکے، نیز فہیم جوگاپوری بھی خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمہ دم مصروف رہیں۔

عروض

ندیم عروض

مصنف: ندیم احمد انصاری

صفحات: 120، قیمت: 140 روپے

مبصر: طاہرہ خاتون، B005، نزمین دشواس

نزمین نگر، نیلے مورے، نالاسوپارہ ویسٹ، پن کوڈ: 401203

فنِ عروض ایک مشکل فن سمجھا جاتا ہے، جب کہ توجہ اور محنت سے اس پر دسترس حاصل کی جاسکتی ہے۔ عموماً اسکول کے اساتذہ اس فن پر کماحقہ توجہ نہیں دیتے، امتحان میں پانچ دس نمبروں کے سوالوں کے جواب کے لیے وہ اس پر وقت صَرف کرنا تضیعِ اوقات تصور کرتے ہیں، نتیجۃً طلبہ بھی اس فن سے صَرفِ نظر کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ بی اے اور ایم اے میں پہنچ کر بھی وہ اس وادی میں قدم نہیں جما پاتے۔ ایسے جمیع طلبہ بلکہ اساتذہ کے لیے ندیم احمد انصاری صاحب کی یہ تصنیف 'ندیمِ عروض' اسم بامسمیٰ ہے۔ اس جامع کتاب کے مطالعے سے قاری بہ آسانی فنِ عروض سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے۔

اس تصنیف کا جواز پیش کرتے ہوئے مصنف نے 'سرآغاز' میں لکھا ہے کہ 'اس موضوع پر چھوٹی بڑی متعدد کتابیں بازار میں آچکی ہیں۔ ان کی افادیت سے انکار نہیں، لیکن نہایت ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہوں گا کہ ان میں سے اکثر کتابوں کی زبان، انداز اور مشمولات عالمانہ ہیں، جنھیں سمجھنے کے لیے مبتدی طلبہ کو دشواری پیش آتی ہے۔ اس بات کا احساس مجھے اس وقت ہوا، جب اسماعیل یوسف کالج، ممبئی کے شعبۂ اردو میں یہ مضمون مجھے برائے تدریس تفویض کیا گیا۔ اسی پس منظر میں طلبہ کی نفسیات اور تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ مختصر کتاب وجود میں لائی گئی ہے'۔ کتاب کے مطالعے کے بعد یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہے، یہی وجہ ہے کہ اب تک کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

ندیم احمد انصاری کی 'ندیمِ عروض' کے علاوہ بھی متعدد علمی وادبی تصنیفات منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ کالج میں تدریس کے زمانے میں طلبہ کے لیے وہ کئی کتابیں شائع کرچکے ہیں۔ یہ کتاب بھی انھوں نے طلبہ کی خاطر تصنیف کی، جس میں فنِ عروض پر موجود سابقہ کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے صرف 'مثمن سالم بحروں' سے بحث کی گئی ہے۔ اس کا فایدہ یہ ہے کہ طلبہ کسی الجھن کا شکار نہیں ہوتے۔ کتاب میں علمِ عروض کا مختصر تعارف، ارکان اور بحروں کی وضاحت اور اصولِ تقطیع کی دل پذیر وضاحت کے بعد ہر بحر کے چند اشعار کی تقطیع کر کے دکھایا گیا ہے، جس سے بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ دوسرے ایڈیشن کی یہ خصوصیات بھی قابلِ ذکر ہیں: (1) 'اشعار برائے تقطیع' کے نام سے مصنف نے ایک مستقل کتابچہ شائع کیا تھا، اسے اس ایڈیشن میں شاملِ اشاعت کرلیا گیا ہے، اس کی مدد سے طلبہ کے لیے تقطیع کی مشق کرنا مزید آسان ہوگیا ہے (2) اردو زبان میں علمِ عروض پر لکھی گئی کتابوں میں بحرِ وافر پر سرسری گفتگو کی جاتی ہے، لیکن ندیم احمد انصاری نے اس موضوع پر سات صفحات کا تحقیقی وتنقیدی مقالہ لکھ کر دلچسپ گفتگو کی ہے۔

مختصر یہ کہ صاف وشستہ زبان میں لکھی گئی یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک قیمتی اضافہ اور اس قابل ہے کہ اسے نصاب میں شامل کیا جائے۔ مشہور ناقد اور شعبۂ اردو، ممبئی یونی ورسٹی کے سابق صدر پروفیسر یونس اگاسکر مصنف کی اس علمی خدمت کا اعتراف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: 'انھوں نے نصاب میں شامل کتاب کے علاوہ دیگر کتب کا بہ غور مطالعہ کیا اور طلبہ کو عروض پڑھانے اور تقطیع کی مشق کرانے کا سلسلہ شروع کیا تو انھیں اندازہ ہوا کہ روایتی انداز میں تیار کی گئی اس ٹیڑھی کھیر کو سونے کے چمچے سے کھلانے پر بھی وہ ہضم ہونے والی نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے نصاب کے تقاضوں کے پیشِ نظر ایک مختصر وعام فہم رسالے کا ڈول ڈالا جو 'ندیمِ عروض یا شعروں کی تقطیع کیسے کریں' کے زیرِ عنوان منظرِ عام پر آرہا ہے۔ میں نے اس چھوٹی سی کتاب کے بعض حصوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ ندیم احمد انصاری نے اس میں اپنے مطالعے اور اپنی محنت و ذہانت کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے طلبہ کی صلاحیتوں اور ضرورتوں کے مطابق ایک ایسی رہنما کتاب ترتیب دی ہے جو ان کی تکمیلِ آرزو اور تسکینِ ذوق دونوں کا سامان فراہم کرتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کاوش طلبہ واساتذہ دونوں کے لیے مفید مطلب ثابت ہوگی'۔

تبصرے اور تجزیے

ادبی رسائل کے شماروں کا جائزہ

مصنف: ڈاکٹر محمد ناظم علی

صفحات: 392

مطبع: لولو پرنٹرس اینڈ پبلشرس، حیدرآباد

مبصر: ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی

گورنمنٹ ڈگری کالج ظہیرآباد، ضلع: سنگاریڈی، تلنگانہ

انیسویں اور بیسویں صدی میں اردو زبان وادب کے فروغ میں ادبی رسائل کی خدمت نمایاں رہی ہے۔ اردو تحقیق وتنقید سے وابستہ ادب نواز شخصیتیں جانتی ہیں کہ رسالہ ہمایوں' شب خون' ساقی وغیرہ کس طرح ادبی حلقوں میں مشہور تھے۔ اکیسویں صدی میں اردو اکادمیوں' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اور کچھ انفرادی صحافیوں اور تنظیموں کی جانب سے ادبی رسائل آج بھی پابندی سے نکل رہے ہیں اور اردو کے ادبی حلقوں میں ان کی شناخت اور مقبولیت ہے۔ آج کے اس مشینی دور میں اردو اخبارات ورسائل کو اردو کے اچھے قاری کی ضرورت ہے جو ان اخبارات اور رسائل میں شائع مواد کا مطالعہ کرے اور اس پر اپنی رائے ظاہر کرے۔

جنوبی ہند میں حیدرآباد دکن اردو کا بڑا ادبی مرکز ہے۔ یہاں سے رسالہ سب رس' شگوفہ اور قومی زبان ترجمان تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈمی پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ اعجاز عبید صاحب آن لائن رسالہ 'سمت' نکال رہے ہیں۔ حیدرآباد سے اردو کے ادبی رسائل کا پابندی سے مطالعہ کرنے اور ان پر ہر ماہ تبصرہ لکھنے والے ایک باذوق قاری ڈاکٹر محمد ناظم علی ہیں۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی شہر اردو حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والے نامور محقق ادیب وادبی صحیفہ نگار ہیں۔ پیشے سے استاد اردو رہے گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ نظام آباد سے پرنسپل کے عہدے سے سبکدوش ہوئے ۔ نظام آباد کی تلنگانہ یونیورسٹی کے سنیٹ کمیٹی کے رکن بھی ہیں۔ حکومت تلنگانہ کی جانب سے انھیں کارنامہ حیات ایوارڈ اور بیسٹ ٹیچر ایوارڈ بھی حاصل ہو چکا ہے۔ ان دنوں ادب اور سماج کی خدمت کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں۔ تصنیف وتالیف میں عمر گزاری۔ رسالہ 'اردو دنیا' کے مشمولات پر پابندی سے تبصرے لکھتے ہیں۔ آل احمد سرور پر انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور 'حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد' ایم فل کے لیے ان کا گراں قدر تحقیقی کام ہے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی قلم کو امانت سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کے تحریر کردہ تحقیقی ادبی مضامین ومراسلات مختلف رسائل اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی زود گو مصنف ہیں اور اپنی تیرھویں تصنیف 'ادبی رسائل کے شماروں کا جائزہ' کے ساتھ قارئین کے روبرو پیش ہوئے ہیں۔ اس سے قبل ان کی شائع شدہ گراں قدر تصانیف میں آئینۂ عصر، روح عصر، عکس ادب، ادبی بصیرت، تنقیدی فکر، افکار جدید، نقش ہیں ناتمام، ادبی وتہذیبی رپورتاژ، ادبی نظر، پروفیسر آل احمد سرور فکر وفن، ادبی جائزے اور حیدرآباد کے ادبی رسائل آزادی کے بعد شامل ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'ادبی رسائل کے شماروں کا جائزہ' میں فاضل مصنف ڈاکٹر محمد ناظم علی نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ترجمان رسالہ 'اردو دنیا' کے اکتوبر 2014 سے فروری 2023 تک اٹھائیس شماروں کا جائزہ پیش کیا ہے۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈمی کی جانب سے بچوں کے لیے رسالہ 'روشن ستارے' نکلتا ہے۔ اس رسالے کے سولہ شماروں کا جائزہ اس کتاب میں پیش ہے اسی طرح حیدرآباد سے نکلنے والے رسالے ماہنامہ 'صدائے شبلی' کے چھ شماروں ماہنامہ 'رنگ و بو' کے بیس شماروں ماہنامہ 'شگوفہ' حیدرآباد کے سات شماروں ماہنامہ 'فکر ونظر-علی گڑھ' سہ ماہی 'ریختہ نامہ' حیدرآباد، سوونیر جامعہ عثمانیہ، ماہنامہ شاداب انڈیا حیدرآباد، ماہنامہ گونج نظام آباد، ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد اور دیگر متفرق رسالوں کا جائزہ شامل ہے۔ ادبی رسالہ اپنے اندر تحقیقی وتنقیدی مضامین، افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے مشمولات، ادیبوں سے انٹرویو، رپورتاژ، شعری انتخاب اور خطوط وغیرہ کا ایک گلدستہ ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ادبی رسالے میں شامل مشمولات اردو کے عام قاری یا محققین کی نظر سے دور ہو جاتے ہیں۔ جس طرح رسالوں کے مشمولات یا ببلیوگرافی کا تحقیقی کام اہمیت کا حامل ہے اسی طرح رسالوں پر تبصروں پر مشتمل تاثراتی مضامین کی کتابیں بھی تحقیقی نقطہ نظر سے اہمیت کی حامل ہیں۔ اردو کا محقق اس طرح کی ایک کتاب دیکھ کر کئی سو رسائل کے مشمولات سے واقف ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ناظم علی نے اپنی تحقیقی عمر رسالوں کی ورق گردانی میں گزاری ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق میں اردو کے کئی ادبی رسائل کے پہلے شمارے کی تحقیق اردو دنیا کو پیش کی ہے۔ ہر ماہ جب بھی وہ کسی رسالے کو حاصل کرتے ہیں تو اس کے مشمولات ابتدا سے آخر تک پڑھتے ہیں اور اس پر فوری تبصرہ لکھ کر مذکورہ رسالے کو بہ غرض اشاعت بھیجتے ہیں یہی وجہ ہے کہ 'اردو دنیا' جیسے عالمی شہرت کے حامل رسالے میں ان کے لکھے ہوئے ادبی رسائل کے تبصرے ہر ماہ پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ وہ کسی رسالے کو پڑھتے ہیں تو اس کے مشمولات پر مختصر انداز سے تبصرہ تحقیق اور تنقید پیش کرتے ہیں۔

ماہنامہ اردو دنیا ماہ اگست 2017 پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ناظم علی لکھتے ہیں کہ 'ماہ اگست کا شمارہ یوں تو عام شمارہ ہے لیکن ماہ اگست کا ہونے کی وجہ سے اس میں جدو جہد آزادی اور حصول آزادی اور محبان وطن اور شہیدان وطن سے متعلق معلومات موجود ہیں اور بعض نادر نکتے بیان کیے گئے ہیں کہ نئی نسل واقف ہو سکے۔ ہماری بات اداریے میں مدیر صاحب نے آزادی سے متعلق اردو زبان وادب کے کردار کو بیان کیا ہے... آپ کی بات کالم سے مشمولات کی قدر وقیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ محمد اسلم اصلاحی نے مولانا ابوالکلام آزاد اور عالم عرب میں مولانا کے عربی اور اردو کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ غرض سو صفحات پر مشتمل شمارے میں ہندوستان کی جدو جہد آزادی اور حب وطن سے متعلق اردو زبان وادب کی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔''

اس کتاب میں شامل سبھی رسالوں کے تبصروں کا انداز تعارفی ہے اور جگہ جگہ مصنف نے رسالے کے مشمولات کے مواد کے تعارف کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ رسائل کے اداریے بھی اہم ادبی موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں جن کی جانب ڈاکٹر محمد ناظم علی نے اشارہ کیا ہے۔ اردو کے ادبی رسائل کے بڑے خزانے کے تعارف پر مبنی یہ کتاب 'ادبی رسائل کے شماروں کا جائزہ' ڈاکٹر محمد ناظم علی کی ایک اچھی کوشش ہے۔ ڈاکٹر محمد ناظم علی نے اس کتاب کا انتساب اردو کی ترقی و بقا کے لیے کام کرنے والوں کے نام کیا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر نادر المسدوسی صاحب سرپرست بزم علم وادب حیدرآباد نے لکھا جس میں انھوں نے اردو رسائل کے تعلق سے ڈاکٹر محمد ناظم علی کی دلچسپی کو اجاگر کیا ہے۔ دیدہ زیب سرورق اور عمدہ کمپوزنگ واشاعت کے ساتھ یہ کتاب اردو ادب میں اچھا اضافہ ہے۔ تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈمی کی جزوی مالی اعانت سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے۔

■

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے 'خبرنامہ' میں پوری اردو دنیا بالخصوص ہندوستان کی ادبی، علمی، ثقافتی سرگرمیوں کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ یہ محض خبریں نہیں ہیں بلکہ ان کی حیثیت دستاویزی اور حوالہ جاتی ہے۔ ان خبروں سے ہمارے ادبی و ثقافتی تحرک اور تنوع کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار کا بھی۔ یہ خبرنامہ ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے مختلف اردو اخبارات کے تراشوں سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بہت ساری ریاستوں اور اضلاع سے خبریں ہمیں نہیں مل پاتی ہیں، اس لیے ادبی ثقافتی تقریبات کے منتظمین سے گزارش ہے کہ اہم ادبی ثقافتی تقریبات اور علمی ادبی شخصیات کی وفات کے تعلق سے خبریں براہِ راست درج ذیل ای میل urduduniyancpul@yahoo.co.in, editor@ncpul.in پر بھجوانے کی زحمت فرمائیں۔

اردو زبان کے فروغ میں ٹیکنالوجی کی اہمیت ناگزیر: ڈاکٹر شمس اقبال

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں اردو اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے میٹنگ ہوئی جس میں اظہار خیال کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ آج ٹیکنالوجی زبان کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کررہی ہے۔ ہر سطح پر کوشش ہورہی ہے کہ مواد کو ای فارمیٹ میں لایا جائے۔ قومی اردو کونسل بھی اس سلسلے میں مسلسل کام کرتی رہی ہے۔ کونسل کے ای کتاب موبائل ایپ، بلاگ، ای لائبریری ویب سائٹ، اردو آن لائن لرننگ ویب سائٹ وغیرہ سے بڑی تعداد میں ملک اور بیرونِ ملک سے اردو آبادی استفادہ کررہی ہے۔ ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے آج اس میں توسیع اور اَپ گریڈیشن کی ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے پلیٹ فارم کو اَپ گریڈ کرکے بھی مواد کو ڈیجیٹلائز کیا جائے۔ انٹرنیٹ سے بچوں اور نوجوانوں کی وابستگی اور دلچسپی کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس بات کو یقینی بنایا جانا چاہیے کہ انھیں مواد کی فراہمی آسان ہو۔ اسی مقصد کے تحت اس میٹنگ کا انعقاد کیا گیا تاکہ اردو آبادی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جاسکے۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر ارمان رسول فریدی (چیئرمین ڈپارٹمنٹ آف کمپیوٹر سائنس، علی گڑھ) نے کہا کہ آج کا دور ٹیکنالوجی کا ہے اور گلوبل ورلڈ میں کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال ضروری ہے۔ اردو ورلڈ نیٹ بنانے کی بھی ضرورت ہے اور اس کام کو قومی اردو کونسل سے بہتر اور کوئی دوسرا ادارہ انجام نہیں دے سکتا۔ پروفیسر محمد جہانگیر وارثی (چیئرمین شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے کہا کہ اردو زبان کے فروغ کے حوالے سے قومی کونسل کا مینڈیٹ شروع سے بالکل واضح ہے۔ اردو ایک کمیونیکیشن کی زبان بن کر عالمی سطح پر ابھری ہے اور اس میں قومی کونسل کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی کے استعمال میں بھی این سی پی یو ایل نے سرگرمی دکھائی ہے۔ اس کی ویب سائٹ پر کتابوں کی فہرست، میگزین اور جرنلز، مضامین (یونی کوڈ فارمیٹ میں) اور ای پب و پی ڈی ایف کی صورت میں کتابیں موجود ہیں۔ اردو زبان کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے ٹیکنالوجی کا استعمال اور اس کو اپڈیٹ کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر منصف عالم (ڈپارٹمنٹ آف کمپیوٹر سائنس، جامعہ

ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے کہا کہ آج ٹیکنالوجی کی اہمیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہوگیا ہے۔ آج کوئی بھی کام بغیر تکنیکی سہارے کے ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد معمور علی (اسسٹنٹ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ٹیچر ٹریننگ اینڈ نان فارمل ایجوکیشن، آئی اے ایس ای، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے کہا کہ آج کے زمانے میں اردو یا اس جیسی کسی بھی زبان کو ٹیکنالوجی کا استعمال ضرور آنا چاہیے۔ زبان سیکھنے والے کو اس کا استعمال اور اس سے فائدہ اٹھانے کا ہنر آنا ضروری ہے۔ تدریس کے حوالے سے ٹیکنالوجی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کونسل کا یہ اقدام قابل تحسین ہے کہ وہ ڈیجیٹل پلیٹ فارم کے اَپ گریڈیشن کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ اس پروگرام میں جناب پرشانت ورما (پروگرام مینیجر ٹیکنکل سولیوشن ڈیجیٹل انڈیا بھاشنی ڈویژن، ڈی آئی سی، مائٹی)، جناب سید محمد احمد (سی ٹی او، لاریب انٹرنیشنل، نئی دہلی) نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

میٹنگ میں قومی اردو کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی، ریسرچ آفیسر شاہنواز محمد خرم، ریسرچ اسسٹنٹ محمد افضل حسین خان، پروجیکٹ اسسٹنٹ محمد افروز وغیرہ موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 5 جون 2023

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

اردو کسی ریاست کی نہیں، بلکہ پورے ملک کی زبان ہے: ڈاکٹر محمد شمس اقبال

نئی دھلی: آیت فاؤنڈیشن ٹرسٹ اور فارچون انڈیا فاؤنڈیشن نے 'عصر حاضر میں اردو کی معنویت' کے موضوع پر مجلس مذاکرہ اور مشاعرہ تسمیہ آڈیٹوریم میں منعقد کیا۔ اس موقعے پر عصر حاضر میں اردو کی سماجی ضرورت، معنویت،

زبان کا روزگار سے تعلق، عام لوگوں سے اردو کا ربط قائم کرنے اور اس کے تدریسی و تعلیمی مسائل وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو ہوئی۔ مجلس مذاکرہ کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق نے کی، جب کہ نظامت ڈاکٹر مظفر حسین غزالی نے کی۔ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے شرکت کی۔ مشاعرہ کی صدارت پروفیسر خالد محمود نے کی، جب کہ نظامت ڈاکٹر شعیب رضا وارثی نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد شمس اقبال نے کہا کہ اگر ہم اپنے بچوں سے اردو میں بات نہیں کریں گے تو زبان آگے کیسے بڑھے گی، کیونکہ زبان استعمال سے ہی آگے بڑھتی ہے۔ شعیب رضا خان نے کہا کہ زبان میں اپنی طاقت ہوتی ہے۔ اردو کی دوسری اصناف کے ساتھ غزل اور شاعری میں بہت طاقت ہے۔ اس کی وجہ سے غیر اردو داں بھی اسے پسند کرتے ہیں۔ ارشد غازی نے زبان کی کمیوں کی طرف توجہ دلائی اور اچھی زبان کے ساتھ محاوروں کے استعمال پر زور دیا۔ ریحان خان سوری نے کہا کہ زبان انسان کی ترقی میں معاون ہوتی ہے، وہ رکاوٹ نہیں بنتی، اردو پڑھنے والے کسی سے کم نہیں ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے شمس اقبال کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کا تعلق تہذیب سے ہے۔ گھروں میں اردو کا استعمال کیا جائے تو زبان کا فروغ ہوگا۔ سپریم کورٹ کے وکیل اتل موریا نے کہا کہ گاندھی جی جس کو ہندوستانی کہتے تھے وہ فارسی رسم الخط میں اردو اور دیوناگری میں ہندی کہلائی۔ ڈاکٹر شمس اقبال نے بھی ان کی اس بات کی تائید کی۔ زبیر خان سعیدی نے ڈاکٹر شمس اقبال کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ مجلس مذاکرہ کے صدر ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ ملک میں زیادہ تر لوگ جو کچھ بولتے ہیں وہ اردو ہے، بس وہ رسم الخط نہیں جانتے۔ اس کے بعد محفل مشاعرہ کا آغاز ہوا اعجاز انصاری، معین شاداب، عادل رشید، نواز عصیمی اجین کے علاوہ گائتری مہتا، خوشبو پروین اور نوید یوسف وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ اس موقعے پر ندیم اختر، جمشید عادل، جاوید اختر، محمد جاوید، حقانی القاسمی، عبدالرشید، اشرف بستوی، شمس تبریز، پروفیسر عبدالقیوم انصاری کے علاوہ بڑی تعداد میں صحافی سماجی کارکن اور اردو سے محبت کرنے والے افراد شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مئی 2024

جدید سعودی ادب تخلیق وتنقید کے آئینے میں

نئی دھلی: مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات جے این یو میں 'جدید سعودی ادب تخلیق وتنقید کے آئینے میں' دو روزہ عالمی سیمینار کا آغاز ہوا، جس میں مہمان خصوصی کے طور پر نائب سعودی سفیر جادی نایف الرقاص، شریک ہوئے، جب کہ صدارت دیپندر ناتھ داس، ریکٹر جے این یو نے کی۔ مرکز برائے عربی وافریقی مطالعات کے صدر پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے پروگرام کے تعلق سے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ پروفیسر شریف محمد رضی نجا، شعبہ عربی، ناردرن

بارڈر یونیورسٹی سعودی عرب نے ویڈیو کانفرنس کے دوران اپنے کلیدی خطبے میں سعودی عرب میں عربی زبان کی تاریخ، قدیم وجدید عربی ادب کے متعدد مراحل پر تفصیل سے روشنی ڈالی، انھوں نے کہا کہ سعودی عرب کسی بھی دور میں عربی زبان وادب کی خدمت میں پیچھے نہیں رہا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس خطے نے ایک سے بڑھ کر ایک نابغہ روزگار پیدا کیے ہیں۔ پروفیسر اخلاق آہن نے ماڈرن عربی ادب کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کیا، انھوں نے کہا کہ ہم نے عربی ادب کا تو بلاواسطہ مطالعہ نہیں کیا زیادہ تر میرا مطالعہ مترجم ادب کے مطالعے سے ہوا ہے۔ پروفیسر زبیر احمد فاروقی نے سعودی عرب میں جدید عربی ادب میں ایک مبسوط خطاب پیش کیا جس میں انھوں نے سعودی عرب کے جدید قلمکاروں اور ادیبوں کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔ صحافی محمد عاطر خان نے ہندو عرب کے مابین تعلقات پر خطاب کیا۔ پروگرام کی صدارت دیپندر ناتھ داس، ریکٹر جے این یو نے کی اور انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں ہندو عرب کے قدیم وجدید تعلقات پر رشنی ڈالی اور ہندوستان میں عربی ادب کے اثرات کا تفصیل سے تذکرہ کیا۔

ڈاکٹر اختر عالم، استاذ شعبہ عربی، جے این یو نے کانفرنس کی نظامت کی ذمے داری سنبھالی اور نہایت حسن وخوبی کے ساتھ پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ پروفیسر قطب الدین نے تمام مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور دو روزہ عالمی کانفرنس کے افتتاحی جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 مئی 2024

جشن اظہر عنایتی

نئی دھلی: ایوان غالب میں انفرادی لب و لہجے کے ممتاز شاعر اظہر عنایتی کا جشن منایا گیا۔ جشن اظہر عنایتی کا اہتمام 'حرف کار فاؤنڈیشن' اور 'آغاز بہار' نے کیا تھا۔ اس موقعے پر اہم اسکالروں نے صاحب جشن اظہر عنایتی کے شعری محاسن اور ان کے شخصی اوصاف پر روشنی ڈالی۔ تقریب کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر خالد محمود نے کی۔ توصیف احمد مرزا، راکیش اوشاوید مہمانِ خصوصی تھے۔ پروفیسر خالد محمود نے اظہر عنایتی کا ایک بے حد دلچسپ خاکہ پڑھا۔ انھوں نے اظہر عنایتی کو غزل کا نمائندہ شاعر قرار دیا۔ جن دیگر لوگوں نے اظہر عنایتی کے فنی کمالات پر اظہار خیال کیا ان میں پروفیسر شہزاد انجم، شکیل غوث، ڈاکٹر جاوید حسیبی، ڈاکٹر الف ناظم اور معین شاداب کے نام شامل ہیں۔ 'حرف کار فاؤنڈیشن' کے سکریٹری اور پروگرام کے کنوینر اظہر اقبال نے 'جشن اظہر عنایتی' کے انعقاد کی ضرورت کو واضح کرتے ہوئے اظہر عنایتی کی ادبی اہمیت اور غزل کے فروغ میں ان کے رول کو اجاگر کیا۔ آرگنائزر کی جانب سے صاحب اعزاز کی خدمت میں یادگاری نشان اور شال پیش کی گئی۔ اس موقعے پر مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا، جس میں شعرا نے اپنے کلام پیش کیے اور سامعین سے داد و تحسین وصول کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مئی 2024

یومِ فارسی

نئی دھلی: انسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز اور مرکز تحقیقات فارسی نئی دہلی کے اشتراک سے مورخہ 14 مئی 2024 کو ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی کے سیمینار ہال

میں یومِ فارسی کے موقعے پر پروفیسر صبر جمشید ہوے والا سابق استاد جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی یاد میں فردوسی پر ایک ادبی جلسے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا آغاز فردوسی کی زندگی کے حوالے سے ایک مختصر ویڈیو کلپ کی نمائش کے ذریعے ہوا۔ بعد ازاں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کی ریسرچ اسکالر محترمہ نیتو بھاسکر نے فردوسی اور ایرانی ادب و ثقافت کے حوالے سے فارسی اشعار کی قرأت کر کے حکیم سخن فردوسی اور پروفیسر صبر جمشید ہوے والا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ انسٹی ٹیوٹ آف انڈو پرشین اسٹڈیز کے صدر اور پروگرام کے روح رواں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد پروفیسر سید اختر حسین نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔ انھوں نے پروفیسر صبر جمشید ہوے والا کی فارسی زبان و ادب کے حوالے سے ان کی بیش بہا خدمات کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انھوں نے پروفیسر ہوے والا جیسے مشفق استاد سے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ آپ نے پروفیسر صبر جمشید ہوے والا کی فارسی خدمات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ہندوستان میں فارسی زبان و ادب و ثقافت کے فروغ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور تا حیات فارسی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے کوشاں رہے۔ ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے مرکز تحقیقات کے سرپرست قہرمان سلیمانی نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ انھوں نے شاہنامۂ فردوسی پر سیر حاصل بحث کی اور اعتراف کیا کہ ہندوستان میں جو مقبولیت شاہنامہ کو حاصل ہوئی وہ اہمیت اور قدر و منزلت کسی دوسرے فارسی متن کے حصے میں نہیں آئی۔ انھوں نے مزید کہا کہ شاہنامہ ہند و ایران تعلقات میں ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ صرف ایران کا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا بھی گراں قدر ادبی سرمایہ ہے۔ ایران کلچر ہاؤس، نئی دہلی کے کاؤنسلر فریدالدین فرید عصر نے بھی اس موقعے پر سامعین سے خطاب کیا اور شاہنامہ کی عصری معنویت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ فردوسی نے شاہنامہ میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو ہماری زندگی کے لیے مشعل راہ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ شاہنامہ انسانی زندگی کا منشور ہے جس میں وطن داری، طرز معاشرت، اخلاقیات، انسانی حقوق وغیرہ کے مضامین بدرجۂ اتم ملتے ہیں۔ ہندوستان میں ایران کے سفیر عالی وقار ایرج الٰہی نے اس پروقار تقریب میں شرکت فرما کر اس ادبی محفل کو اعتبار بخشا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ہندوستان اور ایران کے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہند و ایران تعلقات ازمنہ قدیم سے ہی بڑے خوشگوار رہے ہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان ادبی اور ثقافتی تبادلے نے اس رشتے کو مزید مستحکم کیا ہے۔ انھوں نے اس جلسے میں موجود نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہند اور ایران کی فارسی کی مشترکہ وراثت کے پاسبان اور امین ہونے کے ناطے ان کا فرض ہے کہ وہ فارسی زبان و ادب کی نشر و اشاعت کے لیے کوشش کریں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 مئی 2024

ترجمہ نگاری تخلیقی ادب کے ہم پلہ نہیں ہوسکتی

نئی دھلی: عربی زبان کا شمار دنیا کی بڑی زبانوں میں ہوتا ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان کے بعد عربی دنیا کی

تیسری بڑی زبان ہے۔ اس زبان کے بولنے اور جاننے والے دنیا کے بہت بڑے حصہ میں پائے جاتے ہیں۔ عربی زبان کا سیکھنا اور اس کے لسانی نشیب و فراز کا جاننا قرآن کریم کو سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے، عربی زبان سے نابلد رہتے ہوئے ہم اللہ کی کتاب کو کامل طریقے سے کبھی نہیں سمجھ سکتے ہیں، اسی وجہ سے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر فرمانِ خداوندی ہے کہ ہم نے قرآن کو 'بلیغ عربی زبان' میں نازل کیا ہے، عربی زبان نے جدید ٹکنالوجی کے تقاضوں کو پورا کیا ہے اور اپنے دامن کو نئی تعبیرات سے آراستہ کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردن کی آل بیت یونیورسٹی کے استاذ اور ماہر لسانیات ڈاکٹر عدنان عبدالحمید کاظم نے شعبہ عربی دہلی یونیوسٹی میں منعقد ایک خصوصی لکچر کے دوران کیا۔ انھوں نے 'غیر ملکی زبانوں بالخصوص قرآن کی زبان ہونے کی حیثیت سے عربی زبان سیکھنے کی اہمیت و معنویت' کے موضوع پر اپنے لکچر کے دوران ترجمہ نگاری کو ایک زبان کے علمی ورثے اور تہذیبی و ثقافتی سرمایے کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا ایک موثر ذریعہ بتاتے ہوئے کہا کہ ترجمہ نگاری کبھی بھی تخلیقی

ادب کی ہم پلہ نہیں ہوسکتی۔ اصل متن کے معانی ومفاہیم کو تمام نشیب وفراز کے ساتھ دوسری زبان میں منتقل کرنا تقریباً ناممکن ہے، چنانچہ ناقدین نے ترجمہ کو ایک سعی نامشکور قرار دیا ہے۔ اس سے قبل مہمان خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر سید حسنین اختر نے کہا کہ ڈاکٹر عدنان عبدالحمید فرنچ، اسپینش، انگریزی اور ان کی مادری زبان عربی کے ماہر ہیں، نیز یہ ان زبانوں میں ترجمہ نگاری پر قدرت رکھتے ہیں اور ان کے متعدد تراجم منظرعام پر آچکے ہیں، مزید برآں قرآنی علوم بالخصوص قرآنی لسانیات پر ان کی گہری نگاہ ہے۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر مجیب اختر نے کی جب کہ شکریہ کے فرائض سابق صدر شعبہ پروفیسر نعیم الحسن اثر نے انجام دیے۔ شعبہ کے اسکالرز اور طلبا نے بڑی تعداد میں پروگرام میں شرکت کی اور فاضل مقرر کے لکچر کو بغور سنا اور سوال وجوابات سیشن میں بھرپور حصہ لیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 30 مئی 2024

فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ

نئی دھلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام 'آئین ہندوستان کے تحت تنوع کا انتظام' کے موضوع پر فخرالدین

علی احمد یادگاری خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ لیکچر کی صدارت سابق جج سپریم کورٹ جسٹس آفتاب عالم نے کی۔ صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا کہ سابق صدر جمہوریۂ ہند آنجہانی فخرالدین علی احمد کی سیاسی زندگی ملک وقوم کو متحد کرنے میں صرف ہوئی۔ اتحاد ان کے لیے ایک نعرہ نہیں تھا بلکہ انھوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ ملک کی ترقی کا یہی واحد راستہ ہوسکتا ہے۔ آج کے خطبے کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ملک کے آئین سازوں نے تنوع کی اہمیت اور خوبصورتی کو کس شدت سے محسوس کیا تھا۔ 'آئین ہندوستان کے تحت تنوع کا انتظام' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے چانکیہ نیشنل لا یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر فیضان مصطفیٰ نے کہا کہ غلطی سے لوگ اتحاد کو تنوع کی ضد سمجھ لیتے ہیں حالانکہ تنوع کے بغیر اتحاد نہیں ہوسکتا۔ ہمارے آئین کی تمہید میں لکھا گیا ہے کہ سب کو اپنی شناخت اور تشخص برقرار رکھنے کا پورا حق ہوگا۔ یہ ہمارے آئین کا مزاج نہیں ہے کہ سب کو ایک دوسرے میں ضم کردیا جائے۔ ہمارا آئین جس اصول پر بنا ہے اس کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں جیسے سلاد کی پلیٹ، جس میں ہر چیز اپنی شناخت کے ساتھ موجود ہے لیکن پلیٹ ایک ہی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی اہم سرگرمی ہے جس کے لیے ہم موضوع اور شخصیت دونوں کا انتخاب بہت غور وفکر کے بعد کرتے ہیں۔ پروفیسر فیضان مصطفیٰ سے ہم سب واقف ہیں وہ کسی بھی موضوع پر بہت ذمے داری سے اپنی رائے دیتے ہیں۔ ان کی نظر اکثر ان گوشوں کی طرف جاتی ہے جہاں سے لوگ عموماً سرسری انداز سے گزر جاتے ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے ہماری دعوت قبول کی اور ہم سب کو استفادے کا موقع دیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ سال میں دو یادگاری خطبوں کا اہتمام کرتا ہے، ایک فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ اور دوسرا بیگم عابدہ احمد یادگاری خطبہ۔ ان دونوں خطبوں میں ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ان موضوعات کا انتخاب کیا جائے جو عام طور سے موضوع بحث نہیں بنتے لیکن جن کی اہمیت مسلم ہے۔ آج کے یادگاری خطبے کا موضوع اور خطیب دونوں غیرمعمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر فیضان مصطفیٰ کی گفتگو سے ہماری معلومات میں بہت اضافہ ہوا اور جب یہ خطبہ شائع ہوگا تو استفادے کا دائرہ اور بھی پھیلے گا۔ اس موقعے پر علم وثقافت سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے علاوہ طلبہ و طالبات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 مئی 2024

دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں ریسرچ اسکالر پروگرام

نئی دھلی: شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی میں منعقدہ ہفتہ واری ریسرچ اسکالر پروگرام میں شعبہ کے صدر پروفیسر حسنین اختر نے صدارت کرتے ہوئے کہا کہ متحدہ عرب امارات سمیت پورے عرب ممالک کی ادبی تحریک میں ہندوستانیوں کا اہم کردار رہا ہے، یو اے ای میں ہندوستان اور پڑوسی ممالک کے افراد کثیر تعداد میں بستے ہیں اور انھوں نے وہاں کے سماجی وسیاسی حالات کو متاثر کیا ہے، چنانچہ اس کا اثر وہاں کے عربی ادب میں بھی نمایاں ہے۔ غور طلب ہے کہ متحدہ عرب امارات میں تقریباً 3.5 ملین ہندوستانی شہری رہتے ہیں، اس اعتبار سے یہ دنیا میں کہیں بھی ہندوستانی شہریوں کی سب سے بڑی آبادی مانی جاتی ہے۔ یو اے ای کی سرزمین میں ہندوستانی زبان وتہذیب کے تحفظ میں یہاں کے عوام کا کردار نہایت اہم ہے اور متحدہ عرب امارات میں ہندوستانی زبان وتہذیب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ غور طلب ہے کہ ریسرچ اسکالرز کی تحقیقی صلاحیتوں کی رہبری کرنے، تحقیقی مقالے کو بہتر پیرائے میں ڈھالنے اور پیپر پرزینٹیشن کے لیے ٹریننگ دینے کے مقصد سے شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی ویکلی ریسرچ اسکالرز پیپر پرزینٹیشن پروگرام کراتا ہے۔ آج کے اس اکیڈمک پروگرام میں شعبہ کے پی ایچ ڈی اسکالر امتیاز احمد نے 'متحدہ عرب امارات کی عربی کہانیوں میں سماجی اور قومی ایشوز اور تارکین وطن کے مسائل' پر شعبہ کے سابق صدر پروفیسر نعیم الحسن و دیگر اساتذہ ڈاکٹر مجیب اختر، ڈاکٹر محمد اکرم، ڈاکٹر اصغر محمود کی موجودگی میں اپنا مقالہ پیش کیا اور سامعین کے سوالات کے جواب دیے۔ ریسرچ اسکالر عزیز الرحمٰن نے پروگرام کی نظامت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 مئی 2024

غالب اکیڈمی کی نثری نشست

نئی دھلی: گزشتہ روز غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک نثری نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو اور ہندی کے

ادیبوں اور افسانہ نگاروں نے شرکت کی۔ مشہور افسانہ نگار عشرت ظہیر مہمان خصوصی تھے۔ نشست میں چشمہ فاروقی، گولڈی گیت کار، نیلم باورامن، سیما کوشک، ذاکر فیضی، سعدیہ رحمان، رخشندہ روحی، نعیمہ جعفری اور عشرت ظہیر نے اپنے افسانے پیش کیے۔ نارنگ ساقی نے جوش ملیح آبادی کے لطیفے سنائے۔ شاداب تبسم نے کوثر چاندی پوری کی ناول نگاری پر ایک مقالہ پیش کیا۔ خورشید حیات نے اپنی صدارتی تقریر میں پڑھے گئے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جنوں کی تخلیقی کیفیتوں کا نام نعیمہ جعفری کے افسانے ہیں۔ نعیمہ جعفری کی داستان رنگ زندگی کی کتھا، کہانی، ماورائے طبیعیاتی دور میں سفر کرنے کا ہنر جانتی ہے۔ چشمہ فاروقی کا افسانہ 'امرلتن' مشرقی تہذیب کے آنگن کی کہانی ہے۔ گولڈی کی کہانی میں آج کے کردار بولتے دکھائی دیتے ہیں۔ سعدیہ رحمان کا افسانہ 'میٹھی مسکان' میں محبت کے بدلتے محاورے سماجی طبقات برہمن، پنڈت اور شودر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ذاکر فیضی کی کہانی 'اسٹوری میں دم نہیں' اپنے عنوان کی طرح ان کے باطنی اور داخلی کیفیات کا اشاریہ ہے۔ ڈاکٹر رخشندہ روحی ہندی اور اردو کی معروف ادیبہ ہیں۔ انھوں نے افسانہ 'آرزومندی' پیش کیا۔ ان کی کہانی میں روح عصر آج کی عورت کے نئے راگ رنگ کی صورت لیے جلوہ گر ہوئی ہے۔ نیلم باورامن نے 'مون پریم' کے عنوان سے ایک اچھی کہانی پیش کی۔ سیما کوشک نے دیر آید درست آید کے عنوان سے جو کہانی پڑھی اس میں وہ روایتی شعور کی عکاسی کرنے میں کامیاب رہیں۔ عشرت ظہیر اردو افسانے کے اہم دستخط ہیں، افسانوں کی اعلیٰ سنہری روایت سے اپنا رشتہ قائم کرتے ہوئے انھوں نے ایک افسانہ 'مغالطہ' پیش کیا۔ افسانہ سننے اور مکالمہ قائم کرنے کے بعد جب کہانی پسند سامعین ہال سے باہر نکل رہے تھے تو انھیں شہر جاگتا سا لگا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید اقبال نے تمام افسانہ نگاروں کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ وقت مقررہ پر دہلی کے دور دراز علاقوں سے شدید گرمی میں آنا اور اپنے فن کا مظاہرہ کرنا بہت بڑی بات ہے۔ پروین ویاس نے پڑھی گئی کہانیوں پر تبصرہ کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے خصوصی شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 مئی 2024

اٹھارہویں محفوظ الرحمٰن میموریل لیکچر کا انعقاد

نئی دھلی: 'اردو زبان اور اس کے رسم الخط کو فروغ دینے میں اردو صحافت نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اردو زبان ہمیشہ صحافت کے شانے پر زندہ رہی ہے اور انھی ادیبوں کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے جنھوں نے اخبارات وجرائد کے ذریعے عوام سے مکالمہ قائم کیا ہے۔' ان خیالات کا اظہار آج یہاں سینئر صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی نے ''فروغ اردو میں

صحافت کے کردار'' کے موضوع پر اٹھارہواں محفوظ الرحمٰن میموریل لیکچر دیتے ہوئے کیا۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام کانسٹی ٹیوشن کلب میں منعقدہ اس تقریب کی صدارت پروفیسر عبدالحق نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے شرکت کی۔ انھیں اس موقعے پر خصوصی نشان یادگار بھی پیش کیا گیا۔ ممتاز دانشور پروفیسر اختر الواسع اور ڈاکٹر سید فاروق، ڈاکٹر سلیم قدوائی نے بھی اس تقریب کو خطاب کیا۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے بانی ڈاکٹر سید احمد خاں نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ صحافی محفوظ الرحمٰن مرحوم کی سرپرستی میں اردو ڈے کی تحریک کا آغاز ہوا، یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ وہ درویش صفت صحافی تھے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ ڈاکٹر سید احمد خاں کو شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے صحافی محفوظ الرحمٰن مرحوم کی قومی و ملی خدمات کے اعتراف میں یادگاری لیکچر کا اہتمام کیا۔ آج کے دور میں کسی کے دنیا سے جانے کے بعد لوگ بہت جلدی بھول جاتے ہیں کہ ہمارے درمیان کوئی تھا لیکن سید احمد خاں آج بھی محفوظ الرحمٰن کو یاد کر رہے ہیں یہ بڑی قابل تعریف بات ہے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مئی 2024

یادِ ستیش فگار

مراد آباد: مرکز اردو ادب و تحقیق مراد آباد کے زیر اہتمام معروف شاعر ستیش کمار گپتا 'فگار' مرادآبادی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ایک محفل مذاکرہ بعنوان 'یادِ ستیش فگار' کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروگرام کے کنوینر و ناظم ڈاکٹر محمد آصف حسین نے فگار مرادآبادی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے ایک پرمغز مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ فگار صاحب مرادآباد کی ادبی تاریخ میں پہلے ہندو شاعر تھے جن کا نعتیہ مجموعہ 'کوثر مدحت' شائع ہوا۔ صدرِ محفل جناب منصور عثمانی نے 'فگار صاحب کی شاعری کا آغاز' کے عنوان پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ ایک موقعے پر کچھ شاعروں کے درمیان کسی مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی، فگار صاحب نے اس میں مداخلت کی تو انھیں یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ آپ شاعر نہیں ہیں لہٰذا آپ کس طرح اپنی رائے دے سکتے ہیں؟ بس اس جملے نے ہی فگار صاحب کی دنیا بدل کر رکھ دی۔ فگار صاحب کچھ دن کے لیے محفلوں سے غائب ہو گئے اور سیدھے شہباز امروہوی کی خدمت میں پہنچے اور علم عروض پر مکمل دسترس حاصل کرنے کے بعد جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو فکر جمیل، خواب پریشاں، عکس جمال، کوثر مدحت اور خلوت کے علاوہ ندی میں کنک اور بھیگے نین جیسے شعری مجموعے تخلیق کر کے اردو ادب کو مالا مال کیا۔ یوگیندر ورما ویوم نے کہا کہ فگار صاحب کا جانا نہ صرف اردو ادب کا نقصان ہے بلکہ ہمارا ادبی سائے سے محروم ہو جانا ہے۔ ڈاکٹر منوج رستوگی نے کہا کہ حالانکہ عمر کے آخری ایام میں انھوں نے تجل جیسی نئی صنف سخن میں نہ صرف طبع آزمائی کی بلکہ دو مجموعے بھی شائع کیے۔ اس کے باوجود مجھے یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ ان کا اصل میدان غزل ہی تھا۔ رگھوراج سنگھ نش چل نے کہا کہ فگار صاحب میرے قریبی دوست تھے، انھوں نے اپنی ساری زندگی اردو ادب کی خدمت میں صرف کی۔ سید محمد ہاشم قدوسی نے کہا کہ فگار صاحب سادہ لوح اور صاف گو انسان تھے۔ تصنع اور تکلف نہ ان کی زندگی میں ہے اور نہ کلام میں۔ جو کچھ کہتے تھے صاف صاف کہتے تھے۔ معروف سیاسی و سماجی شخصیت اسد مولائی نے کہا کہ فگار صاحب میرے والد قبلہ راحت مولائی صاحب کے پاس تشریف لاتے اور گھنٹوں گھنٹوں شعر و ادب کے حوالے سے گفتگو ہوتی تھی۔ ان کی رحلت یقینی طور پر مرادآباد کے ادبی حلقوں میں ایک

بڑا خلا ہے۔ پروگرام کے اختتام پر مرکز اردو ادب و تحقیق کے بانی و ناظم ڈاکٹر محمد آصف حسین نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 مئی 2024

بانگ درا کے سو سال

نئی دہلی: اقبال اکیڈمی انڈیا نئی دہلی کی جانب سے 'بانگ درا کے سو سال' پر تسمیہ آڈیٹوریم، جامعہ نگر اوکھلا میں مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ مذاکرے کی صدارت

ڈاکٹر سید فاروق نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کلام اقبال کی معنویت پر اظہار کیا کہ شاعر لفظ کے استعمال میں کتنا محتاط ہوتا ہے۔ اقبال نے 'خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں' کے مصرعے میں سادہ دل کی جگہ معصوم نہیں استعمال کیا، کیونکہ معصوم کا لفظ صرف تین بندوں پر، یعنی نبی، مجذوب اور بچہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پروفیسر عبدالحق نے جلسے کی کارروائی کی ذمے داری ادا کی۔ انھوں نے کلام اقبال کے فکر و پیام پر تفصیلی گفتگو کی۔ اقبال کے پہلے مجموعہ اردو کلام 'بانگ درا کے سو سال' ہونے پر اس کی اہمیت اور مقبولیت کے بارے میں بتایا۔ اقبال اکادمی کے صدر ڈاکٹر سید ظفر محمود نے اقبال کی بانگ درا کی چند مقبول نظموں کے فکر و پیام کی اہمیت کو بتایا۔ پروفیسر توقیر احمد خان نے اقبال کے بانگ درا کی اشاعت کے حوالے سے بڑی معلوماتی گفتگو کی۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنی گفتگو میں اس بات پر توجہ دلائی، کہ ہمیں اپنے علمی وتہذیبی اثاثے کی قدر اور تحفظ کرنا چاہیے۔ قومی کونسل کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے اقبال کے فلسفہ کو انسانیت کی فلاسفی بتایا، جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ پروفیسر اختر حسین نے اپنی گفتگو میں معروف اسکالر خوشونت سنگھ کا حوالہ دیتے ہوئے اقبال کو دانشورانہ فکر کا شاعر بتایا جو دنیائے ادب میں منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ حقانی القاسمی، احسن عابد، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین، ڈاکٹر شکیل اختر، پروفیسر ابوبکر عباد، ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر سرفراز جاوید، ڈاکٹر شاہد نے بھی اظہار خیال کیا۔ نوجوان طالب علم انیس نے اپنا مضمون پیش کیا۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مئی 2024

بہ یاد ثاقب بریلوی واکشے کمار حلقہ تشنگان ادب کی 565 ویں نشست کا انعقاد

نئی دہلی: بہ یاد ثاقب بریلوی واکشے کمار حلقہ تشنگان ادب کی 565 ویں نشست 27 مئی کو بابر روڈ منڈی ہاؤس

پر واقع این ڈی ایم سی کمیونٹی سینٹر میں عبدالحمید ساز دہلوی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ نظامت سکریٹری حلقہ تشنگان ادب دھرم ویر دھیر سیماب سلطانپوری جی نے فرمائی۔ حلقہ تشنگان ادب کے پریس سکریٹری معروف ادیب وصحافی حبیب سیفی کے بیان کے مطابق میزبانی کا فریضہ دہلی سرکار میں اپنی خدمات میں انجام دے چکی ادبی ذوق ومزاج کی حامل خاتون کلاس ون افسر محترمہ منیشا سکینہ وامت کمار سکینہ نے ادا کیا۔ نشست کے آغاز پر آنجہانی ثاقب بریلوی واکشے کمار کی تصویر پر گلہائے عقیدت پیش کیے گئے۔ مہمانان کی حیثیت سے خرم نور، شعیب رضا فاطمی، رحمٰن منصور، شکیل شفائی اور ڈاکٹر لکشمی شنکر واجپئی، غیاث الدین غیاث نے شرکت کی۔ سیماب سلطانپوری نے کہا کہ نصف صدی سے زیادہ کے طویل عرصہ سے بلا تعطل یہ گھرانہ اردو شعر و ادب کی خدمات اور نشست کا اہتمام کرتا آرہا ہے، یہ اصل محبت ہے شعر و ادب سے، جس کی وجہ سے ثاقب بریلوی کی چوتھی نسل میں شاعری کے لکھنے پڑھنے اور سمجھنے والے پھل پھول رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی اردو زبان مادری زبان نہیں اس کے باوجود اردو سے بے انتہا لگاؤ اور دل میں شعر و ادب کا جذبہ رکھتے ہیں۔ آنجہانی اکشے کمار کے کلام سے نشست کی شروعات ہوئی۔ اس موقعے پر شعرا اپنی نظمیں کو بتائیں پیش کیں۔

پریس ریلیز: حبیب سیفی، دہلی، 27 مئی 2024

رابندر ناتھ ٹیگور: فطرت، ماحولیات

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کے زیر اہتمام رابندر ناتھ ٹیگور کے یوم پیدائش کے موقعے پر 'رابندر ناتھ ٹیگور: فطرت، ماحولیات' کے موضوع پر ایک ادبی فورم پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت مصنفہ ملا شری لال

نے کی اور پریاگ شکلا (ہندی) اجے کمار مشرا (سنسکرت) اور شہزاد انجم (اردو) نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کے سرینواس راؤ نے تمام شرکا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ رابندر ناتھ ٹیگور کا بیسویں صدی کے ثقافتی منظرنامے پر بہت بڑا اثر تھا۔ ان کی نظمیں جو فطرت کے بہت قریب تھیں، انھیں دنیا بھر میں شناخت حاصل ہوئی۔ پریاگ شکلا نے کہا کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے نہ صرف اپنی نظموں میں بلکہ اپنے ناولوں، ڈراموں، پینٹنگ. وغیرہ میں بھی فطرت کی بہت سی شکلوں کو اجاگر کیا ہے۔ آج ہم فطرت کے بغیر بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔ اجے کمار مشرا نے کہا کہ رابندر ناتھ ٹیگور رومانویت کو ہندوستانی تناظر میں پیش کرتے ہیں اور انسانوں کے ساتھ فطرت کے کثیر جہتی رشتے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ فطرت کے تئیں ان کی انمول شراکت کو جامع انداز میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اردو کے معروف ادیب شہزاد انجم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رابندر ناتھ ٹیگور کی تیرہ کتابوں کے اردو ترجمے کے دوران ہونے والے تجربات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے فطرت کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی تخلیقات لکھیں اور ان کی تحریر پر اس کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے ملا شری لال نے کہا کہ فطرت کے حوالے سے رابندر ناتھ ٹیگور کے الفاظ آج بھی بہت متاثر کن ہیں۔ انھوں نے فطرت پر نہ صرف لکھا بلکہ اسے اپنی زندگی میں نافذ بھی کیا۔ انھوں نے شانتی نکیتن اور سری نکیتن کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے یہ سب صرف طلبہ کو فطرت کے قریب لانے کے لیے تصور کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 مئی 2024

ادبی نشست

نئی دہلی: دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کرتے ہوئے عرب سینٹر افلو حیدرآباد کے سابق ڈین پروفیسر محمد اقبال حسین نے کہا کہ عربی زبان اپنی لسانی وسعت اور ادبی

تنوع کی بنا پر ہر دور میں عالمی ادبیات کا اہم حصہ رہی ہے۔ پروفیسر اقبال حسین نے عربی اسکالروں سے عربی زبان و ادب کے حقیقی مراجع و مصادر کے مطالعے کی نصیحت کرتے ہوئے عربی ناول کو کثرت سے پڑھنے کی تاکید کی تاکہ زبان میں شستگی و شگفتگی پیدا ہوسکے۔ پروفیسر فوزان احمد شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے خطاب کرتے ہوئے ریسرچ کے اساسی اصول کی جانب ریسرچ اسکالروں کی رہبری کی اور تحقیق کے عمل میں اسکالروں کے خلوص اور موضوع سے دلچسپی کو کلیدی حیثیت قرار دیا۔ پروفیسر محمد قطب الدین سینٹر برائے عربک وافریقن اسٹڈیز جے این یو نے ریسرچ کے عمل میں تسلسل کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی میدان میں ریسرچ کرنے والا طالب علم تاحیات اسکالر ہی رہتا ہے اور تحقیق کا عمل بھی منقطع نہیں ہوتا ہے۔ اس سے قبل پروگرام کے آغاز میں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر سید حسنین اختر نے کہا کہ شعبہ عربی اپنے اسکالروں کی تحقیقی صلاحیتوں کو صحیح نہج دینے کے لیے اس نوعیت کے پروگرام کراتا رہتا ہے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر محمد اکرم نے کی اور ڈاکٹر اصغر محمود نے شکریہ ادا کیا۔ حامد مختار نے اپنی پی ایچ ڈی کے فائل پرزینٹیشن کے دوران ممتحن کی حیثیت سے شریک پروفیسر محمد اقبال حسین کے سوالات کے جوابات دیے۔ حامد مختار نے شام کی مشہور ناول نگار 'کولیت الخوری کی ناول نگاری میں خدمات' کے موضوع پر شعبہ کے استاذ ڈاکٹر مجیب اختر کی نگرانی میں اپنا ریسرچ مکمل کیا۔ وائیوا کی نشست کی نظامت ڈاکٹر مجیب اختر نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مئی 2024

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر سے بچوں کے ادیبوں کی ملاقات

نئی دهلی: آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی نئی دہلی و بچپن واٹس ایپ گروپ کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی (حکومت ہند) کے دفتر میں ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال کا گلدستہ پیش کرکے استقبال کیا گیا۔

بچوں کے ادب میں خاص دلچسپی رکھنے والے ماہر اطفال سراج عظیم، ادیب وصحافی حبیب سیفی، ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، نورالسلام رحمانی کے علاوہ چشمہ فاروقی، رقیہ، رابعہ مظفر پوری نے وفد کی صورت میں دفتر قومی کونسل جسولہ نئی دہلی پہنچ کر ڈائرکٹر سے ملاقات کی۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے بچوں کے ادیبوں کا تعاون ملنے کے بعد موجودہ ادبی صورت حال میں تبدیلی لانے کی بات کہی۔ آپ نے کہا بچے کیسا ادب چاہتے ہیں یہ بچے خود بتائیں گے۔ ہم ایسے بچوں کی تلاش میں ہیں جو قلمکار بننا چاہتے ہیں، بچوں کو لکھنے کے مواقع دینے کی کوششیں کی جائیں گی تو مثبت نتیجہ دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ جلد ہی بچوں کے لیے کسی ایک پروگرام کا خاکہ تیار کرکے ادب اطفال کی تقریب منعقد کی جائے گی۔ یہ سب گرچہ کچھ دنوں بعد ہوسکے گا، مگر میرا خیال ہے ابھی کو اردو زبان میں بچوں کے لیے تعمیری ادب تخلیق کرنے کی ضرورت ہے۔ وفد کی سرپرستی کر رہے سراج عظیم نے کہا کہ ڈاکٹر شمس اقبال صاحب چونکہ بچوں کے لیے ملک بھر کے معروف ادارے نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا سے وابستہ رہے ہیں اس لیے ان سے بچوں کے ادب کی بنیادی ضرورتوں کو پورے کیے جانے کی امید ہے۔ سراج عظیم نے مزید کہا کہ بچپن گروپ نے 30 سے زیادہ اردو قلمکار بنائے ہیں، ان کی اصلاح اور لکھنے کے سلسلے میں ہر قسم کا تعاون انھیں دیا گیا، انھیں بھی مواقع دیے جائیں گے تو خوشی ہوگی۔ حبیب سیفی نے کہا کہ افسوس کچھ قلمکار تخلیقی سطح پر نیا لکھنے کے بجائے خود کو دہرانے لگے ہیں۔ ادق و بوجھل لفظیات سے بھی بچے ذہن پر بوجھ تصور کرتے ہیں اس لیے آسان زبان استعمال میں لاکر بچوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 9 مئی 2024

اتر پردیش

ہندوستانی زبانیں اور ہندوستان بحیثیت ایک لسانی خطہ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبہ لسانیات کے چیئرمین اور لنگوئسٹک سوسائٹی آف انڈیا کے صدر پروفیسر ایم جے وارثی نے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز (سی آئی آئی ایل)، میسور، وزارت تعلیم، حکومت ہند کے زیراہتمام 'ہندوستانی زبانیں اور ہندوستان بحیثیت ایک لسانی خطہ' موضوع پر منعقدہ ایک کانفرنس میں خطبہ دیا۔ ہندوستان کے لسانی تنوع اور مختلف ہندوستانی زبانوں کے کنبوں کی مشترکہ لسانی خصوصیات پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر وارثی نے کہا کہ لسانی اعتبار سے ہندوستان دنیا کے متنوع ترین ممالک میں سے ایک ہے۔ ہندوستان کی متنوع لسانی ساخت میں بنیادی طور پر ہند آریائی، دراوڈین، آسٹرو۔ایشیائی اور تبتی برمن زبانوں کے کنبے شامل ہیں۔ ان زبانوں کی ایک طویل اور باہم جڑی ہوئی تاریخ ہے اور ان کی متعدد لسانی خصوصیات مشترک ہیں۔ لسانی صفات کا اشتراک ہندوستان کو ایک منفرد لسانی خطہ بناتا ہے۔ پروفیسر وارثی نے کہا کہ ہندوستانی آئین 22 بڑی زبانوں کو تسلیم کرتا ہے جیسا کہ آئین کے آٹھویں شیڈول میں مذکور ہے، جب کہ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ہندوستان کی 24 ادبی زبانوں میں ملک کے اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈز دیے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر سال 35 ہندوستانی زبانوں میں 3592 اخبارات اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہندوستانی اسکولوں میں 69 سے 72 زبانیں پڑھائی جاتی ہیں اور ریڈیو نیٹ ورک 146 زبانوں اور بولیوں میں پروگرام نشر کرتا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 4 جون 2024

نیا دور کی ادبی خدمات

میرٹھ: آج 75 برس سے زیادہ کا طویل عرصہ گزر چکا ہے اور نیا دور آج بھی عمدہ کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ رسالہ اردو کی آواز ہے اور ایسی آواز جس نے امن، دوستی، بھائی چارہ، معیاری ادب کو فروغ دیا ہے۔ تہذیب کی حفاظت کے لیے 'نیا دور' ہماری نمائندگی کرتا رہا ہے۔ یہ الفاظ تھے جرمنی سے معروف ادیب عارف نقوی کے جو شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز انجمن (آیوسا) کے زیراہتمام منعقد 'نیا دور کی

ادبی خدمات' کے موضوع پر اپنی صدارتی تقریر کے دوران ادا کر رہے تھے۔ پروگرام کی سرپرستی صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ مہمانانِ کے بطور ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، عاصم رضا، لکھنؤ، معروف افسانہ نگار ڈاکٹر اطہر مسعود نے آن لائن شرکت کی۔ مقالہ نگار کے بطور ڈاکٹر موسی رضا، لکھنؤ، عرفان عارف جموں اور شاہ زمن، (میرٹھ) نے شرکت کی۔ جب کہ مقرر کے بطور ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین شریک رہیں۔ تعارف ڈاکٹر ارشاد سیانوی، شکریہ سیدہ مریم الٰہی اور نظامت کے فرائض ریسرچ اسکالر علمہ نصیب نے انجام دیے۔ موضوع کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے کہا کہ 'نیا دور' ایک ایسا رسالہ ہے جس نے ابتدا سے ہی نسلوں کی آبیاری کا منفرد کرنامہ انجام دیا ہے اور آج بھی نئی نسل اس رسالے کے ذریعے تربیت پا رہی ہے۔ اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ 'نیا دور' ایسا رسالہ ہے جو اردو میں اپنی انوکھی نوعیت کا حامل ہے۔ 75 سال پورے ہونے پر اس میگزین کے تمام مدیران کو ایوسا کی جانب سے ہم مبارکباد دیتے ہیں۔ نیا دور ایک دستاویز بھی ہے جس نے جدیدیت، مابعد جدیدیت اور ترقی پسندی کے عہد میں اپنی خدمات انجام دیں۔ پروگرام میں پڑھے گئے مقالوں میں شاہ زمن نے 'اکیسویں صدی میں نیا دور کی ادبی خدمات'، ڈاکٹر موسیٰ رضا نے 'ادب کا بیش قیمت سرمایہ: نیا دور' اور عرفان عارف نے نیا دور کے تعلق سے اظہار کرتے ہوئے کہا کہ 'نیا دور' نئے زمانے کی آواز ہے۔ ہندوستان کے شہر تہذیب لکھنؤ سے نکلنے والے رسالے کو سرکار نے بخوبی عوام تک پہنچایا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ نیا دور 1955 میں منظر عام پر آیا تھا۔ ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں ان حضرات کو جنھوں نے 1955 سے 2011 تک کے شمارے دیکھے اور پڑھے ہیں اور ان پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ معروف ادیب اور سابق ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن، لکھنؤ و مدیر نیا دور نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ علی جواد زیدی صاحب نے جو بیج بویا تھا اس کی آبیاری بہت سے مدیران نے کی۔ رسالے کی بقا کے لیے اہل قلم کی ضرورت درکار ہے۔ ایوسا کی صدر پروفیسر ریشما پروین نے کہا کہ نئے دور نے بہت سی نسلوں کی تربیت کی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ نئے دور کے مدیران نے بھی نیا دور سے بہت سے اصولوں کو اخذ کیا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 مئی 2024

بہار

علمی و ادبی وراثت کا تحفظ اور فروغ ادیبوں کا اہم فریضہ: ڈاکٹر عطا عابدی

پٹنہ: علمی اور ادبی وراثت کی اہمیت سے ہم سب واقف ہیں اور اس سے بہتر وراثت کیا ہوگی؟ لہٰذا اس کا تحفظ اور اسے فروغ دینا اور اس میں دلچسپی لینا ہم سب اردو ادیبوں کا فریضہ ہے۔ یہ باتیں معروف ادیب وشاعر اور ارباب قلم کے صدر ڈاکٹر عطا عابدی نے دو کتابوں کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہیں۔ ادبی تنظیم ارباب قلم، پٹنہ کے زیر اہتمام ایک محفل کا اہتمام تنظیم کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر توقیر عالم توقیر کی رہائش گاہ، واقع نیو عظیم آباد کالونی میں 19 مئی کو کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عطا عابدی نے اظہار خیال کرتے ہوئے مزید کہا کہ ہم کتاب سے دلچسپی نہیں لیں گے تو ہم اپنے آپ کو بھی بھول جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے لوگ اپنی کتابیں بھی نہیں چھپوا پاتے۔ ایسے بھی ہیں جن کو اللہ نے بہت استطاعت دی ہوتی ہے لیکن وہ اپنی کتاب اپنے پیسے سے چھپوانا اچھا نہیں سمجھتے۔ ایسے میں کوئی شخص جو اپنے والدین کی کتابیں چھاپتا ہو اور ان کی چیزیں محفوظ کرتا ہو تو یہ لائق تحسین عمل ہے۔ اس حوالے سے دو مثالیں ہمارے سامنے ہیں ایک دہلی میں فیروز مظفر کی جو مظفر حنفی کے صاحب زادے ہیں۔ انھوں نے اپنے والد کی کئی کتابیں شائع کیں اور نئی کتابیں بھی منظر عام پر لائیں۔ دوسری طرف بہار کی عظیم شخصیت نادم بلخی جو کثیر التصنیف ہیں اور درجنوں کتابیں جو ان کی نایاب تھیں، کو ان کے صاحب زادے مظفر بلخی نے دوبارہ شائع کیا۔ ایک رفعت گلستان سخن تین جلدوں میں اور دو جلد میں نکہت غزلستان جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتابیں ہزاروں صفحات پر مبنی ہیں جن میں نادم بلخی کی درجنوں کتابیں شامل ہوگئی ہیں۔ یہ ایک اہم کام ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے یہاں بہت سی علمی و ادبی کتابیں محفوظ تو ہیں لیکن عوام تک نہیں پہنچ پائی ہیں انھیں منظر عام پر لانے کے لیے ہمیں غور کرنا چاہیے۔ پروگرام کی صدارت شاعر سید یاور حسین نے کی۔

رپورٹ: ڈاکٹر توقیر عالم توقیر، جنرل سکریٹری ارباب قلم، پٹنہ 23 مئی 2024

خاکہ برائے تحقیق سمینار

بھاگلپور: پی جی اردو ڈپارٹمنٹ، مونگیر یونیورسٹی، مونگیر کے زیر اہتمام ایک سمینار بعنوان خاکہ برائے تحقیق منعقد ہوا جس میں خاکہ برائے تحقیق بندی اور دیگر

تفصیلات پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ اس میٹنگ کی صدارت شعبۂ ہذا کے صدر ڈاکٹر شاہد رضا جمال نے کی جب کہ معاون کار کے طور پر ڈاکٹر ذکیہ تسنیم موجود تھیں۔ سمینار برائے خاکہ کی ترتیب و تنظیم میں جن اسکالروں نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ عبدالسلام، تسنیم کوثر، شہاب الدین، نجم الدین، جیمی، رضوان احمد خان، واجد علی، مریم، شگفتہ جبیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سمینار ہذا میں جناب عبدالسلام نے اپنا پرچہ بہ عنوان 'منٹو اور عصمت کے خاکوں کا تقابلی مطالعہ' پیش کیا۔ تسنیم کوثر نے خانقاہ شہبازیہ کی ادبی خدمات کو موضوع بنایا جب کہ شگفتہ جبیں نے منٹو اور موپاساں کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ اس موقعے پر محمد جیمی نے اکیسویں صدی کے افسانوں کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی جب کہ نجم الدین نے خانقاہ رحمانی اور ولی رحمانی کی ادبی اور لسانی اور فلاحی خدمات کو موضوع بحث بنایا۔ اس موقعے پر شعبہ کے ان طلبہ و طالبات کو جنھوں نے شعبے کا نام روشن کیا ان کی عزت افزائی کی گئی۔ ان میں محمد افضل برائے سماجی خدمات، احسان اللہ اور پروین برائے اسپورٹس، محمد جمی اور منیش برائے سمینار وغیرہ کو میڈل دے کر سرفراز کیا گیا۔ اس موقعے پر سعد اللہ، ابھیشک، گلشاد، ترنم وغیرہ موجود تھے۔ اظہار تشکر تسنیم کوثر نے کیا۔

پریس ریلیز: محمد جیمی، مونگیر یونیورسٹی، بہار

اعزاز و اکرام

جینی ایرپن بیک

برلن: جرمن مصنفہ جینی ایرپن بیک اور ان کی کتاب 'کیروس' کے مترجم مائیکل ہاف مین نے فکشن کے زمرے

میں مشترکہ طور پر رواں برس کا انٹرنیشنل بکر پرائز جیت لیا ہے۔ اس معروف برطانوی ادبی ایوارڈ کے لیے اس سال دنیا بھر سے مقابلے میں 149 کتابیں شامل کی گئی تھیں جن میں سے جینی ایرپن کے ناول 'کیروس' کو بوکر پرائز کے لیے منتخب کیا گیا۔ جینی کا ناول کیروس ایک 19 سالہ طالبہ اور 50 کی دہائی کے ایک شادی شدہ شخص کے درمیان ہونے والی تباہ کن محبت کی کہانی پر مبنی ہے جن کی ملاقات 1986 کے آس پاس مشرقی برلن میں ایک بس میں ہوتی ہے۔ ان دونوں کرداروں کا تعلق جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک (کمیونسٹ جرمنی) کے بکھرے ہوئے آئیڈیلزم اور پورے سیاسی نظام پر طنز سے عبارت ہے۔ ایوارڈ کا اعلان ہونے کے بعد مصنفہ ایرپن بیک نے کہا کہ انھیں امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کے سامنے ریاستی نگرانی اور جبر کے علاوہ سابقہ مشرقی جرمنی کے دیگر پہلوؤں کو سامنے لائے گی اور اس وقت دنیا میں جو ریاستی جبر کا نظام ہے اس کے خلاف توانا آواز بنے گی۔ واضح رہے کہ سابقہ مشرقی جرمنی، جسے جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک کہا جاتا تھا کی کمیونسٹ حکومت کے دوران 'اشتاسی' نام کا ایک ریاستی سیکورٹی ادارہ تھا، جو لوگوں کی نگرانی کرنے اور ان پر جبر کے لیے بدنام تھا اور اس کتاب میں وہی دور پیش کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مئی 2024

ممتاز احمد

دیوبند: سماجی تنظیم نظر فاؤنڈیشن کی جانب سے دیوبند کے سینئر صحافی ممتاز احمد کو ہندی یوم صحافت کے موقعے پر ان کی صحافتی خدمات کے اعتراف میں شہر کے معروف فوٹو جرنلسٹ شہزاد عثمانی مرحوم کی یاد میں ایک پروگرام کا انعقاد کر کے 'شہزاد عثمانی' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر شہزاد عثمانی کے بڑے بھائی اور نظر فاؤنڈیشن کے چیئرمین نجم عثمانی نے کہا کہ دیوبند کے سینئر صحافی ممتاز احمد طویل عرصہ سے صحافت کے ذریعے عوام کے مسائل کو اجاگر کر کے انھیں حل کرانے کی جدوجہد کرتے آرہے ہیں، ممتاز احمد نے ہمیشہ بدعنوانیوں اور مسائل پر بے باک انداز میں لکھا ہے، نجم عثمانی نے کہا کہ ماسٹر ممتاز احمد نے بااثر شخصیات سے متعلق بھی سچائی بیان کرنے میں کبھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے صحافتی میدان میں شہزاد عثمانی کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ شہزاد عثمانی مرحوم بھی صحافتی خدمات سے متعلق ہر کام کو دل و جان سے انجام دیتے تھے، وہ شہر کے تنہا ایسے پریس فوٹو گرافر تھے جن سے ہر شخص پیار کرتا تھا، بلا تفریق ہر طبقہ میں ان کی الگ پہچان تھی، انھوں نے کم عمری میں اپنی محنت و لگن اور دیانت داری سے سماج میں الگ مقام اور شناخت قائم کی تھی، شہزاد عثمانی سماجی خدمات میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، ان کی خدمات کو یاد رکھنے کے لیے ممتاز احمد کو یوم صحافت کے موقعے پر 'شہزاد عثمانی' ایوارڈ سے سرفراز کر کے ممتاز احمد کی صحافتی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اس دوران ضرار بیگ، عارف انصاری، سمیر چودھری وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ممتاز احمد اور شہزاد عثمانی کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 4 جون 2024

انجم جمالی ایوارڈ

میرٹھ: ترقی پسند شاعر، ادیب اور صحافی ڈاکٹر انجم جمالی کی یاد میں ڈاکٹر انجم جمالی میموریل فاؤنڈیشن کی جانب سے چیمبر آف کامرس دہلی روڈ پر 15 ویں بار ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقعے پر ادبی اور صحافتی میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے والے ادیبوں اور صحافیوں کو ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ سے نوازا گیا جن میں شاعری کے لیے ڈاکٹر وسیم راشد اور ادبی خدمات کے لیے ڈاکٹر زبیر احمد، الیکٹرانک میڈیا کے شعبہ میں اداکار پنکج بیری اور پرنٹ میڈیا کے لیے روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر ایم ودود ساجد کو ممبر اسمبلی شاہد منظور اور سابق وزیر حکومت اترپردیش ڈاکٹر معراج الدین کو ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر معراج الدین احمد نے کہا کہ ڈاکٹر انجم جمالی نہ صرف ایک عظیم شاعر، کہانی کار اور صحافی تھے بلکہ وہ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ پروفیسر وائی وملا سابق وی سی چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی نے شمع روشن کر کے پروگرام کا آغاز کیا۔ اس کے بعد پروگرام کے کوآرڈینیٹر اور فاؤنڈیشن کے سکریٹری انجینئر رفعت جمالی نے اپنے والد کو خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ جو لوگ اپنی شاعری یا صحافت کے ذریعے معاشرے میں بیداری پیدا کرتے ہیں فاؤنڈیشن انھیں ڈاکٹر انجم جمالی ایوارڈ سے نوازتی ہے۔

ایم ودود ساجد نے اس موقعے پر کہا کہ والدین بڑی نعمت ہوتے ہیں ان کی زندگی میں ان کی قدر کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ والدین سے بچوں کی پہچان ہوتی ہے۔ اسی طرح بہت سے قابل قدر فرماں بردار بچے ایسے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے والدین کو خوشی حاصل ہوتی ہے اور اولاد کی جانب سے تعارف کرانے میں فخر محسوس ہوتا ہے اور نگہت نے ڈاکٹر انجم جمالی پر مضمون پڑھا۔ اس کے بعد شعرا نے کلام پیش کر کے ڈاکٹر انجم جمالی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ پروگرام کے چیئرمین ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ڈاکٹر انجم جمالی کا نام فلک پر تابندہ ستارے کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے گا۔ ان کی نمایاں خدمات رہی ہیں وہ ایک بڑے شاعر، قلمکار اور خدمت گزار تھے۔ اس کے بعد رجنی تنور نے ڈاکٹر انجم جمالی کی غزل 'کچھ دن زلفوں کے سائے میں گزارے ہیں، کیا زندگی کے مسائل اس کی وجہ سے محدود ہو گئے ہیں' پیش کر کے پروگرام کا اختتام کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 جون 2024

رسم اجرا

مقالاتِ سرسید کی تین جلدوں کا اجرا

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کی وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے اے ایم یو برادری بشمول موجودہ و سابق طلبا اور اساتذہ سے ادارے کے بانی اور انیسویں صدی کے عظیم مصلح سرسید احمد خاں کے مشن اور وژن کو آگے بڑھانے میں تعاون کرنے کی اپیل کی۔ سرسید اکیڈمی میں منعقدہ ایک تقریب میں ڈائرکٹر اکیڈمی پروفیسر شافع قدوائی اور دیگر معززین کے ہمراہ مقالات سرسید کی نویں، دسویں اور گیارہویں جلد کا اجرا کرتے ہوئے پروفیسر نعیمہ خاتون نے کہا کہ اگر ہم سب مل کر ایک ٹیم کے طور پر کام کریں گے تو یونیورسٹی یقینی طور پر ترقی کرے گی اور نئی بلندیوں تک پہنچے گی۔ قابل ذکر ہے کہ سرسید اکیڈمی نے مقالات سرسید کی 11 تصحیح شدہ جلدیں نئی ترتیب و تہذیب کے ساتھ شائع کی ہیں، جو اے ایم یو کے پبلی کیشن ڈویژن کے سیلز کاؤنٹرز اور آن لائن ایمزن ڈاٹ ان پر دستیاب ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی کی مرتب کردہ 16 جلدوں کو سرسید اکیڈمی نے 11 جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون نے کہا کہ دو صدیوں پر محیط برصغیر پاک و ہند کا کوئی بھی علمی، فکری، مذہبی، تاریخی، تعلیمی، سیاسی، سماجی اور صحافتی بیانیہ سرسید احمد خاں کی خدمات کا معروضی تجزیہ اور مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ سرسید کے مضامین اور تحریروں کی معروضی تفہیم کی راہ ہموار کرنے کا سب سے اہم قدم ان کی تحریروں پر تحقیق کرنا اور انھیں دیانت داری کے ساتھ شائع کرنا ہے۔ پروفیسر نعیمہ خاتون نے مزید کہا کہ سرسید نے مغربی جدیدیت سے ابھرنے والے نئے ثقافتی، علمی، ادبی اور فکری مباحث کے امتیازی عناصر پر بات کی، ان پر لکھا اور اس کی وضاحت کی کہ اس میں مسلمانوں

شاہد انور کے شعری مجموعہ 'کلام دیوان شاہد' کا اجرا

کی شرکت کی کیا حکمت عملی ہونی چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ 1866 سے 1898 تک 32 برسوں کے دوران سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے ذریعے ہندوستان کو درپیش مسائل، عالمی معاملات، بین المذاہب تعلقات اور مسلمانوں کے مخصوص مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار معقول اور غیر جذباتی انداز میں کیا۔ وائس چانسلر نے سرسید اکیڈمی کو سرسید کی مستند تحریریں شائع کرنے پر مبارکباد دی اور تحقیق و ترقی اور اشاعتوں سے متعلق تجاویز پر ہر ممکن مدد کا یقین دلایا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 مئی 2024

کلام دیوان شاہد

نئی دھلی: دبستانِ دہلی کے نمائندہ اور منفرد لب و لہجے کے شاعر شاہد انور کے تیسرے مجموعۂ کلام دیوانِ شاہد کی تقریب رونمائی تسمیہ آڈیٹوریم جامعہ نگر نئی دہلی میں منعقد کی گئی۔ اس تقریب کا اہتمام آل انڈیا ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی اور مشیر سخن کی جانب سے کیا گیا، جس کی صدارت تسمیہ ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سید فاروقی نے کی۔ نظامت معین شاداب نے کی۔ ڈاکٹر خالد مبشر، حقانی القاسمی، پروفیسر شہپر رسول اور پروفیسر اختر الواسع نے اظہار خیال کیا اور دیوان شاہد کی انفرادیت اور خصوصیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''شاہد انور کی شاعری ادب عالیہ کی پہچان ہے۔ وہ قاری کے اندر جینے کی خواہش پیدا کرنے کے ہر معیار پر پوری اترتی ہے۔ ان کی شاعری میں پاکیزگی ہے۔ پروفیسر شہپر رسول نے دیوانِ شاہد پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''شاہد انور کی شاعری غزل کی خصوصیات پر پوری اترتی ہے۔ وہ اشاروں میں اپنا پیغام بھرپور انداز میں قاری تک پہنچاتے ہیں۔'' پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ شاہد انور نے دیوان کے رواج کو عام کرنے کے لیے ایک راہ ہموار کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ نئے کہنے والے اس روایت کو اپنائیں گے اور دیوان مرتب کرنے کی طرف قدم اٹھائیں گے۔ ان کے علاوہ حقانی القاسمی، معین شاداب، سلیم شیرازی، صہیب فاروقی اور عمران اعظمی نے بھی اظہار خیال کیا۔ بعد ازیں محفل مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت سلیم شیرازی نے کی، جس میں شاہد انور کے اظہار تشکر کے علاوہ ان کی غزلیں سنی گئیں۔ ان کے علاوہ دیگر شعرائے کرام نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مئی 2024

اضطرابِ دل

نئی دھلی: ادبی و ثقافتی تنظیم بارگاہ سخن کی جانب سے مشہور شاعر مختار تلہری کا تازہ شعری مجموعہ 'اضطرابِ دل' کی تقریب رونمائی تسمیہ آڈیٹوریم بٹلہ ہاؤس جامعہ نگر اوکھلا نئی دہلی میں ہوئی۔ مقررین نے مختار تلہری کو ان کی بہترین شاعری کے لیے مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد بھی کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر سید فاروق اور نظامت درد دہلوی نے کی۔ درد دہلوی نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ محترم مختار تلہری کی شاعری جس طرح سے داد دینے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی طرح سے ان کی شخصیت لوگوں کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 مئی 2024

زندگی اے زندگی اور انتظار بہار

بھوپال: آج کا اردو فکشن ہمارے عہد کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی صورت حال کی عکاسی بھرپور انداز میں کر رہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر فاروق بخشی معروف افسانہ نگار ڈاکٹر رضیہ حامد کے دو افسانوی مجموعوں 'زندگی اے زندگی' اور 'انتظار بہار' کی رسم اجرا کی تقریب کے دوران کر رہے تھے۔ پروفیسر موصوف نے مزید کہا کہ منشی پریم چند جیسے عظیم المرتبت افسانہ نگار کے افسانوں سے اردو افسانے کا آغاز ہوا۔ اب اردو افسانے کی عمر تقریباً ڈیڑھ صدی پر محیط ہے۔ آج کا عہد پریم چند کے عہد سے قدرے مختلف ہے، مسائل کی نوعیت بھی الگ ہے مگر پریم چند نے اردو افسانے کو جو بنیاد فراہم کی تھی اس پر اردو افسانے کی ایک شاندار عمارت تعمیر ہو چکی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ڈاکٹر رضیہ حامد کے افسانے موضوعاتی اعتبار سے بھی اور افسانے کی فنی کسوٹی پر بھی کھرے اترتے ہیں۔ کوئی چالیس برس قبل دہلی میں انجمن ترقی اردو ہند کے ہال میں ڈاکٹر خلیق انجم کی نگرانی میں ڈاکٹر رضیہ حامد کے پہلے افسانوی مجموعے کی رونمائی ہوئی اور تقریب کا کنوینر میں تھا۔ آج ان دونوں مجموعوں کی رونمائی بھی انجمن کی بھوپال شاخ اور اقبال لائبریری کے زیر اہتمام ہو رہی ہے۔ اس موقعے پر شاعر شمس تبریزی نے ڈاکٹر رضیہ حامد کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہندوستان کی واحد خاتون ادیبہ ہیں، جن کی تصانیف کی تعداد دو درجن سے زائد ہے۔ اپنے صدارتی کلمات میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی ڈائریکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی نے ڈاکٹر رضیہ حامد کے خاندانی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادب کا ذوق انھیں وراثت میں ملا ہے۔ ان کے خانوادے میں تقریباً سارے افراد کئی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تقریب کے کنوینر کلیم اختر نے انجمن ترقی اردو ہند شاخ بھوپال کی طرف سے تمام مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقعے پر انجمن ترقی اردو ہند شاخ بھوپال کی جانب سے اقبال لائبریری، بھوپال میں ایک خطاطی مقابلے کا انعقاد بھی عمل میں آیا جس میں سو سے زائد طلبا و طالبات نے شرکت کی، جنھیں انعامات سے نوازا گیا۔ اقبال لائبریری کے صدر جناب سید منور علی نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس یادگار تقریب کی نظامت انیس انصاری نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 مئی 2024

کے ایل جوہر کی کتابوں کا اجرا

نئی دھلی: ہندوستان پہلے غلام ہندوستان تھا، پھر آزاد ہندوستان بن گیا اور اب نیا ہندوستان ہے۔ تینوں کو اپنے اپنے دور میں سماجی اصلاح کرنے والوں کی ضرورت تھی۔ اگر ہم ان سماجی مصلحین سے سبق سیکھ کر اپنے ذہنوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا نہیں کر پاتے تو یہ سب سے بڑی کوتاہی ہے۔ یہ باتیں دہلی یونیورسٹی (ڈی یو) کے وائس چانسلر پروفیسر یوگیش سنگھ نے گرو جمبھیشور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر کے ایل جوہر کی دو کتابوں کی رسم اجرا کی تقریب میں بطور مہمان خصوصی کہیں۔ پروفیسر یوگیش سنگھ نے مزید کہا کہ حروف کبھی ختم نہیں ہوتے، جو کتابیں لکھی جاتی ہیں وہ امر ہوتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتابیں ہی ہمارے لیے مشعل راہ بنیں گی۔ ڈاکٹر جوہر

کی کتاب 'انڈیاز گریٹسٹ ریفارمرز 51 غیر معمولی کہانیاں' پر گفتگو کرتے ہوئے وائس چانسلر نے کہا کہ اس کتاب میں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر سے ونوبا بھاوے جیسی 51 عظیم ہستیوں کی کہانیاں مرتب کی گئی ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان عظیم ہستیوں کے بارے میں بھی نہیں جانتے۔ اس لیے ایسی کہانیوں کا سامنے آنا ضروری ہے۔ جب آپ ان لوگوں کو بار بار پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کتاب کی ضرورت کیوں ہے۔ ونوبا بھاوے نے ملک میں 48 ہزار کلو میٹر پیدل سفر کیا اور لوگوں نے ان کی درخواست پر 45 لاکھ ایکڑ زمین عطیہ کی۔ اگر ہم انھیں پڑھیں گے تو ایسے کردار ہم پر اثر انداز ہوں گے۔ ڈاکٹر جوہر کی دوسری کتاب 'تھری اسٹیلر ریوولیوشنریز ہورٹلڈ برٹش انڈیا' کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے وائس چانسلر نے کہا کہ اس کتاب میں انھوں نے بگا جتن، رام پرساد بسمل اور شہید بھگت سنگھ پر لکھا ہے۔ کتاب میں ان انقلابیوں سے متعلق بہت سے حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ پروفیسر یوگیش سنگھ نے ڈاکٹر کے ایل جوہر کے جذبے کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ تقریباً 11 ماہ قبل دہلی یونیورسٹی میں ان کی ایک کتاب 'فریڈم فائٹرز آف اتر پردیش' بھی ریلیز ہوئی تھی۔ 88 سال کی عمر میں بھی صرف 8 ماہ میں دو کتابیں لکھنا ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر جوہر کے رکشہ والے سے وائس چانسلر تک کے سفر کو بہت متاثر کن قرار دیا۔ دونوں کتابوں کے مصنف ڈاکٹر کے ایل جوہر نے اپنی کتابوں کے بارے میں تفصیلی معلومات دیتے ہوئے کہا کہ یہ ان کی بالترتیب 26 ویں اور 27 ویں کتابیں ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی پہلی کتاب ڈاکٹر بی آر امبیڈکر سے لے کر راجہ رام موہن رائے، ایشور چندر ودیا ساگر، کیلاش ستیارتھی، پدم شری اومانولی، بندیشور پاٹھک، مہاتما گاندھی، سبھاش چندر بوس، سندر لال بہوگنا تک 51 شخصیات کی زندگیوں پر مبنی ہے۔ پروگرام کے آغاز میں کے ایل جوہر کے بیٹے وکرم جوہر نے مہمانوں کا استقبال کیا اور آخر میں ان کے دوسرے بیٹے وویک جوہر نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کئی ماہرین تعلیم کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ کتاب کے اجرا کی تقریب میں ہریانہ سینٹرل یونیورسٹی مہندر گڑھ کے وائس چانسلر پروفیسر ٹنکیشور کمار اور آئی پی یونیورسٹی دہلی کے وائس چانسلر پروفیسر مہیش ورما اور شہید بھگت سنگھ کے بھتیجے کرن جیت سنگھ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 مئی 2024

'خاموش لب' اور 'سیپیاں ٹوٹی ہوئی'

بجنور: گورکھپور اور دہلی سے آئے مہمانانِ خصوصی اور ضلع کے اردو ادیبوں و نامور شخصیات کے ذریعے ایم اے کنول جعفری کی کتاب 'خاموش لب' (افسانوی مجموعہ) اور 'سیپیاں ٹوٹی ہوئی' (شعری مجموعہ) کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبیداللہ چودھری نے کنول جعفری کے افسانوں کو گاؤں، دیہات اور شہری ماحول کی ترجمانی کرنے والا ایک ایسا افسانہ نگار بتایا، جس نے اپنے آس پاس سے صداقت پر مبنی مواد جمع کرا سے کہانیوں، مضامین اور اشعار میں ڈھالنے کا کام کیا۔ کنول جعفری دیندار ہونے کے ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں۔ ڈاکٹر محمد مستمر نے کہا کہ کنول جعفری کے مضامین، غزلیں اور کہانیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ میں نے ان کی کتاب خاموش لب پر مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ ان کے افسانے ہمارے معاشرے کا آئینہ ہیں۔ تقریب کی صدارت کر رہے ڈاکٹر شیخ نگینوی نے کنول جعفری اور ان کی کتابوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کہانیاں وقت گزاری کا سامان نہیں بلکہ انسانیت کو بچانے کے لیے ایک کوشش ہے۔ ان کی کہانیاں اصلاح معاشرہ، ٹوٹتی قدروں، ناانصافی، مساوات، فرقہ پرستی وغیرہ اہم موضوع پر مبنی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 مئی 2024

اردو اور ہندوستانی زبانیں: لسانی و ادبی ارتباط

حیدر آباد: جب محمود غزنوی کی فوج ناکارہ ہو کر اپنی جنگی صلاحیتوں کو کھو چکی تھی تو فردوسی کے شاہنامہ کے رجز

کے اشعار نے اس مردہ فوج میں جان ڈالی۔ اردو زبان نے کسی کو بھی شکوہ کا موقع نہیں دیا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن، وائس چانسلر نے ڈاکٹر محمد نہال افروز کی کتاب کی رسم اجرا کے بعد خطاب کرتے ہوئے کیا۔ ڈاکٹر نہال افروز کی مرتبہ کتاب 'اردو اور ہندوستانی زبانیں: لسانی و ادبی ارتباط' کا رسم اجرا سید حامد لائبریری آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ اس پر خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر نے اردو زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے مختلف زبانوں میں تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات کی بنیاد پر ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا۔ زبان کی طاقت کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو نے ہر زبان کے الفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ اس نے فارسی سے الفاظ مستعار لیے، تو عربی زبان سے موسیقیت کو لے کر شاعری میں ایسی جان ڈالی کہ آج فلمی دنیا کا کوئی نغمہ اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ غالب اور دیگر شعرا کے اشعار کی مثال دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو کی سرشت میں بدگمانیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اردو کے لیے بہتر ہے کہ شاخوں پر رہے اور دلوں پر حکمرانی کرے۔ پروفیسر محمد رضاء اللہ خان، ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم نے کتاب کے حوالے سے این ای پی 2020 میں مختلف ہندوستانی بولیوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر نکہت جہاں نے کتاب کے مصنف ڈاکٹر نہال افروز کا تعارف پیش کیا۔ پروفیسر نسیم الدین فریس نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر محمود کاظمی اور ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر بدیع الدین نے کتاب پر تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر محمد نہال افروز نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 9 مئی 2024

مجموعۂ رہبری (میرے آئینۂ گفتار میں)

امراؤتی: معاون معلمہ ناظمہ بی (رہبری) بنت شبیر بیگ کی شائع کتاب مجموعۂ رہبری (میرے آئینۂ گفتار میں) 7 مئی 2024 کو امراؤ بلدیاتی عظمیٰ کے محکمہ تعلیمی افسر محترم ڈاکٹر پرکاش میشرام کے دست مبارک رسم اجرا ادا کی گئی۔ معاون معلم و صدر اموس تنظیم اظہر خان نے کتاب پر تبصرہ پڑھ کر تقریب کی ابتدا کی۔ اس موقعے پر بلدیاتی عظمیٰ امراؤتی کے مدارس نگراں کار محترم وحید خان، قاضی نظام الدین، جاوید صاحب اور دیگر معلمین نے اپنے خیالات پیش کیے۔ سابق صدر، معلمین و معلمات نے اپنی موجودگی سے تقریب کو زینت بخشی۔ محترم مقصود نے اردو کی خدمات کے تئیں اپنے جذبات و احساسات بیان کر کے آبدیدہ کر دیا۔ پروفیسر ڈاکٹر ذاکر نے اردو کی بقا کے لیے مفید مشوروں سے نوازا۔ نظامت کی ذمے داری معاون معلم انصاری نے ادا کی۔ تقریب کی دیگر ذمے داریاں جناب ناصر شعیب اور معاونین معلم ارشاد و سمیع الرحمٰن نے نبھائی۔ صدر معلم عقیل صاحب نے تقریب کو کامیاب بنانے میں خصوصی ذمے داریاں ادا کیں۔ معلم محسن نے رسم شکریہ ادا کی۔ صدر رازق حسن نے کتاب خرید کر پڑھنے پر زور دیا۔ مطالعے کی اہمیت اور طلبا کو کتب خانوں سے دلچسپی پیدا کرنے پر اظہار خیال کیا۔ اس کتاب میں موجود شامل نظمیں، کہانیاں اور ڈراموں و

مشاعروں سے اساتذہ اور طلبا ضرور مستفید ہوں گے۔ بشرطیکہ کتاب پڑھی جائے۔ کتاب کی پذیرائی سے متاثر ہوکر ڈاکٹر میشرام نے ضلعی سطح پر تقریب کرنے کا اعلان کیا اور اس کتاب کا ہندی ایڈیشن شائع کرنے کے لیے رضامندی کا اظہار کیا۔ ان کے اعلان سے تقریب رسم اجرا اختتام کو پہنچی۔

پریس ریلیز: سید مقصود علی، 11 مئی 2024

دبستان سہارنپور

سہارنپور: پرچم تنظیم کے زیر اہتمام 2 جون کو ڈاکٹر قدسیہ انجم علیگ کی کتاب دبستان سہارنپور کا اجرا راج محل ہوٹل میں کیا گیا جس کی صدارت ایم پی حاجی فضل الرحمٰن نے کی اور نظامت کے فرائض جاوید خان سروہا نے انجام دیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر قدسیہ انجم علیگ کی کتاب دبستان سہارنپور کا اجرا مہمانوں کے ہاتھوں کیا گیا، افتتاحی خطبہ جلال عمر سابق پرنسپل اسلامیہ کالج نے پیش کیا اور کتاب کے حوالے سے یہ کہا کہ دبستانِ سہارنپور ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ شعروسخن، ادب، تنقید، صحافت، آرٹ اور کلچر کی دنیا میں سہارنپور کی ممتاز شخصیتوں نے جو قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں ان کو ڈاکٹر قدسیہ انجم نے اس کتاب میں بڑے سلیقے کے ساتھ یکجا کردیا ہے۔ ڈاکٹر قدسیہ انجم نے کہا کہ کتاب کو لکھنے کا مقصد سہارنپور کے ادبا شعرا صحافیوں اور فنکاروں قلمکاروں کو ملک اور بیرون ممالک میں متعارف کرانا ہے کتاب کو لکھنے میں بہت سی دشواریاں آئیں لیکن اس دشوار گزار کام کو مکمل کرنے میں بہت سے قلمکاروں نے تعاون کیا جن کی میں مشکور ہوں۔

ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی ٹیچر جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول اور قلمکار نے کہا کہ عصرِ حاضر میں دبستانِ سہارنپور کتاب کی اہمیت ان معنوں میں ہے کہ اب ادبی شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کو قلم بند کرنے کا کسی کے پاس وقت نہیں ہے اس دور نفسا نفسی میں ڈاکٹر قدسیہ انجم نے سہارنپور کے ادبی افق پر چمکتے ستاروں کی کہکشاں کو اپنی کتاب میں جمع کرلیا ہے اس طرح سے ایک دستاویز کی شکل میں آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرے گا۔ ڈاکٹر شمع افروز زیدی مدیرہ بیسویں صدی نئی دلی نے کہا کہ ڈاکٹر قدسیہ انجم نے دبستان سہارنپور میں سہارنپور شہر کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے ضلع سہارنپور کا تاریخی پس منظر اجاگر کرتے ہوئے یہاں کی علمی و ادبی اور معروف و غیر معروف گمنام شخصیتوں صحافیوں ادیبوں شاعروں نیز نسائی ادب کو اس خوبصورتی سے کتاب میں یکجا کیا ہے جس سے کتاب کی معنویت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے۔ جناب حقانی القاسمی مدیر انداز بیان نئی دلی نے کہا کہ ہر شہر کی اپنی ایک سائیکی اور ثقافت ہوتی ہے جس کا اثر وہاں کے تخلیقی اذہان پر بھی ہوتا ہے شہر کی سائیکی ہی تخلیقی شخصیت کی تشکیل وتعمیر کرتی ہیں۔ سہارنپور سے ڈاکٹر قدسیہ انجم کا صرف مادی اور معاشی تعلق نہیں ہے بلکہ مابعد الطبیعاتی رشتہ ہے اس لیے دبستان سہارنپور کو انھوں نے اپنی تحقیق وتنقید کا مرکز ومحور بنایا۔ یہ کتاب سہارنپور کی ادبی وثقافتی سوانح اور علمی دستاویز ہے سہارن پور کی علمی ادبی شخصیات کے آثار وکوائف کے تعلق سے ایک اہم عصری حوالہ جاتی کتاب ہے۔ ڈاکٹر عبدالباری اسسٹنٹ ایڈیٹر اردو دنیا بچوں کی دنیا فکر وتحقیق نے کہا کہ سہارن پور روحانی علمی اور ادبی اعتبار سے پوری دنیا میں منفرد شناخت رکھتا ہے یقیناً سہارنپور اس لائق ہے کہ اسے ادبی دبستان قرار دیا جائے اردو کے جتنے اسالیب یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں کسی اور علاقے میں نہیں ملتے یہاں کی مٹی میں تنوع تخلیقیت، رنگارنگی اور روحانیت ہے۔ راشٹریہ سہارا اردو کے سابق ایڈیٹر ڈاکٹر اسد رضا نے کہا کہ سہارنپور کی نامور شخصیات پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اس میں نامور علمی ادبی صحافتی سماجی اور فنی شخصیات کا ذکر ہے شعرو سخن تنقید صحافت آرٹ اور کلچر کی دنیا میں سہارنپور کی ممتاز شخصیتوں نے جو قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں ان کو ڈاکٹر قدسیہ انجم نے اس کتاب میں بڑے سلیقے کے ساتھ یکجا کردیا ہے، علمی وراثت کی حفاظت انسان کی اخلاقی ذمے داری ہے اور اس کام کو ڈاکٹر قدسیہ انجم نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ صدارت کرتے ہوئے ایم پی سہارنپور جناب فضل الرحمٰن نے کہا کہ دبستانِ سہارنپور ڈاکٹر قدسیہ انجم کی یہ ایک ایسی علمی کاوش ہے جسے کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچانا آسان نہ تھا انھوں نے یہ وقت طلب کام کا بیڑا اٹھا کر اس کو پائے تکمیل تک پہنچایا ہم ان کے اس تاریخی کارنامے پر ان کو مبارکباد پیش کرتے ہیں نظامت کرتے ہوئے جاوید خان سروہا نے کہا کہ سہارنپور شہر علم و ادب کا گہوارہ ہے دبستانِ سہارنپور میں ان ادبی شخصیات کے تخلیقی کمالات سے قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر ایوب نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

قندیل آن لائن ڈاٹ کام، 4 جون 2024

گونجتی تنہائیاں

نئی دہلی: محترمہ شگفتہ رحمٰن سونا کی کتاب 'گونجتی تنہائیاں' کی رسم اجرا سولیٹر ٹریچر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ادا کی گئی۔ اس تقریب کی صدارت عرفان اعظمی اور نظامت فرید احمد فریدنے کی۔ سہیل آزاد (استاذ شاعر اور تنقید نگار)، سینئر شاعر منیر ہمدم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ڈاکٹر رحمٰن مصور، ریحو حسن مہمانان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ اس موقعے پر سہیل آزاد نے شاعری کے مختلف ادوار اور ان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ تنظیم کی بانی شغف پروین نے صاحب کتاب کو مبارکباد پیش کی اور تمام مہمانان کرام کا شکریہ ادا کیا۔ بعدازیں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مئی 2024

شعاع شمس

لکھنؤ: 'بزم شبلی، سرودے نگر، لکھنؤ' کے زیر اہتمام ڈاکٹر شمس الحسن شمس سندیلوی کے تیسرے مجموعۂ کلام 'شعاع شمس' کا اجرا یوپی پریس کلب میں مہمانان ذی وقار کے دست ہائے مبارک سے ہوا۔ تقریب کی صدارت، صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی پروفیسر عباس رضا نیر نے کی جب کہ پروگرام کی سرپرستی ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے فرمائی۔ نظامت کا فریضہ خوش فکر شاعر شکیل گیاوی نے انجام دیا۔ مہمانوں کا استقبال پروگرام کے کنوینر عقیل غازی پوری نے کیا اور اظہار تشکر بزم شبلی کے صدر محمد خالد صدیقی صبرحدی نے کیا۔ اس موقعے پر کتاب اور صاحب کتاب سے متعلق شعری کلام سنانے والوں میں اشعر علیگ، ہارون بارہ بنکوی، عاصم ملیح آبادی

اور محسن قدوائی تھے۔ صدر تقریب نے اجرا شدہ کتاب 'شعاعِ شمس' پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ شمس سندیلوی کی شاعری میں لفظی رعایت کے ساتھ معنوی رمزیت کا بہترین التزام ملتا ہے۔ میں انھیں ان کے تیسرے مجموعہ کلام پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے شاعری اور اس کے لوازمات کے تعلق سے سیر حاصل گفتگو کی۔ انھوں نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے بے جا جدت طرازیوں پر بھرپور احتجاج کا اظہار کیا۔ شعر کہنے کی منزل سے جو شاعر سرسری گزر جاتے ہیں ان کا کلام گرد کارواں ہوجاتا ہے۔ سندیلہ بڑے نامور حضرات کا مسکن رہا ہے۔ شمس سندیلوی بھی اس سرزمین کے ایک اچھے شاعر ہیں۔ مولانا خالد ندوی نے کہا کہ شمس الحسن شمس سندیلوی اپنی ادبی کاوشوں، شعور و ادراک اور شعری طبیعت کی بنیاد پر ایک اچھے شاعر کہے جانے کے مستحق ہیں اس لیے انھیں کیوں نہ شمس کہا جائے۔ واصف فاروقی نے کہا کہ شعاعِ شمس کا اصل احساس اسی جون کے مہینے میں ہوسکتا تھا اور اس کے اجرا کا یہ بہترین مہینہ ہے۔ شمس صاحب میرے ہم ضلع ہیں لیکن سندیلہ کا ایک اہم وقار ہے۔ اس کی زبان پر لکھنوی زبان کے اثرات مرتب ہیں اور یہ اثر شمس صاحب کی شاعری میں بھی ہے۔ زود گوئی ان کو ان کے استاد بیدل مرادآبادی سے ورثہ میں ملی ہے۔ پروفیسر احسن رضوی نے کہا کہ شمس صاحب سے میں عرصہ دراز سے واقف ہوں۔ وہ ایک کہنہ مشق اور زود گو شاعر ہیں۔ ان کے اچھے اشعار کا ایک انتخاب ہونا چاہیے تا کہ قاری پوری طرح مستفید ہوسکیں۔ تقریب میں عمائدین شہر کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 3 جون 2024

دیوان عاصم

گورکھپور: ساجد علی میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام معروف شاعر و صحافی عاصم گونڈوی کی تازہ ترین تصنیف 'دیوان عاصم' کی رسم اجرا حامد علی ہال، گھاسی کٹرہ، گورکھپور میں نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہوئی جس کی صدارت معروف ادب نواز الحاج محمد افراہیم صاحب نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر بال گنگا دھر باغی اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، سدھارتھ یونیورسٹی، کپل وستو اور محمد علی نسیم سابق ایڈیشنل جوڈیشیل مجسٹریٹ شریک محفل ہوئے۔ نظامت کا فریضہ حافظ ناصرالدین نے انجام دیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی ڈاکٹر بال گنگا دھر باغی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ شعری مجموعہ تو شائع کرانا آسان ہے مگر کسی دیوان کی اشاعت ایک مشکل امر ہے۔ کیونکہ دیوان کا لکھنا ہر ایک شاعر کے بس کی بات نہیں ہے اس کام کو وہی انسان کرسکتا ہے جو بالغ نظر اور زمانہ شناس ہونے کے ساتھ ساتھ قادر الکلام بھی ہو۔ عاصم گونڈوی کی شاعری میں ان کی مثبت فکر اور دور اندیشی کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ محمد علی نسیم نے دیوان عاصم کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ موصوف کی قلم پر گرفت بہت مضبوط ہے۔ انھیں نظم اور نثر پر یکساں عبور حاصل ہے۔ ان کے کلام سادگی اور پرکاری کا حسین امتزاج ہیں۔ سینئر صحافی و دانشور قاضی عبدالرحمٰن نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ عاصم گونڈوی نے اردو زبان و ادب کے لیے اپنی زندگی وقف کردی۔ عاصم صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں، آپ حافظ قرآن کے ساتھ ساتھ شاعر و صحافی بھی ہیں۔ آپ نے ہفت روزہ تاج ور کی چار دہائیوں تک مسلسل ادارت کی۔ دیوان عاصم کی اشاعت سے قبل آپ کے پندرہ شعری و نثری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کی دیوان عاصم ایوانِ اردو ادب کا ایک اہم ستون ثابت ہوگا۔

پروگرام کے ناظم حافظ ناصرالدین نے تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عاصم گونڈوی اردو ادب کا ایک ایسا ستارہ ہیں جس کی چمک روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ آپ کی ذات گرامی، فکر و نظر اور حسن عمل کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ آپ کے قلم سے جتنی بھی کتابیں معرض وجود میں آئیں وہ اردو ادب کا سرمایہ ہیں جس سے اہل اردو ہمیشہ فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

عاصم گونڈوی نے اپنی کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں کہا کہ میں عزیزم فیضان سرور کو دعائیں دیتا ہوں جنھوں نے بڑی کاوش اور خلوص کے ساتھ دیوان عاصم کو ترتیب دے کر مجھے اپنی زندگی میں دیکھنے کا موقع فراہم کیا، ساتھ ہی حاضرین مجلس اور دانشوران گورکھپور کا صمیم قلب سے شکر گزار ہوں جن کی کرم فرمائی، حوصلہ افزائی اور مخلصانہ پذیرائی نے مجھے ایک معلم، ایک شاعر، ایک ادیب، ایک صحافی اور اردو زبان کا خادم اور محافظ بنا دیا۔ گورکھپور میرا وطنِ ثانی نہیں بلکہ اصل وطن کے مساوی ہے۔ یہاں کے عوام و خواص کی قبولیت، اپنائیت اور پیار کا فیضان میرے لیے جاری ہے اور یقین ہے کہ میں مرتے دم تک اس سے بھرپور استفادہ کرتا رہوں گا۔

تقریب رسم اجرا کے بعد مختصر شعری نشست ہوئی جس میں ڈاکٹر عرشی بستوی، دیدار بستوی، سلام فیضی اور صاحب کتاب عاصم گونڈوی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

پریس ریلیز: مشارب عثمان، 1 جون 2024

ڈاکٹر رونق جمال کی پانچ کتابوں کا اجرا

چھتیس گڑھ: درگ چھتیس گڑھ کے معروف ادیب ڈاکٹر رونق جمال کی 70 ویں سالگرہ کے موقعے پر آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی دہلی کے عہدیداران جنرل سکریٹری محمد سراج عظیم اور خزانچی جناب عبدالمنان صاحب نے درگ پہنچ کر صنعت کار کملا موٹرس گروپ کے چیئرمین عالی جناب کملیش بریچا صاحب کے تعاون سے عالیشان جلسے کا انعقاد کیا۔ ڈاکٹر رونق جمال صاحب کا یوم پیدائش بھی ہے اس لیے پانچ کتابوں کے اجرا کے لیے اسی تاریخ کا انتخاب کیا گیا۔ جلسے کی صدارت چھتیس گڑھ اردو اکادمی کے چیئرمین عالی جناب ادریس گاندھی نے فرمائی۔ جلسے کی نظامت معروف شاعر جناب مشتاق احسن بیباک (ناگپور) نے نبھائی۔ ایک سو ایک افسانچوں کے مجموعے 'چالیس آدمی' کا اجرا افسانہ نما کے مدیر جناب محمود شاہد (حیدرآباد) کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی دہلی کے جنرل سکریٹری جناب سراج عظیم نے عید سے متعلق پینتیس کہانیوں کے مجموعے 'عید کے دن کے بادشاہ' کا اجرا کرنے کے بعد کہا کہ عید کے دن کے بادشاہ کا مطالعہ کرنے کے بعد میں حیران رہ

گیا کہ کوئی قلمکار عید پر اتنی ساری دلچسپ سبق آموز اور سماج کی اصلاح کے لیے عید جیسے موضوع پر اتنی کہانیاں کیسے لکھ سکتا ہے۔ یہ کمال رونق جمال ہی کر سکتے ہیں۔ ادب اطفال پر دس طویل کہانیوں پر مشتمل کتاب 'لال کتاب' کا اجرا خواجہ غلام السیدین ربانی (ناگپور) سابق ڈائرکٹر آثار قدیمہ نے کیا۔ لال کتاب کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ربانی صاحب نے کہا کہ لال کتاب کی تمام کہانیاں دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ 'مینڈک کی وفاداری' کا اجرا افسانہ نما کے مدیر اعلیٰ جناب ڈاکٹر شہاب افسر (اورنگ آباد) کے دست مبارک سے کروایا گیا۔ مینڈک کی وفاداری کی کہانیوں کے سلسلے میں ڈاکٹر شہاب نے کہا کہ کتاب کی تمام کہانیاں دلچسپ اور قابل تعریف ہیں۔

سہ ماہی اسباق کے مبسوط گوشے کا اجرا چھتیس گڑھ اردو اکادمی کے چیئرمین جناب ادریس گاندھی نے کیا۔ سب سے پہلے ادریس گاندھی نے مدیر نذیر فتح پوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے چھتیس گڑھ کے مایۂ ناز قلمکار کا گوشہ شائع کرکے نذیر صاحب نے ڈاکٹر رونق جمال کا حق ادا کر دیا ہے۔ آخر میں پروگرام کے مطابق افسانہ نما کے چوتھے شمارے کا اجرا صاحب جلسہ ڈاکٹر رونق جمال کے دست مبارک سے ہوا۔ رونق جمال افسانہ نما کے اعزازی مدیر بھی ہیں۔ اجرا کے بعد رونق نے کہا کہ افسانہ نما افسانچہ نگاروں کی اہم ضرورت کو پوری کر رہا ہے۔ افسانہ نما افسانچے کا برصغیر کا واحد رسالہ ہے جو پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

پریس ریلیز: رونق جمال، چھتیس گڑھ

وفیات

شاداب ذکی

بدایوں: سرزمین بدایوں کے معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر شاداب ذکی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ انھوں نے تقریباً 60 برس کی عمر میں آخری سانس لی۔ شاداب ذکی کافی عرصے سے صاحب فراش تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنی علمی و تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ وہ کئی برسوں سے چلنے پھرنے سے معذور تھے۔ گزشتہ دنوں طبیعت ناساز ہونے کے بعد علی گڑھ میں زیر علاج رہے۔ اتوار کی صبح فجر کے وقت انھوں نے اس دارفانی کو الوداع کہہ دیا۔ شاداب ذکی کے انتقال سے بدایوں کے ادبی و علمی حلقوں میں رنج و غم کا ماحول ہے۔ دور حاضر کے نعت گو شعرا میں ڈاکٹر شاداب ذکی کا ایک اہم مقام تھا۔ انھوں نے اپنے والد اور مشہور شاعر دِکی تالگانوی کے علمی ورثے کو بخوبی سنبھالا اور آگے بڑھایا۔ ان کی ادارت میں سہ ماہی 'ابر' بھی شائع ہوتا رہا۔ انھوں نے جس کثرت سے حمدیں اور مناجاتیں کہیں اور جس طرح عشق نبی میں ڈوب کر نعتیں لکھیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلب و نظر کو ایمان و عقیدے کی پختگی اور عشق الٰہی و عشق رسول کی آتش سیال نے منزہ و مجلا کر دیا تھا۔

حال ہی میں ان کا نعتیہ دیوان 'سرکار کی باتیں' شائع ہوا۔ اس میں 40 حروف کو ردیف بنا کر کہی گئی نعتیں شامل ہیں۔ اس سے قبل 2012 میں شائع حمدیہ دیوان 'رب کے حضور' میں 36 حروف کو ردیف بنا کر حمدیں کہی تھیں۔ 2006 میں شائع حمدیہ مجموعہ 'للہ الحمد' قبول عام حاصل کر چکا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 مئی 2024

رادھے شیام اگروال

رانچی: جھارکھنڈ کے جمشید پور میں ہندی صحافت کے بانی رادھے شیام اگروال اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئے اور اپنی نڈر، صاف اور غیر جانب دارانہ صحافت کی چار دہائیوں سے زائد کی شاندار میراث اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ شہر میں ہندی صحافت کا بیج بونے والے اور ہندی روزنامہ 'ادت وانی' کی اشاعت شروع کرکے اسے ایک بڑے برگد کی شکل دینے والے بانی ایڈیٹر رادھے شیام اگروال کا ہفتہ کی صبح انتقال ہوگیا۔

83 سالہ رادھے شیام اگروال نے 12 سال تک خدمات انجام دینے کے بعد 1980 میں مدھیہ پردیش میں سیلز ٹیکس ڈپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور جمشید پور آگئے اور 22 اگست 1980 کو جمشید پور کا پہلا ہندی روزنامہ ادت وانی شروع کیا جس کا اجرا بہار کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر جگن ناتھ مشرا نے کیا تھا۔ اس سے قبل مسٹر اگروال نے رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اقتصادیات میں پروفیسر کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ مسٹر اگروال 2005 میں جھارکھنڈ کی شیبو سورین حکومت میں پریس سکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے دو بیٹے اور ایک بیٹی چھوڑی ہے۔ بڑا بیٹا ادت اگروال ادت وانی کی اشاعت سے وابستہ ہے اور ینگ انڈینز نامی تنظیم کے ذریعے معاشرے کے محروم لوگوں کی زندگیوں کو بہتر بنانے کی مہم سے منسلک ہے۔ چھوٹا بیٹا ہمانشو اگروال امریکہ میں رہتا ہے، جب کہ ان کی بیٹی، این ڈی ٹی وی نیوز کے سابق صحافی منگل جین کے ساتھ دبئی میں رہتی ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 جون 2024

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: شمیم حنفی

دوسری اشاعت: 2024

صفحات: 336

قیمت: 195 روپے

جراحیات عمومی

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 322

قیمت: 180 روپے

عریش

مصنفہ: قمر جمالی

پہلی اشاعت: 2024

صفحات: 121

قیمت: 40 روپے

جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین
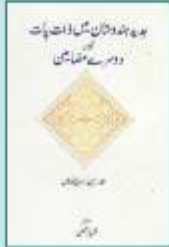
مصنف: ایم این سری نواس

مترجم: شہباز حسین

دوسری اشاعت: 2023

صفحات: 180، قیمت: 125 روپے

قدیم لکھنؤ کی آخری بہار

مصنف: مرزا جعفر حسین

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 671

قیمت: 355 روپے

حالی کا سیاسی شعور

مصنف: معین احسن جذبی

مرتب: سہیل احسن جذبی

دوسری طباعت: 2023

صفحات: 164، قیمت: 215 روپے

حالی کی غزلیں اور قطعات

مرتب: سید تقی عابدی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 66+185

قیمت: 150 روپے

نوم چامسکی

مصنف: علی رفاد فتیحی

پہلی اشاعت: 2023

صفحات: 54

قیمت: 70 روپے